زن، زر اور زمین کے تنازعوں میں جنم لینے والے مقدمات
سفید خون
مرزا امجد بیگ
(ایڈووکیٹ)

قانونی پیچیدگیاں، عدالتی کارروائی کے اہم رموز و نکات
زن، زر اور زمین کے تنازعوں میں جنم لینے والے مقدمات

راوی : مرزا امجد بیگ (ایڈووکیٹ)

تحریر : حسام بٹ

اسٹاکسٹ :-
مکتبہ القریش ◎ سرکلر روڈ
اردو بازار، لاہور۲۔ فون : ۷۶۶۸۹۵۸

فہرست

حدِ فاصل

نورانی چہرے والی وہ خاتون جب میرے چیمبر میں داخل ہوئی تو مجھے ایک کیف آور روحانی مسرت کا احساس ہوا۔ حالانکہ اس وقت میری طبیعت مکدر اور موڈ خاصا برہم تھا۔ اس تکدر اور برہمی کا سبب تھوڑی دیر پیشتر ناخوشگواریت پیدا کرنے والے تین واقعات کا پے درپے رونما ہونا تھا۔ ایک کٹ حجت مؤکل سے قانون اور انصاف کے موضوع پر اچھی خاصی ترش کلامی ہوگئی تھی، ایک عمر رسیدہ و کمر خمیدہ بڑے میاں فیس کی زیادتی کا شکوہ کرتے ہوئے مجھے خوب کھری کھری سنا گئے تھے اور ایک زیر سماعت کیس میں مخالف پارٹی کے پشت پناہ نے مجھے بھاری رشوت کے عوض کیس خراب کرنے کی پیشکش کی تھی۔ میں نے اس کے سامنے جب ''راشی/ مرتشی'' والا فلسفہ بیان کیا تو وہ مجھے خطرناک نتائج کی دھمکیاں دیتے ہوئے چراغ پا رخصت ہوگیا اور اب...... خاتون مذکورہ کی آمد نے پلک جھپکتے میں غیر محسوس طور پر میری ساری کوفت زائل کر دی تھی۔

میں نے پیشہ ورانہ مسکراہٹ سے اس متاثر کن شخصیت کی مالک خاتون کا استقبال کیا۔ عزت و احترام سے بٹھایا اور اس کی آمد کی غرض و غایت دریافت کی۔

وہ دل گیر لہجے میں گویا ہوئی۔ ''وکیل صاحب! میں ایک بہت بڑی مشکل میں پھنس گئی ہوں۔ سمجھ میں کچھ نہیں آتا، کیا کروں...... کہاں جاؤں؟ ایک جاننے والے نے آپ کا پتہ بتایا تو میں آپ کے پاس چلی آئی ہوں۔''

''آپ کو کسی قسم کی قانونی مدد درکار ہے؟'' میں نے استفسار کیا۔

''جی ہاں۔'' اُس کے ٹھہرے ہوئے لہجے میں درد کی آمیزش تھی۔

میں نے کہا۔ ''ابھی تھوڑی دیر پہلے آپ نے کسی مشکل میں پھنسنے کا ذکر کیا تھا۔ کیا اسی سلسلے میں آپ کو میری مدد کی ضرورت ہے؟''

وہ بولی۔ ''میرے جوان بیٹے کو پولیس نے گرفتار کرلیا ہے۔''

''کس جرم میں؟''

''آصف نے کوئی جرم نہیں کیا وکیل صاحب۔'' اُس کے لہجے میں ماما کا اعتماد شامل

تھا۔ ''آصف مجرم ہو ہی نہیں سکتا۔ میں نے اُس کی تربیت اس انداز میں......''

''معاف کیجئے گا خاتون۔'' میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔''اگر پولیس نے آپ کے بیٹے آصف کو گرفتار کیا ہے تو اس کی کوئی نہ کوئی وجہ بھی ہوگی۔ میں وہ وجہ جاننا چاہتا ہوں۔''

اُس کے ہونٹوں پر پھیکی مسکراہٹ نمودار ہوئی، اُداس لہجے میں بولی۔''وکیل صاحب! فی زمانہ پولیس کو اپنی کارروائی کے لئے کسی سبب یا وجہ کی ضرورت نہیں رہی۔ کسی بے اثر اور کمزور شخص کو تو وہ تفریحاً بھی گرفتار کرسکتی ہے۔ ہاں، البتہ با اثر، طاقت ور اور صاحب اختیار شخص پر ہاتھ ڈالنے کے لئے اُسے سو مرتبہ سوچنا پڑتا ہے۔''

میں نے کہا۔''خاتون......؟''

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا تھا۔ وہ میرے مقصد کو سمجھتے ہوئے جلدی سے بولی۔

''میرا نام دلشاد بانو ہے۔ میں پاپوش نگر میں رہتی ہوں۔''

دلشاد بانو کی عمر کا اندازہ میں نے لگ بھگ چالیس سال لگایا جو بعد ازاں تقریباً درست ہی نکلا تھا۔ وہ اپنی زندگی کا بیالیس واں سال گزار رہی تھی۔

''دلشاد بانو صاحبہ!'' میں نے اُسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔''آپ نے پولیس کے بارے میں جو نظریہ پیش کیا ہے اس سے کلی طور پر انکار تو ممکن نہیں ہے، بہرحال یہ کوئی فارمولا بھی نہیں ہے۔ درحقیقت پولیس، صاحب اختیار و صاحب اقتدار افراد پر فوراً ہاتھ ڈالتے ہوئے اس لئے بھی گھبراتی ہے کہ ان کے خلاف ٹھوس ثبوت حاصل کرنا خاصا مشکل ہوتا ہے۔''

''اور بے اثر افراد کی گرفتاری کے لئے کسی ٹھوس ثبوت بلکہ سرے سے کسی ثبوت کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی جاتی۔'' دلشاد بانو نے شکستہ لہجے میں کہا۔

میں نے اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے پوچھا۔''ابھی تک آپ نے اپنے بیٹے کی گرفتاری کی وجہ نہیں بتائی؟''

''آصف علی پر قتل کا الزام ہے۔'' وہ تھکے ہوئے لہجے میں بولی۔

''اوہ!'' میں سیدھا ہوکر بیٹھ گیا اور رف پیڈ و قلم سنبھال لیا پھر سوال کیا۔''قتل کون ہوا؟ میرا مطلب ہے آصف علی پر کس کے قتل کا الزام ہے؟''

دلشاد بانو نے جواب دیا۔''مقتول کا نام منصور علی کرمانی ہے۔''

''قتل کس جگہ ہوا ہے؟''

''منصور علی کی کنسٹرکشن کمپنی ''کرمانی بلڈرز'' کے دفتر میں۔''

میں نے پوچھا۔''یہ دفتر کہاں واقع ہے؟''

''بہار آباد میں۔''

''کیا آپ کا بیٹا آصف علی ''کرمانی بلڈرز'' میں ملازمت کرتا تھا؟''

دلشاد بانو نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔''آصف علی تو ایک سوئٹس کمپنی میں ملازم ہے۔''چوہدری سوئٹس کمپنی'' پی آئی بی کالونی میں ہے۔''

اُس کے جواب نے مجھے الجھا دیا۔ میں نے پوچھا۔''آپ کے بیٹے آصف علی کا مقتول منصور کرمانی سے کیا تعلق ہے؟''

''آصف علی، مقتول منصور علی کرمانی کا سگا بیٹا ہے۔'' مسحور کن شخصیت کی مالک دلشاد بانو نے انکشاف انگیز لہجے میں بتایا تو میں چونکے بغیر نہ رہ سکا۔

میں نے بے ساختہ کہا۔''یعنی مقتول آپ کا شوہر تھا؟''

''کہہ سکتے ہیں۔'' اُس کا جواب مبنی بر ابہام تھا۔

''کہہ سکتے ہیں کا کیا مطلب ہوا؟''

اُس نے بتایا۔''ہمارے درمیان علیحدگی چل رہی تھی۔''

''کتنے عرصے سے؟'' میں نے پوچھا۔

''تقریباً چار سال سے۔''

''کیا آصف علی آپ کا اکلوتا بیٹا ہے؟''

دلشاد بانو نے جواب دیا۔''آصف علی سب سے بڑا ہے۔ اس سے چھوٹے دو بچے ہیں۔ نادیہ اور واصف۔''

''یہ تینوں سگے بہن بھائی ہیں؟'' میں نے ایک خیال کے تحت پوچھا۔

''صد فیصد سگے۔''

''کیا علیحدگی کے دوران میں بچے اپنے باپ یعنی مقتول منصور علی کرمانی سے ملتے رہتے تھے؟'' میں نے سوال کیا۔

دلشاد بانو نے ایک لمحے کے توقف سے جواب دیا۔''صرف آصف علی اپنے باپ سے ملتا تھا اور وہ بھی ہر ماہ کی تین تاریخ کو۔ نہ اس سے پہلے اور نہ اس کے بعد۔ اگر تین تاریخ کو چھٹی کا دن پڑ جاتا تو پھر وہ چار تاریخ کو اپنے باپ کے دفتر جاتا تھا۔''

میں نے استفسار کیا۔''ہر ماہ ایک مخصوص تاریخ کو ملنے کا کوئی خاص سبب تھا؟''

دلشاد بانو نے اثبات میں سر ہلایا اور بولی۔ ''ہر ماہ کی تین تاریخ کو آصف علی اپنے باپ کے پاس ایک چیک لینے جاتا تھا۔ مقتول اپنے بچوں کے اخراجات کے لئے نہایت پابندی کے ساتھ ایک ہزار روپے مالیت کا چیک دیا کرتا تھا۔''

''آپ نے اپنے بچوں کے اخراجات کا ذکر کیا ہے۔'' میں نے سوالیہ لہجے میں کہا۔ ''کیا اس رقم میں آپ کا حصہ نہیں ہوتا تھا؟''

وہ جزبز ہوتے ہوئے بولی۔ ''میں اپنا خرچہ اٹھانے کی ہمت رکھتی ہوں۔ سلائی کڑھائی سے لگ بھگ تین سو روپے ماہوار کما لیتی ہوں۔''

میں نے نجی معاملات میں اُسے زیادہ کریدنا مناسب نہ سمجھا اور ٹو دی پوائنٹ سوال کیا۔ ''آصف علی کو کہاں سے گرفتار کیا گیا ہے؟''

''اُس کی کمپنی کے دفتر سے۔''

''یعنی چوہدری سوئٹس کمپنی کے دفتر سے؟''

اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔ میں نے پوچھا۔ ''آصف علی کی گرفتاری کب اور کتنے بجے عمل میں آئی؟''

''کل شام پانچ بجے۔'' دلشاد بانو نے جواب دیا۔

میں نے ٹیبل کیلنڈر پر نگاہ دوڑاتے ہوئے کہا۔ ''یعنی تین جون کو شام پانچ بجے۔'' ایک لمحے کے توقف کے بعد میں نے چونکتے ہوئے کہا۔ ''تین تاریخ کو تو آصف علی اپنے باپ سے چیک لینے جایا کرتا تھا۔ کیا کل بھی وہ ''کرمانی بلڈرز'' کے دفتر گیا تھا؟''

''حسب معمول اُسے جانا تو تھا لیکن میں وثوق سے نہیں کہہ سکتی کہ وہ وہاں گیا تھا یا نہیں۔'' دلشاد بانو نے اُلجھن زدہ لہجے میں بتایا۔ ''کل صبح سے اب تک میں نے آصف کی صورت نہیں دیکھی۔ خدا جانے وہ کس حال میں ہوگا۔''

''آپ کو کب پتہ چلا کہ پولیس نے آپ کے بیٹے کو گرفتار کر لیا ہے؟''

''کل رات آٹھ بجے۔''

''اطلاع کس نے دی تھی؟''

''چوہدری سوئٹس کے اکاؤنٹنٹ خاور حسین نے۔'' اُس نے بتایا۔ ''خاور حسین ناظم آباد میں رہتا ہے۔ اس نے کل رات گھر پر آ کر مجھے اِس سانحے کے بارے میں بتایا تھا۔''

''آپ اپنے بیٹے سے ملنے تھانے گئی تھیں؟''

''کل رات گئی تھی لیکن تھانے والوں نے ملنے نہیں دیا۔''

میں نے پوچھا۔ ''کیا پولیس نے آج آصف علی کو عدالت میں پیش کیا تھا؟''

''میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتی۔'' دلشاد بانو کے لہجے سے بے بسی عیاں تھی۔ ''آج صبح سے تو میں آصف علی کی رہائی کے لئے ہر جاننے والے کا دروازہ کھٹکھٹا رہی ہوں۔ ان ہی جاننے والوں میں سے ایک ہمدرد نے آپ کا پتہ بتایا ہے اور یقین دلایا ہے کہ آپ بہت بڑے وکیل ہیں۔ آپ میرے بیٹے کو باآسانی چھڑا لیں گے۔''

میں نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ ''پولیس کسی ملزم کو ریمانڈ حاصل کئے بغیر ایک رات سے زیادہ حوالات میں نہیں رکھ سکتی۔ مجھے یقین ہے کہ آج صبح پولیس نے آصف علی کو عدالت میں پیش کر کے اُس کا ریمانڈ حاصل کر لیا ہوگا۔''

''وکیل صاحب!'' وہ سراسیمہ نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔ ''میں نے سن رکھا ہے، یہ ریمانڈ بڑی خطرناک چیز ہوتی ہے۔ اس دوران میں پولیس والے ملزم پر بڑا تشدد کرتے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''آپ نے بالکل ٹھیک سن رکھا ہے۔ ریمانڈ کی مدت کے دوران میں پولیس کسی کھمبے سے بھی اقبالِ جرم کروا سکتی ہے۔''

دلشاد بانو کی آنکھیں چھلک پڑیں۔ وہ گلوگیر آواز میں بولی۔ ''وکیل صاحب! میرا بیٹا سراسر بے گناہ ہے۔ وہ تو ایک چیونٹی کو مارنا بھی گناہ سمجھتا ہے، ایک انسان کی جان لینا تو بہت دور کی بات ہے، اور انسان بھی اُس کا سگا باپ۔ نہیں وکیل صاحب! میرا آصف بالکل بے قصور ہے۔ کیا پولیس ایسے معصوم انسان پر بھی تشدد کر سکتی ہے؟''

''پولیس معصوم اور بے قصور کے فلسفے پر یقین نہیں رکھتی خاتون۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''وہ ملزم کو مجرم ثابت کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگاتی ہے۔ اسے اپنی سرخروئی کے لئے ایک ایسا چالان تیار کرنا ہوتا ہے جو ملزم کو مجرم بنا کر سیدھا جیل بھیج دے...... اگر آپ کل رات ہی میرے پاس آ جاتیں تو میں آج صبح آصف علی کی ضمانت کروانے کی کوشش کرتا۔''

''تو کیا اب ضمانت نہیں ہو سکتی؟''

''اب جو کچھ بھی ہوگا، وہ ریمانڈ کی مدت کے بعد ہی ہوگا۔''

''اس کا مطلب ہے، آپ میری کوئی مدد نہیں کر سکتے؟'' اُس کے لہجے میں مایوسی کی جھلک نمایاں تھی۔

میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ''آپ فکر نہ کریں۔ پولیس کو چالان پیش کرنے دیں۔ اس کے بعد میں کوشش کروں گا۔''

"اس وقت تک تو پولیس، آصف کا حشر خراب کر دے گی۔" اُس کی آواز بھیگنے لگی۔

"میرا بے خطا بچہ ظالموں کے شکنجے میں پھنس گیا ہے۔"

مجھے اُس کی حالت پر ترس آنے لگا۔ میں نے اُمید افزا لہجے میں پوچھا۔ "پولیس والوں کی "تفتیش" کا بھی کوئی توڑ نکال لیتے ہیں۔ آپ مجھے یہ بتائیں کہ آصف علی کون سے تھانے کی حوالات میں ہے؟"

"یہ تو مجھے معلوم ہی نہیں ہے۔"

"اچھا، میں معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔" میں نے اس بے خبر خاتون کی حالت پر دل ہی دل میں افسوس کرتے ہوئے کہا پھر اپنے ایک دیرینہ شناسا افضال کے نمبر ڈائل کرنے لگا۔

افضال ایک مقامی اخبار میں کرائم رپورٹر تھا۔ اس شہر غدار میں "چلتا پرزہ" کے نام سے مشہور تھا۔ اسے پورے شہر کی خبریں بالتفصیل معلوم ہوتی تھیں۔

تھوڑی ہی دیر میں افضال نے مطلوبہ معلومات مجھے فراہم کر دیں۔ میں نے ریسیور کریڈل کرنے کے بعد اپنے سامنے بیٹھی ہوئی دلشاد بانو کو دیکھا اور حوصلہ افزا لہجے میں کہا۔

"خاتون! میں نے معلوم کر لیا ہے کہ آپ کا بیٹا کس تھانے میں ہے۔ میں دفتر سے اٹھنے کے بعد اس سے ملاقات کرلوں گا۔"

"آپ میرے بیٹے کو چھڑا لیں گے نا؟"

"اس بات کا فیصلہ تو اس وقت ہوگا جب میں آپ کے بیٹے کا کیس اپنے ہاتھ میں لے لوں گا۔" میں نے واضح الفاظ میں کہا۔

"تو ابھی تک آپ نے آصف علی کا کیس اپنے ہاتھ میں نہیں لیا؟"

میں نے کہا۔ "میں جب تک مطمئن نہ ہو جاؤں اس وقت تک کسی کیس کی پیروی کا فیصلہ نہیں کرتا۔"

"آپ کس طرح مطمئن ہوں گے؟"

"جب مجھے یقین ہو جائے گا کہ آصف علی بے گناہ ہے تو میں خود بہ خود مطمئن ہو جاؤں گا۔" میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔ "میں صرف انہی مؤکلوں کے کیس لڑتا ہوں جن کے بارے میں مجھے اطمینان ہو جاتا ہے کہ وہ کسی ناکردہ جرم میں پولیس کے ہتھے چڑھ گئے ہیں۔"

"میں آپ کو آصف علی کی بے گناہی کا یقین دلاتی ہوں۔"

"آپ کے پاس کوئی ٹھوس ثبوت ہے؟"

"ثبوت!" وہ گڑبڑا گئی۔ "بس...... میرا دل کہتا ہے کہ......"

میں نے اُس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "خاتون، عدالت دل کی آواز پر یقین نہیں رکھتی۔ وہ واقعاتی شہادتیں اور تحریری و مصدقہ دستاویزات مانگتی ہے۔ اپنے بیٹے کی بے گناہی ثابت کرنے کے لئے آپ کے پاس ایسی کوئی چیز موجود ہے؟"

وہ پریشان نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے کہا۔ "آپ کا بیٹا آصف علی مبینہ طور پر اپنے باپ کے قتل کے الزام میں گرفتار ہوا ہے۔ میں اپنے ذرائع سے آپ کے سامنے ہی اس بات کی تصدیق کر چکا ہوں کہ وہ اس وقت عدالتی ریمانڈ پر متعلقہ تھانے کی حوالات میں موجود ہے۔ آپ نے کل صبح سے اُس کی شکل نہیں دیکھی اور نہ ہی اس کے بارے میں کسی قسم کی معلومات رکھتی ہیں۔ اس صورتِ حال میں جب تک میں آصف علی سے بھرپور ملاقات نہ کرلوں اس وقت تک میں یہ کیس لینے یا نہ لینے کا فیصلہ نہیں کر سکتا۔"

"ٹھیک ہے، آپ آصف سے ملاقات کرلیں۔" وہ دل شکستہ لہجے میں بولی۔ پھر ملتجیانہ انداز میں پوچھا۔ "وکیل صاحب! کیا میں بھی آپ کے ساتھ تھانے جا سکتی ہوں؟"

"کیوں نہیں، آپ ضرور جا سکتی ہیں۔" میں نے جواباً کہا۔ "لیکن اس کے لئے آپ کو تھوڑا انتظار کرنا ہوگا۔ میں اپنے مؤکلوں کو فارغ کرلوں پھر ہم دفتر سے نکلیں گے۔ تب تک آپ باہر ویٹنگ رُوم میں تشریف رکھیں۔"

وہ اُٹھ کر کھڑی ہوگئی پھر ہچکچاہٹ آمیز لہجے میں بولی۔ "وکیل صاحب، آپ کی فس تو میں ابھی ساتھ نہیں لائی۔ آپ رقم بتا دیں، میں کل ادا کر دُوں گی۔"

"فیس کا تعین تو کیس کی تفصیلات سننے کے بعد کیا جائے گا۔" میں نے حتمی لہجے میں کہا۔ "ابھی آپ اس سلسلے میں زیادہ پریشان نہ ہوں۔"

وہ متذبذب لہجے میں بولی۔ "وکیل صاحب! مجھے بتایا گیا ہے کہ آپ خاصی بھاری فیس لیتے ہیں۔ لیکن آپ فکر نہ کریں، میں غریب ضرور ہوں مگر آپ سے رعایت نہیں کرواؤں گی۔ آپ اپنی بہترین صلاحیتیں صرف کر کے صرف میرے آصف کو بچا لیں۔"

"ان شاء اللہ میں اپنی پوری کوشش کروں گا۔" میں نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔ "لیکن شرط وہی ہے کہ میں کیس کی نوعیت جاننے کے بعد ہی اس میں ہاتھ ڈالوں گا۔ اگر آپ کا بیٹا واقعی بے گناہ ہے تو اس کا بال بھی بانکا نہیں ہوگا۔"

وہ خاموشی سے میرے چیمبر سے باہر نکل گئی۔

جب میں اپنے چیمبر سے نکلا تو دیوار گیر کلاک رات کے نو بجا رہا تھا۔ انتظار گاہ میں اس وقت دلشاد بانو کے علاوہ دو بچوں کو دیکھ کر میں حیران ہوا۔ دلشاد بانو نے میرے چہرے کے تاثرات سے اندازہ لگا لیا کہ میں حیران ہوا ہوں۔ وہ ان دونوں بچوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

''یہ دونوں آصف علی سے چھوٹے ہیں۔ میں انہیں اپنے ساتھ ہی لے آئی تھی۔'' پھر اُس نے ان دونوں کا تعارف کرواتے ہوئے بتایا۔ ''نادیہ میٹرک میں پڑھتی ہے اور واصف تیسری کلاس میں گیا ہے۔''

میں نے ان دونوں کے سلام کا جواب دیا اور واصف سے مصافحہ بھی کیا۔ واصف کی عمر کم وبیش آٹھ سال رہی ہوگی۔ نادیہ لگ بھگ پندرہ سال کی تھی۔ آدھے گھنٹے کی ڈرائیو کے بعد ہم متعلقہ تھانے پہنچ گئے۔

میں نے دلشاد بانو کو مع عیال تھانے کے برآمدے میں ایک بینچ پر بیٹھنے کی ہدایت کی اور خود ایس ایچ او کے کمرے میں چلا گیا۔ تھانہ انچارج شبیر احمد اپنی کرسی پر موجود تھا۔ شبیر احمد سے میری دیرینہ شناسائی تھی۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ چہک اُٹھا۔

''اوہو، بیگ صاحب تشریف لائے ہیں۔ اب تو ہمارا خدا ہی حافظ ہے۔'' اُس نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ ''خیریت تو ہے جناب، آج کس طرف چڑھائی ہے؟''

میں نے شائستہ لہجے میں کہا۔ ''آپ کے نیاز حاصل کئے بہت دن ہو گئے تھے۔ سوچا، ادھر سے گزر رہا ہوں تو آپ سے بھی ملتا چلوں۔''

''تشریف رکھیں جناب۔'' اُس نے اپنے سامنے رکھی ہوئی کرسی کی جانب اشارہ کیا، پھر اسراریت آمیز دھیمے لہجے میں بولا۔ ''آپ خوامخواہ تو کہیں سے بھی نہیں گزرتے۔ کوئی ضرورت آپ کو ادھر کھینچ لائی ہوگی۔''

''آپ خاصے سمجھ دار ہیں شبیر صاحب۔'' میں نے مبہم لہجے میں کہا۔

وہ اپنی مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے بولا۔ ''کیا خدمت کروں آپ کی؟''

''میں نے سنا ہے، آصف علی نامی ایک نوجوان کو تم نے حوالات میں ڈال رکھا ہے۔'' میں نے سرسری سے لہجے میں کہا۔

''اوہ، تو یہ قصہ ہے۔'' وہ محتاط نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''میں آپ کی معلومات کو چیلنج نہیں کروں گا بیگ صاحب۔''

میں نے پوچھا۔ ''کس چکر میں بند کیا ہے اس نوجوان کو؟''

''جب آپ کو یہ معلوم ہے کہ ہم نے آصف علی کو حوالات میں بند کر رکھا ہے تو یہ بھی پتہ ہوگا کہ اُسے کس چکر میں پکڑا ہے۔'' شبیر احمد مکاری سے مسکرایا۔

میں نے کہا۔ ''میرا مطلب ہے، اُسے کس کیس میں پکڑا گیا ہے؟''

''کیس تو تین سو دو کا ہے جناب۔''

''میں ملزم سے ملنا چاہتا ہوں۔''

وہ زیر لب مسکراتے ہوئے بولا۔ ''بیگ صاحب، ملزم عدالتی ریمانڈ پر ہے۔''

جب کوئی شخص عدالتی ریمانڈ پر پولیس کسٹڈی میں ہوتا ہے تو پولیس کسی کو اس سے ملنے کی اجازت نہیں دیتی۔ تاہم یہ سیر اور سوا سیر کا کھیل ہے۔ اگر پولیس ملزم سے ملاقات سے روکنے کے سو ڈھنگ جانتی ہے تو ہم بھی اس سے ملنے کے ایک سو ایک طریقوں سے واقف ہوتے ہیں۔

''میں آصف علی کا وکیل ہوں۔'' میں نے قدرے جارحانہ لہجے میں کہا۔ ''اور اس سے ملاقات بہت ضروری ہے۔''

تھوڑے سے پس و پیش کے بعد وہ تیار ہو گیا۔ اگر وہ شرافت سے مجھے آصف علی سے ملاقات کی اجازت نہ دیتا تو مجھے کوئی ٹیکنیکل حربہ استعمال کرنا پڑتا۔ شاید دیرینہ شناسائی کا اُس نے لحاظ رکھا تھا۔

شبیر احمد نے گھنٹی بجا کر ایک سادہ لباس اہل کار کو اپنے کمرے میں بلایا اور میری جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''بیگ صاحب کو ملزم آصف علی سے ملوا دو۔'' ایک لمحے کے توقف سے اُس نے اضافہ کیا۔ ''ذرا ہوشیار رہنا اور اُس پر گہری نظر رکھنا۔ وہ تین سو دو کا ملزم ہے۔''

اُس رات ملزم آصف علی کی زبانی مجھے حالات معلوم ہوئے اور بعد میں دلشاد بانو نے جو معلومات فراہم کیں، ان کی بناء پر میں نے وہ کیس لینے کا فیصلہ کر لیا۔ مجھے آصف علی کی بے گناہی کا یقین ہو گیا تھا۔ اُسے ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت قتل کے کیس میں ملوث کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔

میں نے آصف علی سے وکالت نامے پر دستخط کروائے اور اُسے تسلی اور تشفی دی اور حوالات سے نکل آیا۔ ایس ایچ او شبیر احمد کے کمرے کی جانب قدم بڑھاتے ہوئے میں نے دلشاد بانو سے کہا۔

''آپ برآمدے میں جا کر بیٹھیں، میں ابھی آتا ہوں۔''

اُس نے امید بھری نظروں سے مجھے دیکھا اور میری ہدایت کی تعمیل کرتے ہوئے برآمدے کی طرف جانے لگی۔ میں تھانہ انچارج کے کمرے میں داخل ہو گیا۔

''بیگ صاحب! بڑی دیر لگا دی آپ نے۔'' اُس نے چھوٹتے ہی کہا۔ ''کچھ ہمارے لئے بھی چھوڑا ہے یا سب کچھ ہی کشید کر کے لے جا رہے ہیں؟''

میں نے اُس کے طنز کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ''اس کیس کی تفتیش کون کر رہا ہے؟''

''سب انسپکٹر فرید خان۔'' اُس نے جواب دیا۔

میں نے پوچھا۔ ''شبیر صاحب، آپ چالان کب تک پیش کر دیں گے؟''

''جب تفتیشی افسر اپنی تفتیش مکمل کر لے گا۔'' اُس نے غیر واضح انداز میں کہا، پھر بتایا۔ ''ہم نے عدالت سے چودہ روز کا ریمانڈ مانگا تھا لیکن صرف ایک ہفتے کا مل سکا۔ اگر ملزم نے اقبالِ جرم کر لیا تو ان شاء اللہ گیارہ جون کو چالان پیش کر دیا جائے گا۔ بصورتِ دیگر ہمیں ایک ہفتے کا مزید ریمانڈ حاصل کرنا پڑے گا۔''

''اقبالِ جرم؟'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''انچارج صاحب، آپ کون سے اقبالِ جرم کی بات کر رہے ہیں؟ میرا مؤکل انتہائی معصوم اور بے ضرر انسان ہے۔ وہ تو ایک چیونٹی کو مارنے کی بھی جرأت نہیں کر سکتا۔ چہ جائے کہ آپ اُس پر قتل کا الزام عائد کر رہے ہیں۔''

''بیگ صاحب! ہم کسی پر کچا ہاتھ نہیں ڈالتے۔'' شبیر احمد نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے کہا۔ ''آلہ قتل ہمارے قبضے میں آ چکا ہے۔ قتل کا محرک بھی واضح ہے۔''

میں نے کہا۔ ''آپ ایک مفروضے کو بنیاد بنا کر میرے مؤکل کو ملزم ٹھہرا رہے ہیں۔ حقیقت کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔''

''یہ پٹی آپ اپنے مؤکل کو پڑھائیں تو زیادہ بہتر رہے گا۔'' وہ اکتائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''ہم مجرم اور معصوم میں پہچان کرنا بخوبی جانتے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''شبیر صاحب! میں اپنے مؤکلوں کو پٹی نہیں بلکہ کن پٹی پڑھایا کرتا ہوں۔ یہ زیادہ مؤثر اور مفید ثابت ہوتی ہے۔''

''اس کا فیصلہ عدالت میں ہو گا۔''

میں نے اتمامِ حجت کے طور پر کہا۔ ''قتل کا محرک آپ کو معلوم ہو چکا ہے۔ آلہ قتل آپ کے قبضے میں ہے۔ کیس پر آپ کی گرفت مضبوط ہے، پھر ریمانڈ کی مقررہ مدت کے بعد

چالان پیش کرنے کے لئے ملزم کے اقرارِ جرم کی کیا ضرورت ہے؟''

''میں آپ کے ہر سوال کا جواب دینے کا پابند نہیں ہوں۔'' وہ بیزاری سے بولا۔

میں نے پوچھا۔ ''استغاثہ کے گواہوں کے بارے میں کچھ بتائیں گے؟''

''استغاثہ کے گواہوں کی فہرست آپ کو عدالت میں مل جائے گی۔''

''پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کیا کہتی ہے؟''

''پوسٹ مارٹم کی رپورٹ ابھی نہیں ملی۔''

میں نے استفسار کیا۔ ''ابتدائی طبّی معائنے کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟''

''ہمیں جو کچھ بھی کہنا ہے، چالان میں بالتفصیل بیان کر دیں گے۔'' وہ رُکھائی سے بولا۔ ''فی الحال آپ انتظار کریں۔ میں اس سے زیادہ تعاون نہیں کر سکتا۔ آپ مجھ سے مزید اُمید نہ ہی رکھیں تو بہتر ہے۔''

میں اچھی طرح سمجھ گیا تھا کہ شبیر احمد سے مزید کچھ معلوم کرنا سرِ دست ممکن نہیں تھا۔ میں خاموشی سے اٹھا اور اُسے خدا حافظ کہہ کے اُس کے کمرے سے باہر نکل آیا۔

میں برآمدے سے گزرا تو دلشاد بانو نے میرے ساتھ چلتے ہوئے پوچھا۔ ''وکیل صاحب! میرے بیٹے کی ضمانت ہو جائے گی نا؟''

''میں تو پُر اُمید ہوں خاتون۔'' میں نے بااعتماد لہجے میں کہا۔

''اب مجھے کیا کرنا ہو گا؟''

''آپ کل بعد از دوپہر میرے دفتر آ جائیں۔'' میں نے اپنی گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ ''اور اپنے ساتھ آصف علی کے دوست خاور حسین کو بھی لے آئیں۔ بہت سے معاملات میں اُس کی مدد کی ضرورت پیش آ سکتی ہے۔ آصف علی نے جو حالات مجھے بتائے ہیں ان کے پیشِ نظر خاور حسین کو بھی کچھ بھاگ دوڑ کرنا ہو گی۔ تب جا کر بات بنے گی۔''

دلشاد بانو نے متذبذب لہجے میں کہا۔ ''پتہ نہیں، خاور میرے ساتھ آنے پر تیار ہو بھی یا نہیں۔''

''میرے خیال میں تو اُسے اس سلسلے میں پس و پیش سے کام نہیں لینا چاہئے۔'' میں نے یقینی لہجے میں کہا۔ ''آصف علی کا کہنا تو یہ ہے کہ خاور حسین اُس کا کولیگ ہی نہیں بلکہ بہت گہرا دوست بھی ہے۔ ایک دوست ہی دوسرے دوست کی مصیبت میں کام آتا ہے۔''

''ٹھیک ہے، میں اس سے رابطہ کرنے کی کوشش کروں گی۔''

میں نے کہا۔ ''خاور حسین کو واضح طور پر بتا دیں کہ بس ایک گھنٹے کے لئے وہ میرے

دفتر آ جائے، میں اُسے کچھ ضروری کام سونپوں گا۔ چند ہدایات دوں گا پھر وہ واپس چلا جائے۔”

دلشاد بانو نے اثبات میں سر ہلایا۔ میں نے پوچھا۔“آپ یہاں سے کس طرح گھر جائیں گی؟”

“کوئی رکشا یا ٹیکسی دیکھوں گی۔”

“اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو میرے ساتھ ہی گاڑی میں بیٹھ جائیں۔” میں نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔“میں راستے میں کسی مناسب جگہ پر آپ کو ڈراپ کر دوں گا۔”

ایک لمحے کے تذبذب کے بعد وہ اپنے بچوں کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گئی۔ میں نے راستے میں ڈراپ کرنے کے بجائے اُنہیں اُن کے گھر پاپوش نگر پہنچا دیا، پھر میں اپنے گھر کی جانب روانہ ہو گیا۔

✡......✡

دوسرے روز حسب وعدہ دلشاد بانو، خاور حسین کے ساتھ میرے دفتر میں موجود تھی۔ خاور حسین ایک دُبلا پتلا اور اسمارٹ شخص تھا۔ اُس کی عمر لگ بھگ تیس سال تھی۔ وہ “چوہدری سوئٹس” میں اکاؤنٹنٹ تھا۔ اُس کے چہرے کے تاثرات اور بناوٹ سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ ایک یار باش اور قابل بھروسہ شخص تھا۔ موسم کی مناسبت سے اُس نے کاٹن کی پتلون پر آدھی آستین والی شرٹ پہن رکھی تھی۔

میں نے سب سے پہلے خاور حسین سے انٹرویو نما ملاقات کی اور یہ اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ وہ کس حد تک میرے مقاصد کی تکمیل کے لئے کارآمد ہو سکتا تھا۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ وہ ایک مناسب اور موزوں شخص تھا تو میں نے اُسے تفصیل سے بتایا کہ اُسے کیا کرنا ہو گا۔ وہ با آسانی میری باتوں کی تہ تک پہنچ گیا اور اس نے مجھے اپنے بھرپور تعاون کا یقین دلایا۔ آدھے گھنٹے کی گفت و شنید کے بعد میں نے اُسے رخصت کر دیا۔

خاور حسین کے جانے کے بعد دلشاد بانو نے پوچھا۔“وکیل صاحب! آپ نے ابھی تک اپنی فیس کے بارے میں تو کچھ بتایا ہی نہیں؟”

میں نے اُسے اپنی فیس کی رقم بتا دی اور کہا۔“عدالتی اخراجات اس کے علاوہ ہوں گے۔”

وہ بولی۔“وکیل صاحب! اگرچہ یہ خاصی موٹی رقم ہے۔ لیکن آپ فکر نہ کریں، میں آپ

کی پوری فیس ادا کروں گی۔ اپنی محنت کی کمائی میں سے میں نے پیسہ پیسہ جوڑ کر جو رقم جمع کی ہے وہ آصف علی کی بریت پر بے چون و چرا خرچ کر ڈالوں گی۔”

میں نے کہا۔“اگر آپ نے اور آصف علی نے حالات کی تفصیل سے مجھے آگاہ کرتے ہوئے دروغ گوئی سے کام نہیں لیا اور خاور حسین نے بھی حسب توقع تعاون کیا تو ان شاء اللہ آصف علی کا بال بھی بانکا نہیں ہو گا۔”

“وکیل صاحب!” وہ ملتجیانہ لہجے میں بولی۔“مقتول منصور علی کرمانی کے حوالے سے میں نے جن اہم باتوں کا ذکر کیا ہے، وہ آپ آصف علی سے پوشیدہ ہی رکھیں گے۔ میں نے آج تک اُسے اس راز کی خبر نہیں ہونے دی۔”

میں نے کہا۔“آصف علی کے بیان سے میں نے اندازہ لگا لیا ہے کہ وہ آدھی حقیقت سے واقف ہے۔ لیکن میں آپ سے اس قسم کا کوئی وعدہ نہیں کر سکتا۔ عدالتی کارروائی کے دوران میں کوئی بھی ایسا نازک مرحلہ آ سکتا ہے کہ ہمیں آصف علی کو بے گناہ ثابت کرنے کے لئے حقیقت کو منکشف کرنا ہو گا۔”

“تب تو مجبوری ہو گی۔” وہ شکست خوردہ لہجے میں بولی۔“بہرحال آصف علی کی رہائی ہر شے پر مقدم ہے۔”

میں نے کہا۔“آپ ہر قسم کے فکرانہ اندیشے کو ذہن سے جھٹک دیں، جو بھی ہو گا، بہتر ہی ہو گا۔”

“اللہ آپ کی زبان مبارک کرے۔” وہ دُعائیہ انداز میں بولی۔ پھر اپنے پرس میں کچھ تلاش کرنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد اُس نے پرس میں سے ایک لفافہ برآمد کیا، پھر اسے میری جانب بڑھاتے ہوئے بولی۔“فی الحال یہ رقم بطور ایڈوانس رکھ لیں۔ باقی چند روز بعد میں پہنچا دوں گی۔”

میں نے لفافہ کھول کر رقم گنی۔ وہ میری مطلوبہ فیس سے تھوڑی ہی کم تھی۔ میں نے مذکورہ لفافہ اپنی میز کی دراز میں رکھتے ہوئے کہا۔“اس دوران میں آپ کو کوئی اور خاص بات معلوم ہو تو مجھے ضرور بتائیں۔ مجھے کیس کی تیاری میں آسانی رہے گی۔”

“میں ہر خاص و عام اور ظاہر و پوشیدہ بات آپ کو بتا چکی ہوں وکیل صاحب۔” دلشاد بانو نے آب دیدہ نظروں سے مجھے دیکھا۔“سب سے اہم بات مجھے یہی معلوم ہے کہ آصف علی بے گناہ ہے۔”

“حالات و واقعات اسی جانب اشارہ کرتے ہیں کہ آصف علی کو کسی سوچی سمجھی سازش

کے تحت پھانسنے کی کوشش کی گئی ہے۔'' میں نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ ''یہی بات مجھے عدالت میں ثابت کرنا ہوگی۔''

''اب مجھے آپ کے پاس کب آنا ہوگا؟''

میں نے کہا۔ ''ہماری ملاقات اب عدالت کے کمرے میں ہی ہوگی۔''

''میں سمجھی نہیں؟'' وہ اُلجھن آمیز نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔

میں نے وضاحت آمیز لہجے میں کہا۔ ''عدالت نے پولیس کو صرف ایک ہفتے کا ریمانڈ دیا ہے حالانکہ انہوں نے پورے چودہ دن کا ریمانڈ مانگا تھا۔ اب یہ لوگ آصف علی کو گیارہ جون کو عدالت میں پیش کریں گے۔ آپ گیارہ جون کو متعلقہ عدالت میں آ جائیں۔'' پھر میں نے دلشاد بانو کو مذکورہ عدالت کا نام بتا دیا۔

وہ بولی۔ ''اُسی روز آصف کی ضمانت ہو جائے گی نا؟''

''میں اُس روز ضمانت کی درخواست دائر کروں گا۔'' میں نے بتایا۔ ''مجھے قوی اُمید ہے کہ آپ کے بیٹے کی ضمانت ہو جائے گی۔ لیکن اس کے لئے آپ کو ایک ضروری کام کرنا ہو گا۔''

''وہ کیا وکیل صاحب؟''

''ضمانت کی رقم کا انتظام۔'' میں نے بتایا۔

''مثلاً کتنی رقم؟''

میں نے کہا۔ ''کم از کم پچاس ہزار روپے۔''

''اوہ! یہ تو بہت بڑی رقم ہے۔''

میں نے کہا۔ ''قتل کے ملزم کی ضمانت اوّل تو ہوتی ہی بڑی مشکل سے ہے۔ اور اگر ہو بھی جائے تو بھاری رقم کے عوض ہوتی ہے۔''

وہ پریشان ہوکر بولی۔ ''میں اتنی بڑی رقم کا بندوبست نہیں کر سکتی۔''

''ضمانت کا ایک دوسرا طریقہ بھی ہے۔'' میں نے کہا۔

''وہ کیا طریقہ ہے وکیل صاحب؟''

میں نے بتایا۔ ''آپ شخصی ضمانت کا انتظام کر لیں۔''

''میری تو کسی سے جان پہچان بھی نہیں ہے۔'' وہ مایوسی سے بولی۔ ''ایسے با اثر شخص کا کہاں سے انتظام کروں گی؟''

میں نے اُسے ایک راہ سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''آپ ایسا کریں، چوہدری سوئٹس کے

مالک عباس چوہدری سے بات کریں۔ آصف علی گزشتہ دو سال سے عباس چوہدری کے پاس کام کر رہا ہے۔ وہ آصف علی کے کام اور ریکارڈ سے مطمئن ہے۔ وہ یقینی طور پر آصف علی کی ضمانت لینے پر تیار ہو جائے گا۔''

''ٹھیک ہے، میں آج ہی عباس چوہدری سے جا کر ملتی ہوں۔'' دلشاد بانو نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا، پھر پوچھا۔ ''میرے لئے اور کوئی خاص ہدایت؟''

میں نے اُسے چند اہم باتیں ذہن نشین کروائیں، پھر وہ مجھے دُعائیں دیتے ہوئے رخصت ہوگئی۔

قارئین کرام! قبل اس کے کہ عدالتی کارروائی کی تفصیل آپ کی خدمت میں پیش کی جائے، میں اس کیس کے پس منظر سے آپ کو آگاہ کرنا چاہتا ہوں۔ آصف علی اور اُس کی والدہ دلشاد بانو کی زبانی مجھے جو واقعات معلوم ہوئے، ان میں سے غیر ضروری باتوں کو حذف کرتے ہوئے میں خلاصہ بیان کروں گا، تاہم ایک بات ذہن میں رہے کہ آصف علی کے کولیگ خاور حسین کی فراہم کردہ معلومات اور دیگر چند اہم نکات کو میں دانستہ سردست آپ سے مخفی رکھوں گا۔ ان کا ذکر عدالتی کارروائی کے دوران میں مناسب موقع پر آئے گا۔

مقتول منصور علی کرمانی، دلشاد بانو کا دُور کا رشتے دار تھا اور ان کی شادی خاندان کی رضامندی سے ہوئی تھی۔ دلشاد بانو مناسب شکل وصورت کی مالک ایک وفا شعار اور سلیقہ مند عورت تھی۔ منصور علی کرمانی اس کے مقابلے میں کم رو تھا۔ اُس کا شمار بدصورت حضرات میں کیا جا سکتا تھا یعنی وہ معمولی ترین صورت شکل رکھتا تھا۔ اس پر منصور علی کرمانی کا ذریعہ معاش بھی کوئی قابل قدر نہیں تھا۔ وہ راج مستری کا کام کرتا تھا۔

کچھ عرصے بعد منصور علی کرمانی نے اچانک پٹری تبدیل کر لی اور راج مستری کا کام چھوڑ کر ٹھیکے دار بن گیا۔ وہ چھوٹے چھوٹے مکانوں کی تعمیر کے ٹھیکے لینے لگا۔ اس کے ساتھ ہی اُس کی آمدنی میں بھی اضافہ ہوا اور گھر میں خوشحالی آ گئی۔ دلشاد بانو اس ترقی پر خاصی خوش تھی۔ ایک سال کے اندر اندر منصور علی کرمانی کی ترقی نے اپنی رفتار میں بے پناہ اضافہ کیا اور آنے والے چند سالوں میں وہ بڑے بڑے بنگلوں کے ٹھیکے لینے لگا۔ اس تیز رفتار ترقی نے دلشاد بانو کو بے چین کر دیا۔ اُڑتی اُڑتی کچھ ناخوشگوار سی خبریں اُس کے کانوں تک پہنچنے لگیں۔ ان خبروں کا تعلق منصور علی کرمانی کی بے ایمانیوں اور چال بازیوں سے تھا۔ اُس نے اپنے کام میں بد دیانتی اور دھوکا دہی کو بھی شامل کر لیا تھا۔ ایک رات دلشاد بانو نے اپنے شوہر سے بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اُس نے اب تک حاصل شدہ منصور علی کرمانی کی ہیرا

پھیریوں کی تفصیل اُس کے سامنے بیان کی اور پوچھا۔
''میں نے آپ کے بارے میں جو کچھ سنا ہے، اس میں کس حد تک حقیقت ہے؟''
وہ نظریں چراتے ہوئے بولا۔ ''چھوڑو، فضول باتوں سے اپنے ذہن کو نہ تھکایا کرو۔''
''یہ فضول باتیں نہیں ہیں منصور۔'' دلشاد بانو نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''آپ میرے سوال کی تصدیق یا تردید کریں۔ میں بہت دنوں سے انگاروں پر لوٹ رہی ہوں۔ آپ سوچ نہیں سکتے کہ میرے ضمیر پر کتنا بوجھ ہے۔''
وہ جواب دینے کے بجائے اُلٹا مستفسر ہوا۔ ''یہ ضمیر کس چڑیا کا نام ہے؟''
''آپ میری بات کو مذاق میں نہ اُڑائیں۔'' دلشاد بانو نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ ''جب سے مجھے معلوم ہوا ہے کہ ہمارے گھر میں حرام کی کمائی آ رہی ہے، میری جان عذاب میں آئی ہوئی ہے۔''
''تمہاری جان تو ذرا ذرا سی بات پر عذاب میں آ جاتی ہے۔''
''آپ جسے ذرا سی بات سمجھ رہے ہیں، وہ میرے نزدیک نہایت اہمیت کی حامل ہے۔''
دلشاد بانو نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''مجھے کسی صورت میں یہ گوارا نہیں ہے کہ میرے بچوں کی پرورش ایسے مال سے ہو جسے حاصل کرنے کے لئے فراڈ اور بے ایمانی سے کام لیا گیا ہو۔''
''تو گویا تم اچانک بیٹھے بٹھائے ایمانداری کے مرض میں مبتلا ہو گئی ہو؟'' منصور علی نے تمسخرانہ انداز میں کہا۔
''آپ اُلٹے سیدھے سوال کر کے اصل موضوع سے دامن چھڑا رہے ہیں منصور۔'' دلشاد بانو نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ''آپ مجھے یہ بتائیں کہ جو کچھ میں نے آپ کے بارے میں سنا ہے، وہ غلط ہے یا درست؟''
منصور علی نے خفگی آمیز لہجے میں کہا۔ ''تم نے میرے بارے میں یہی سنا ہے نا کہ میں ٹھیکے داری کے کام میں گھپلے بازی سے کام لے رہا ہوں۔ ناقص میٹریل استعمال کرتا ہوں۔ دروغ گوئی کو وتیرہ بنا رکھا ہے۔ بڑے بڑے با اثر لوگوں سے میرے تعلقات ہیں۔ انہیں رشوت دے کر ناجائز کام کرواتا ہوں اور......''
''خدارا، مجھے یہ سب باتیں نہ بتائیں۔'' دلشاد بانو نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ''بس اتنا کہہ کر مجھے یقین دلا دیں کہ ہر معاملے میں آپ کے ہاتھ صاف ہیں۔ آپ اپنے اہل وعیال کی پرورش رزقِ حلال سے کر رہے ہیں۔''

''میں رزقِ حلال اور رزقِ حرام کے فلسفے کو نہیں مانتا۔'' منصور علی کرمانی نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ ''بس میں جو کچھ کما رہا ہوں، وہ میری محنت کا نتیجہ ہے۔ اس کے لئے میں کسی کو جواب دہ نہیں ہوں۔''
''یعنی آپ تسلیم کرتے ہیں کہ میں نے آپ کے بارے میں جو کچھ سنا ہے، وہ سب صحیح ہے؟'' دلشاد بانو نے استفہامیہ نظر سے اپنے شوہر کو دیکھا۔
وہ ذومعنی لہجے میں بولا۔ ''میں جو کچھ بھی کر رہا ہوں وہ تم لوگوں کی بھلائی کے لئے ہی کر رہا ہوں۔ میں تمہیں اور اپنے تینوں بچوں کو زیادہ سے زیادہ آرام و آسائش مہیا کرنا چاہتا ہوں۔'' اُس وقت چھوٹے بچے واصف کی عمر ایک سال تھی۔
دلشاد بانو نے حتمی لہجے میں کہا۔ ''ہمیں ایسے آرام و آسائش کی ضرورت نہیں ہے جو مالِ حرام سے مہیا کیا جائے۔''
''تم کیا کہنا چاہتی ہو؟''
''میں جو کچھ کہنا چاہتی ہوں، وہ واضح الفاظ میں کہہ دیا۔'' دلشاد بانو دوٹوک لہجے میں بولی۔ ''اگر آپ نے اپنی اصلاح نہیں کی تو ہمیں اپنا راستہ الگ کرنا پڑے گا۔''
عام طور پر بیویاں ایسے شوہروں کو زیادہ پسند کرتی ہیں جو انہیں زیادہ سے زیادہ سہولتیں فراہم کریں۔ معاشرے میں ان کا معیارِ زندگی بلند ہو۔ وہ دوسروں کو بتا سکیں کہ وہ بھی کوئی توپ قسم کی چیز ہیں، ہزاروں سے اعلیٰ و افضل ہیں۔ زیادہ عزت دار اور صاحب ثروت ہیں۔ ان کے گھر میں وہ وہ چیزیں موجود ہیں جو کسی دوسرے کو میسر نہیں۔ یہ سب کچھ چونکہ دولت کی فراوانی سے حاصل ہوتا ہے اس لئے اگر شوہر بے تحاشہ دولت کما رہا ہو تو بیویاں اس حقیقت کی طرف سے آنکھ بند کر لیتی ہیں کہ وہ دولت کن ذرائع سے آ رہی ہے۔ ہوسِ زر اور حصولِ جاہ و حشم جائز و ناجائز کی پہچان مٹا دیتے ہیں۔ لیکن دلشاد بانو ایک مختلف قسم کی عورت تھی۔ اس لئے نہایت بہادری کے ساتھ اپنے بے ایمان شوہر کے سامنے ڈٹی ہوئی تھی۔
منصور علی کرمانی نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''کیا تم مجھے چھوڑ کر جانے کی دھمکی دے رہی ہو؟''
''بہ حالت مجبوری مجھے یہ بھی کرنا پڑے گا۔''
''کہاں جاؤ گی تم؟''
''میں اپنے بچوں کو لے کر کہیں بھی چلی جاؤں گی۔'' دلشاد بانو نے دل شکستہ لہجے میں

کہا۔ ''لیکن ان کے شکم میں لقمہ حرام نہیں اترنے دوں گی۔''
''وہ صرف تمہارے ہی نہیں، میرے بھی بچے ہیں۔''
''وہ میرے ساتھ رہنا چاہتے ہیں۔''
''اس کا مطلب ہے، تم ان کی برین واشنگ کرتی رہی ہو؟''
دلشاد بانو نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ''میں نے اُنہیں غلط اور صحیح کی پہچان کروائی ہے۔ انہیں جائز اور ناجائز میں تمیز کرنا سکھایا ہے۔ مجھے فخر ہے کہ وہ حلال و حرام کا فرق بہ خوبی سمجھتے ہیں۔ میں نے ایک ماں ہونے کے ناتے ان کی جیسی تربیت کی ہے، وہ میرا فرض بنتا تھا۔''

''ہوں!'' منصور علی کرمانی نے ایک طویل سانس چھوڑتے ہوئے کہا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے، اگر تم لوگ مجھے چھوڑ کر چلے جاتے ہو تو میں نقصان میں رہوں گا؟''
''آپ کے بارے میں، میں کوئی خیال ظاہر نہیں کر سکتی۔'' دلشاد بانو نے معتدل لہجے میں کہا۔ ''البتہ اتنا ضرور کہوں گی کہ اگر آپ نے اپنی روش نہ بدلی اور رزق حلال کو اپنا شعار نہ بنایا تو ایسی صورت میں آپ سے علیحدگی اختیار کرنا میرے لئے ہر لحاظ سے سودمند ثابت ہوگا۔''

منصور علی نے چبھتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔ ''الگ رہ کر تین بچوں کو پال لو گی؟''
''میں محنت سے نہیں گھبراتی۔'' دلشاد بانو نے فخریہ لہجے میں کہا۔ ''دنیا کی ہر ماں اپنی اولاد کو پالنے کے ہزاروں طریقوں سے واقف ہوتی ہے۔''
''یہ بچے پُر آسائش زندگی کے عادی ہو چکے ہیں۔'' منصور علی کرمانی نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''دو وقت کا فاقہ ہو گیا تو تمہارے دشمن ہو جائیں گے۔ پھر انہیں اپنے باپ کی یاد ستانے لگے گی۔ وہ باپ جو تمہارا شوہر ہے اور جو تمہاری نظر میں فراڈیا، دھوکے باز، بے ایمان اور حرام خور ہے۔''

دلشاد بانو نے کہا۔ ''پہلی بات تو یہ کہ رزق بہم پہنچانے کی ذمہ داری اس ذاتِ پاک نے اپنے سر لے رکھی ہے۔'' اُس نے آسمان کی جانب اشارہ کیا اور اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ''وہ جسے چاہے فراوانی سے عطا کرے، جسے چاہے ایک ایک دانے کو ترسا دے۔ اگر خدانخواستہ کبھی یہ بچے میری تنگ دستی اور فاقہ کشی سے گھبرا کر آپ کی طرف رُخ کریں گے تو میں انہیں روکوں گی نہیں، اور مجھے یقین واثق ہے کہ ایسا کبھی نہیں ہو گا۔''
''اس وقت تم جذبات کے ریلے میں بہہ رہی ہو۔'' منصور علی کرمانی نے سنجیدہ لہجے میں

کہا۔ ''لیکن میں فوری طور پر کوئی فیصلہ کرنے کے حق میں نہیں ہوں۔ اس بات کو ذہن سے نکال دو کہ میں اپنے راستے سے واپس لوٹ آؤں گا۔ مجھے ابھی اور ترقی کرنا ہے...... بہت زیادہ ترقی۔ تم ٹھنڈے دل و دماغ سے اچھی طرح سوچ لو۔ ہم پھر کبھی اس موضوع پر بات کریں گے۔''
دلشاد بانو نے مدبرانہ لہجے میں کہا۔ ''مجھے بھی کوئی جلدی نہیں ہے۔ میں حتیٰ الامکان کوشش کروں گی کہ آپ کو سیدھی راہ پر لے آؤں۔ ناکام یا مایوس ہونے کے بعد ہی اپنا راستہ الگ کروں گی۔ آپ بھی ذرا اپنے گریبان میں جھانکیں اور اس تباہی و بربادی کو محسوس کرنے کی کوشش کریں جو آپ کے اختیار کردہ راستے کی منزل ہے۔''
اُس روز کے بعد سے دونوں نے ایک دوسرے کو اپنے رنگ میں رنگنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ انہی کوششوں میں بعض اوقات کئی تلخ مقامات بھی آئے کیونکہ اب منصور علی کرمانی نے نامحرم عورتوں سے بھی تعلقات استوار کرنا شروع کر دیئے تھے۔ دلشاد بانو کو کسی نہ کسی طرح اُس کی سرگرمیوں کے بارے میں معلوم ہو ہی جاتا تھا۔ پھر اُسے پتہ چلا کہ منصور علی کرمانی ایک رشوت خور اعلیٰ سرکاری عہدے دار سے مل کر ایک ایسے پلازا کا ٹھیکا حاصل کر چکا ہے جو اوّل آخر فراڈ پر مبنی ہے۔ دلشاد بانو نے اس سلسلے میں لب کشائی کی تو ان کے درمیان خوب لڑائی ہوئی۔
''تمہیں اگر میرے گھر میں رہتے ہوئے کوئی تکلیف ہے تو دفع ہو جاؤ یہاں سے۔'' منصور علی نے دہاڑ آمیز لہجے میں کہا۔ ''میں اپنے معمولات کو نہیں بدل سکتا۔ میں جس سے چاہوں گا، ملوں گا۔ جو منصوبہ بناؤں گا، اس پر عمل بھی کروں گا۔ تم اپنی ایمانداری کو لے کر جہاں جانا چاہو، چلی جاؤ۔ میں تمہیں روکنے کی کوشش نہیں کروں گا۔ مجھے اب تمہاری کوئی ضرورت نہیں رہی۔''
''میں نے سنا ہے، آپ دوسری شادی کرنا چاہتے ہیں؟'' دلشاد بانو نے روہانسے لہجے میں کہا۔
وہ غصے سے بولا۔ ''میں دوسری شادی کروں یا تیسری، تم کون ہوتی ہو میرے معاملات میں دخل دینے والی؟''
''میں آپ کی بیوی ہوں منصور!''
''اوہ...... بیوی؟'' وہ تحقیر آمیز لہجے میں بولا۔ ''بڑا فخر ہے نا تمہیں میری بیوی ہونے پر اسی لئے میرے ہر معاملے میں ٹانگ پھنساتی ہو۔ چلو آج میں تمہیں اس فخر کا انعام بھی

دے ہی دیتا ہوں۔"

"آپ نے ہمیشہ میرے فخر کو خاک میں ملایا ہے۔" وہ گلوگیر لہجے میں بولی۔ "آپ نے جو روش اختیار کر رکھی ہے وہ میرے لئے باعث ندامت ہے۔"

"تمہیں زیادہ نادم ہونے کی ضرورت نہیں ہے احمق عورت!" منصور علی غصے سے چنگھاڑا۔ "میں نے تمہیں اپنی زندگی سے نکالنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ میں تمہیں آزاد کرتا ہوں...... تمہیں طلاق دیتا ہوں......"

"یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟" وہ بھونچکا رہ گئی۔

وہ نفرت آمیز لہجے میں بولا۔ "تمہارے ضمیر کا بوجھ ہلکا کر رہا ہوں۔ تمہیں میری طرف سے طلاق ہے۔"

"خدارا...... منصور! اللہ کے واسطے اپنی زبان پر کنٹرول کریں۔ آپ اس وقت ہوش و حواس میں نہیں ہیں۔" وہ گڑگڑائی۔

منصور علی نے زہر خند لہجے میں کہا۔ "اے بدبخت عورت، تم نے میری زندگی کو جہنم بنا دیا ہے۔ میں تمہیں طلاق دیتا ہوں۔ اپنی زندگی سے ہمیشہ کے لئے خارج کرتا ہوں۔ تم جہاں جانا چاہو، چلی جاؤ۔ اس گھر سے جو لے جانا چاہو، لے جاؤ۔ میں جب رات کو گھر آؤں تو مجھے تمہاری صورت نظر نہیں آنی چاہئے۔"

اپنی بات ختم کرتے ہی منصور علی کرمانی تیز قدموں سے چلتے ہوئے گھر سے نکل گیا۔ وہ صبح کا وقت تھا۔ دونوں بڑے بچے اسکول جا چکے تھے۔ چھوٹا واصف ابھی سو رہا تھا۔ دلشاد بانو کے بچوں کو مطلق خبر نہ تھی کہ اس پر کتنی بڑی قیامت گزر چکی تھی۔

وہ تھوڑی دیر تک آنسو بہاتی رہی۔ پھر اچانک اُسے جیسے قرار سا آ گیا۔ یہ بات تو طے تھی کہ منصور علی کرمانی سے اب اُس کا کوئی رشتہ نہیں رہا تھا۔ وہ اُسے طلاق دے چکا تھا۔ دلشاد بانو نے اسی وقت فیصلہ کر لیا کہ وہ اپنے بچوں کو اس سانحے کے بارے میں کچھ نہیں بتائے گی۔ وہ سورج غروب ہونے سے پہلے پہلے تینوں بچوں کو ساتھ لے کر اس گھر سے نکل جائے گی۔ اگر بچوں نے اسے کریدنا چاہا تو وہ انہیں یہی بتائے گی کہ اُس نے منصور علی کرمانی سے علیحدگی اختیار کر لی ہے۔

دلشاد بانو نے شروع میں میرے استفسار پر بھی یہی بتایا تھا کہ گزشتہ چار سال سے اُس کی اپنے شوہر سے علیحدگی چل رہی تھی، تاہم بعد ازاں اُس نے مجھے حقیقت حال سے آگاہ کر دیا تھا اور تاکید کی تھی کہ میں آصف علی کو اس بارے میں کچھ نہ بتاؤں۔ آصف علی ابھی

تک یہی جانتا تھا کہ اُس کی ماں کو طلاق نہیں ہوئی تھی لیکن میں نے واضح طور پر دلشاد بانو سے کہہ دیا تھا کہ اب یہ راز پوشیدہ نہیں رہ سکے گا۔

قصہ مختصر، دلشاد بانو اپنے تینوں بچوں کو لے کر پاپوش نگر میں اپنی رشتے کی ایک خالہ کے پاس چلی آئی۔ اُس کے والدین کا اس دوران میں انتقال ہو چکا تھا۔ قریبی رشتے میں وہی ایک خالہ تھیں۔ مذکورہ خالہ کو بھی دلشاد بانو نے یہی بتایا تھا کہ اپنے شوہر سے اُس کی ان بن ہو گئی تھی۔ خالہ کچھ دن تک تو اُس کے زخموں پر مرہم رکھتی رہی، پھر اُس نے آنکھیں پھیرنا شروع کر دیں۔ اُس کے اس رویئے کی وجہ اُس کا شوہر تھا۔ دلشاد بانو کی خالہ کے شوہر کا مؤقف یہ تھا کہ دلشاد کو واپس اپنے شوہر کے گھر جانا چاہئے۔ اس سلسلے میں وہ منصور علی کرمانی سے بھی بات کرنے کو تیار تھا۔ مگر دلشاد بانو نے سختی سے منع کر دیا۔ نتیجتاً دلشاد بانو کی خالہ کے شوہر کا ناراض ہونا لازمی تھا اور بیوی اپنے شوہر کو دیکھتے ہوئے اُٹھتے بیٹھتے دلشاد کو یہ باور کراتی رہتی تھی کہ اب اسے اپنا کہیں اور ٹھکانا کر لینا چاہئے۔

اسی دوران میں آصف علی نے میٹرک کر لیا اور ساتھ ہی یہ فیصلہ بھی سنا دیا کہ اب وہ نوکری کرے گا اور ساتھ ہی پرائیویٹ طور پر اپنی تعلیم بھی جاری رکھے گا۔ دلشاد بانو کو اس وقت اپنی خالہ کے یہاں آئے ہوئے تین ماہ ہو چکے تھے۔ آصف علی خالہ اور خالو کے رویئے سے بخوبی آگاہ تھا۔ اُس نے دلشاد بانو سے کہا۔

"امی! کل سے ہم الگ گھر میں رہیں گے۔"

"کون سے الگ گھر میں بیٹا؟" دلشاد بانو نے استفسار کیا۔

آصف علی نے بتایا۔ "میں نے اسی محلے میں دو کمروں کا ایک مکان کرائے پر حاصل کر لیا ہے۔ کل ہم وہاں شفٹ ہو رہے ہیں۔"

"پتہ نہیں، تم کیا اُلٹی سیدھی ہانک رہے ہو؟" دلشاد بانو نے اُلجھن آمیز لہجے میں کہا۔ "تم نے کرائے کا مکان کس طرح حاصل کر لیا؟ اس کا کرایہ کون دے گا؟ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔"

"آپ ذہن پر زیادہ زور نہ دیں امی۔" آصف علی نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔ "مجھے ایک نوکری مل گئی ہے۔ میں آج ہی بات پکی کر کے آ رہا ہوں۔ مکان کا کرایہ میں خود ہی اپنی تنخواہ سے دوں گا اور پورے گھر کا خرچہ بھی اٹھاؤں گا۔ آپ کو دوسروں کے در پر پڑ کر تلخ و ترش باتیں سننے کی ضرورت نہیں ہے۔"

دلشاد بانو کو خوشی بھی ہوئی کہ اُس کا بیٹا ایک مضبوط سہارا ثابت ہو رہا تھا، تاہم اُس نے

دھیمی آواز میں کہا۔ ''تمہیں کون سی نوکری ملی ہے بیٹا، تنخواہ کتنی ہو گی اور کتنے کرائے کا مکان حاصل کیا ہے تم نے؟''

''امی! نوکری تو فی الحال کوئی خاص نہیں ہے۔'' آصف علی نے جواب دیا۔ ''صدر میں کپڑے کی ایک دُکان پر سیلز مین کا کام ہے۔ تنخواہ پانچ سو روپے ہو گی۔ مکان کا کرایہ میں نے دو سو ٹھہرایا ہے۔'' ایک لمحے کے توقف سے اُس نے اضافہ کیا۔ ''آپ فکر نہ کریں امی، کچھ عرصے بعد تنخواہ بڑھ جائے گی۔''

چنانچہ اس صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے دلشاد بانو تینوں بچوں کو لے کر دو گلی آگے کرائے کے مکان میں منتقل ہو گئی۔ آصف علی نے اپنی ماں سے جو کچھ بھی کہا تھا، اس میں جھوٹ کی آمیزش تھی۔ دراصل حقیقت یہ تھی کہ چند روز قبل منصور علی کرمانی سے اُس کی ملاقات سرِ راہ ہو گئی تھی۔ آصف علی کی زبانی منصور علی کو دلشاد کے حالات کا علم ہو گیا تھا اور اُس نے آصف علی کو بہلا پھسلا کر اس بات پر آمادہ کر لیا تھا کہ وہ ہر ماہ ایک مخصوص رقم سے اُن کی مالی مدد کر دیا کرے گا۔ منصور علی نے چالاکی یہ دکھائی تھی کہ آصف علی کو طلاق والی بات نہیں بتائی تھی بلکہ اس بات کی تصدیق کی تھی کہ ان کے درمیان وقتی علیحدگی ہوئی ہے۔

آصف علی اگرچہ ماں کا بہت وفادار تھا لیکن اُس نے منصور علی سے وعدہ کر لیا کہ وہ دلشاد بانو سے اس مالی مدد کا کوئی ذکر نہیں کرے گا۔ آصف علی اس مدد کو اپنا حق سمجھتا تھا بلکہ اُس کا خیال تو یہ تھا کہ دلشاد بانو کو اپنے اور اپنی اولاد کے حقوق کے لئے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانا چاہئے۔ منصور علی کی چال یہ تھی کہ ایک طرف تو وہ اپنے بچوں کی مالی مدد کرنا چاہتا تھا، دوسری جانب وہ یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ آصف کا رجحان اب بھی اس کی طرف ہے اور وہ تینوں بچے اسی کمائی سے پل رہے ہیں جسے مالِ حرام سمجھ کر دلشاد بانو نے فساد کا بیج بویا تھا۔ آصف علی گویا اپنی ماں کی توقعات پر پورا نہیں اترا تھا۔

یہ سلسلہ زیادہ عرصے تک دلشاد بانو سے چھپا نہ رہ سکا۔ ایک روز اُس نے آصف علی سے پوچھا۔ ''آصف! ایک بات پوچھوں، جھوٹ تو نہیں بولو گے؟''

''میں پہلے آپ سے کوئی جھوٹ بولتا ہوں جو اب بولوں گا؟''

''پہلے کی بات چھوڑو۔'' دلشاد بانو نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ ''مجھے پتہ چلا ہے کہ تم اپنے باپ سے ملتے رہتے ہو؟''

آصف علی کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ وہ نظریں چرانے لگا۔ دلشاد بانو نے اُسے کندھوں سے تھامتے ہوئے کہا۔ ''ادھر میری طرف دیکھو اور میرے سوال کا جواب

دو۔''

ایک لمحے کے تذبذب کے بعد آصف علی نے کہا۔ ''امی! اگر میرا جواب ''ہاں'' میں ہو تو؟''

''تو میں تم سے پوچھوں گی، کیوں۔ آخر کیوں؟''

''امی!'' آصف علی نے نرمی سے کہا۔ ''جس طرح ڈنڈا مارنے سے پانی نہیں بچھڑتا اسی طرح وقتی ناراضگی سے رشتے نہیں ٹوٹا کرتے۔''

''تم کہنا کیا چاہتے ہو؟''

''امی!...... منصور علی کرمانی ہمارے والد ہیں اور آپ کے شو......''

''خاموش ہو جاؤ۔'' دلشاد بانو نے آصف علی کو جھنجھوڑ ڈالا، پھر چیختے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''آئندہ یہ الفاظ اپنی زبان پر نہ لانا۔ سمجھے؟''

آصف علی ہکا بکا اپنی ماں کو تکنے لگا۔ پھر قدرے دھیمے لہجے میں بولا۔ ''امی، زبان سے کہہ دینے سے حقیقت تو نہیں بدل جاتی۔ میں تو کہتا ہوں، آپ ابو پر باقاعدہ مقدمہ کر دیں۔ اپنے حقوق کے لئے لڑیں امی۔ یہ دنیا شرافت سے جینے والوں کو کچل دیا کرتی ہے۔''

دلشاد بانو کا اندرون چیخ چیخ کر پکار رہا تھا کہ وہ بیٹے کو حقیقت سے آگاہ کر دے۔ منصور علی کرمانی ان کا باپ تو ہو سکتا تھا لیکن اس کا شوہر اب نہیں رہا تھا۔ آصف علی کی باتوں سے دلشاد بانو نے اندازہ لگا لیا تھا کہ منصور نے اسے طلاق والی بات نہیں بتائی تھی۔ اُسے ایک لمحے سکون بھی محسوس ہوا کہ اُس کی پیشانی کا داغ ابھی تک آصف علی کی نظر سے پوشیدہ تھا۔

دلشاد بانو نے کوشش کر کے خود کو سنبھال لیا اور پھر بیٹے سے پوچھا۔ ''تم وہاں کیوں جاتے ہو آصف؟''

''اپنا حق وصول کرنے۔'' آصف علی نے بڑی رسان سے جواب دیا۔

دلشاد بانو نے پوچھا۔ ''کون سا حق؟''

جواب میں آصف علی نے بالتفصیل اُسے بتا دیا کہ وہ ہر ماہ کی تین تاریخ کو ایک ہزار روپے کا چیک وصول کرنے منصور علی کرمانی کے دفتر جاتا تھا۔ اس انکشاف نے دلشاد بانو کے دل کو کرچی کرچی کر دیا کہ وہ جس مالِ حرام سے منہ موڑ کر اپنا سب کچھ گنوا بیٹھی تھی، اس نے اس کا پیچھا نہیں چھوڑا تھا بلکہ اس کے بیٹے کے توسط سے اس گھر تک بھی پہنچ گیا تھا۔ اس احساسِ شکست نے اُس کی رُوح کو گھائل کر دیا۔

دلشاد بانو نے بڑے ٹھنڈے انداز اور میٹھے لہجے میں آصف علی کو اس معاملے کی اُونچ نیچ

سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ ایک بات پر بضد رہا۔ اُس نے دلشاد بانو سے کہا۔
"امی! مجھے اس بات سے غرض نہیں کہ ابو کس طرح دولت کماتے ہیں۔ میں تو اتنا جانتا ہوں کہ ہمارا ان پر حق ہے۔ ان کا یہ فرض ہے کہ وہ ہماری کفالت کریں۔ اگر آپ نے اپنے حقوق کے لئے لڑنے سے توبہ کر لی ہے تو ہمیں نہ روکیں۔ آخر اس میں برائی ہی کیا ہے؟"

دلشاد بانو نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "بیٹا، میں نے تم تینوں کو رزقِ حرام سے بچانے کے لئے یہ سب کچھ کیا تھا۔ اب تم ہی میری مخالفت کر رہے ہو تو میں کیا کر سکتی ہوں۔ شاید میری تربیت میں کوئی فرق رہ گیا تھا۔"

وہ پوری رات دلشاد بانو نے روتے اور سوچتے ہوئے گزار دی۔ لیکن اُس کی سمجھ میں نہ آ سکا کہ اس کی تربیت میں کہاں اور کس جگہ کمی رہ گئی تھی۔ دوسرے روز اُس نے نادیہ کو ٹٹولنے کی کوشش کی تو وہ بھی آصف علی کی حامی تھی۔ چار سالہ واصف ابھی ان باتوں کی گہرائی کو نہیں سمجھتا تھا تاہم وہ بھی اپنے بہن بھائی کا ہم خیال نظر آتا تھا۔

دو چار روز تک گھر میں تناؤ کی سی کیفیت رہی۔ کافی سوچ بچار کے بعد دلشاد بانو نے فیصلہ کیا کہ بچوں کو زبردستی اپنی مرضی کا تابع نہیں بنائے گی۔ اُسے خدشہ محسوس ہونے لگا تھا کہ اگر اُس نے بہ جبر بچوں پر اپنی مرضی تھوپی تو وہ جواباً بغاوت بھی کر سکتے ہیں۔ اُس نے سوچا، اگر وہ تینوں اس سے ناراض ہو کر اپنے باپ کے پاس چلے گئے تو اس کا کیا ہوگا۔

اس خیال نے اُسے لرزا کر رکھ دیا۔ اُس نے درمیانی راہ پر چلنے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ نہ تو بچوں پر اتنی سختی کرے گی کہ وہ اس سے برگشتہ ہو کر اسے چھوڑ کر چلے جائیں...... اور نہ ہی اتنی نرمی برتے گی کہ وہ اُسے اپنی مرضی پر چلانے کی کوشش کریں۔

اسی رات اس نے آصف علی سے کہا۔ "ٹھیک ہے، تم اپنے باپ سے اپنا حق وصول کرتے رہو۔ لیکن وہ رقم صرف اور صرف تم تینوں پر خرچ ہوگی۔ میں اپنی گزر اوقات کے لئے خود ہی کچھ کروں گی۔"

"امی!...... آپ کو کچھ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔" آصف علی نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔ "ٹھیک ہے، آپ ابو سے ناراض ہیں۔ آپ لوگوں کے درمیان جو بھی اختلافات ہیں، ان کے پیش نظر آپ نہیں چاہتیں کہ ان کی دی ہوئی رقم آپ پر خرچ ہو تو میری تنخواہ بھی تو ہے۔ میں جب کما رہا ہوں تو پھر آپ کو فکرمند ہونے کی کیا ضرورت ہے؟"

دلشاد بانو نے بیٹے سے بحث کرنا مناسب نہ سمجھا اور دوسرے روز سے سلائی کڑھائی کے کام کے لئے ہاتھ پاؤں مارنا شروع کر دیئے۔ جلد ہی اُسے کام بھی ملنے لگا۔ وہ یہ سوچ

کر خود کو مطمئن کر لیتی تھی کہ اپنی محنت سے وہ خود کو پال رہی تھی۔ منصور علی کی دی ہوئی رقم اُس کی اولاد پر خرچ ہو رہی تھی۔ اُس نے جو سوچا تھا، وہ ہو نہیں سکا تھا اور جو ہو رہا تھا، اس کی مخالفت کرنے کی وہ پوزیشن میں نہیں تھی۔ وہ ایسا کوئی اختلافی قدم نہیں اٹھانا چاہتی تھی جس کے نتیجے میں وہ تنہا رہ جاتی۔

گزشتہ چار سال میں بہت کچھ بدل گیا تھا۔ آصف علی باقاعدہ ہر ماہ کی تین تاریخ کو ایک ہزار کا چیک لا رہا تھا لیکن اس دوران میں اُس نے اچھی خاصی ترقی کر لی تھی۔ گزشتہ دو سال سے وہ "چوہدری سوئٹس" میں کام کر رہا تھا۔ پہلے وہ سفری سیلز مین تھا پھر اُس کے کام اور ریکارڈ کو دیکھتے ہوئے اُسے ریکوری آفیسر کے عہدے پر ترقی دے دی گئی تھی۔ پہلے وہ سپلائی کے شعبے سے منسلک تھا اور وین پورے شہر میں چکراتا رہتا تھا۔ ریکوری آفیسر بننے کے بعد عباس چوہدری نے اُسے ہنڈا ففٹی موٹر سائیکل دلا دی تھی۔ اس کے ساتھ ہی اُس کی تنخواہ میں بھی اضافہ ہوا تھا۔ چوہدری سوئٹس کمپنی اس وقت اُسے ایک ہزار روپے تنخواہ دے رہی تھی۔ آج سے پچیس چھبیس سال قبل ایک ہزار روپے بھی بڑی اہمیت رکھتے تھے۔ ان دنوں دلشاد بانو کے گھر کا کرایہ تین سو ہو چکا تھا۔ سلائی کڑھائی سے ہر ماہ کم و بیش دو سو روپے کما لیتی تھی۔ اس نے اب حالات سے سمجھوتہ کر لیا تھا۔

اسی دوران میں منصور علی کرمانی نے بھی بہت "ترقی" کر لی تھی۔ اب وہ اس شہر کا ایک معروف و مصروف بلڈر تھا۔ وہ گلشن اقبال میں ایک شاندار بنگلے میں رہتا تھا۔ اس نے "کرمانی بلڈرز" کے نام سے ایک تعمیراتی ادارہ قائم کر لیا تھا۔ اس ادارے کا خوب صورت اور آراستہ و پیراستہ دفتر بہادر آباد میں تھا۔ وہ ان دنوں لاکھوں میں کھیل رہا تھا۔ کوئی ایک سال پہلے اُس نے اپنی خوب رو سیکرٹری صدف سے شادی بھی کر لی تھی۔

وقوعہ کے روز یعنی تین جون کو آصف علی حسب معمول امدادی رقم کا چیک لینے منصور علی کرمانی کے دفتر پہنچا۔ اس وقت وہ اپنی کمپنی کے کسی کام سے نکلا ہوا تھا۔ "کرمانی بلڈرز" کے دفتر میں اپنے باپ سے اُس کی کچھ تلخ کلامی ہوگئی اور وہ چیک کو پھاڑ کر وہیں پھینک گیا۔ کئی ماہ سے وہ منصور علی کرمانی سے چیک کی رقم بڑھانے کا مطالبہ کر رہا تھا لیکن منصور علی حیل و حجت سے کام لیتے ہوئے ہر ماہ ٹال جاتا تھا۔ وقوعہ کے روز منصور علی کے پس و پیش پر آصف علی برہم ہوگیا اور غصے سے اُٹھ کر دفتر سے نکل گیا۔ بعد ازاں جب وہ اپنی کمپنی "چوہدری سوئٹس" کے کام نمٹاتے ہوئے اپنے دفتر میں پہنچا تو وہاں پولیس اُس کی منتظر تھی۔ ٹھیک پانچ بجے اُسے گرفتار کر لیا گیا۔ اُس پر اپنے باپ منصور علی کرمانی کے قتل کا الزام تھا۔

آصف علی نے مجھے جو تفصیلات بتائی تھیں، ان میں کچھ باتیں ایسی تھیں جن کی وجہ سے مجھے یقین ہو گیا تھا کہ منصور علی کرمانی کا قتل آصف علی کے وہاں سے روانہ ہونے کے بعد ہوا تھا۔

نو جون کی شام خاور حسین میرے دفتر میں آیا اور میری مطلوبہ معلومات مجھے فراہم کر دیں۔ اس نے مجھے یقین دلایا کہ اگر ضرورت پڑی تو وہ صفائی کے گواہ کے طور پر عدالت میں بھی پیش ہو جائے گا۔ اس دوران میں، میں ''چوہدری سوئٹس'' کے مالک عباس چوہدری سے بھی تفصیلی ملاقات کر چکا تھا۔ اُس نے بھی ممکنہ تعاون کا وعدہ کیا تھا۔
میں کیس کی تیاری میں مصروف ہو گیا۔

✡......✡

پولیس نے حیرت انگیز تیزی کا مظاہرہ کرتے ہوئے گیارہ جون کو چالان عدالت میں پیش کر دیا۔ گواہوں کے بیانات کے علاوہ ملزم آصف علی کا نیم اقبالی بیان بھی موجود تھا۔ متعلقہ تھانہ انچارج شبیر احمد نے مجھے یہی بتایا تھا کہ اگر ملزم نے اقبالِ جرم کر لیا تو وہ ریمانڈ کی مدت پوری ہونے کے بعد چالان پیش کر دیں گے۔ کیس کی فائل کا مطالعہ کرنے کے بعد مجھے بخوبی اندازہ ہو گیا کہ استغاثہ خاصا مضبوط تھا۔

پولیس کی جانب سے جو استغاثہ دائر کیا گیا تھا وہ کئی صفحات پر مشتمل تھا۔ میں پولیس کے مؤقف کو مختصراً آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ استغاثہ کے مطابق ملزم آصف علی کچھ عرصے سے اپنے باپ کو دھمکیاں دے رہا تھا کہ اگر اُس نے چیک کی رقم میں اضافہ نہ کیا تو وہ اس پر مقدمہ دائر کر دے گا اور اسے عدالت میں گھسیٹ لے گا۔ وقوعہ کے روز بھی اسی بات پر ان کے درمیان جھگڑا بڑھ گیا۔ مذکورہ روز آصف علی چیک وصول کرنے مقتول کے دفتر پہنچا تو اس وقت مقتول اپنے منیجر یوسف فاروقی کے ساتھ اہم کاروباری معاملات پر گفتگو کر رہا تھا۔ منیجر کی موجودگی ہی میں مقتول نے ملزم کو چیک دیا۔ لیکن چیک میں درج رقم پر نظر ڈالتے ہی ملزم بھڑک اٹھا اور اپنا مطالبہ دہرانے لگا۔ اس کے ساتھ ہی وہ مقتول کو مقدمے بازی کی دھمکیاں بھی دینے لگا۔ جب بات خاصی بڑھ گئی تو مقتول نے اپنے منیجر کو کمرے سے باہر جانے کے لئے کہا۔ منیجر نے اپنے باس کے اشارے کی تعمیل کی اور باپ بیٹے کو کمرے میں تنہا چھوڑ دیا۔

تھوڑی دیر بعد ملزم آصف علی غصے میں بھرا ہوا کمرے سے باہر نکلا اور تیزی سے چلتے ہوئے دفتر سے روانہ ہو گیا۔ منیجر یوسف فاروقی، ملزم آصف علی کے جانے کے بعد اپنے

باس کے کمرے میں داخل ہوا تو ایک وحشت ناک منظر اُس کا منتظر تھا۔ مقتول منصور علی کرمانی اپنی میز پر سر ڈالے عجیب سے انداز میں پڑا تھا۔ اُس کی گردن پر کسی تیز دھار آلے سے وار کیا گیا تھا۔ زخم کے کٹاؤ سے نکلنے والا خون میز کی چکنی سطح پر بڑی تیزی سے پھیل رہا تھا۔ گردن کی دائیں جانب بری طرح لہولہان ہو رہی تھی۔

یہ منظر دیکھتے ہی منیجر یوسف فاروقی کے رونگٹے کھڑے ہو گئے، تاہم اُس نے اپنے حواس کو مجتمع کیا اور اپنے باس کے نزدیک پہنچ کر صورت حال کا جائزہ لینے لگا۔ مقتول منصور علی کرمانی کی میز پر اُس چیک کے پُرزے بکھرے ہوئے تھے جو وہ ملزم کو منیجر کے سامنے دے چکا تھا۔ میز کے دائیں کونے میں یوسف فاروقی کو وہ چھری بھی پڑی دکھائی دے گئی جس کی مدد سے مقتول کی گردن پر وار کیا گیا تھا۔ وہ کاغذ کاٹنے والی چھری یعنی پیپر نائف تھا اور اس کا پھل خون آلود تھا۔ ظاہر ہے، یہ خون مقتول منصور علی کرمانی کا ہی ہو سکتا تھا۔

پلک جھپکتے میں ساری صورتِ حال منیجر یوسف فاروقی کی سمجھ میں آ گئی۔ پیپر نائف دیگر اشیاء کے ساتھ ہی میز پر رکھا رہتا تھا۔ کسی بات پر برہم ہو کر ملزم نے وہ چھری اٹھا کر مقتول کا کام تمام کر دیا تھا۔ میز پر بکھرے ہوئے چیک کے پُرزے بھی اسی جانب اشارہ کرتے تھے کہ پہلے ملزم نے غصے میں وہ چیک پھاڑ کر پھینکا تھا۔ بعد ازاں طیش کے عالم میں اپنے باپ کو موت کے گھاٹ اتار کر فرار ہو گیا تھا۔

پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق مقتول منصور علی کرمانی کی موت تین جون، دن کے تین اور چار بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی۔ تیز دھار پیپر نائف سے اُس کی گردن پر جو وار کیا گیا تھا، اس میں مقتول کی شہ رگ کٹ گئی تھی اور کم وقت میں بہت زیادہ خون بہہ جانے کے باعث وہ موت سے ہم کنار ہو گیا تھا۔

آلہ قتل یعنی پیپر نائف کے کیمیائی تجزیے سے بھی یہ بات ثابت ہو گئی تھی کہ مقتول کو اسی چھری سے قتل کیا گیا تھا۔ علاوہ ازیں فنگر پرنٹس کی رپورٹ بھی خاصی دلچسپ تھی۔ مذکورہ چھری کے دستے پر تین افراد کے فنگر پرنٹس پائے گئے تھے۔ یعنی مقتول منصور علی کرمانی کی انگلیوں کے نشانات، ملزم آصف علی کی انگلیوں کے نشانات اور ایک تیسرے فرد کے نشانات کا بھی سراغ ملا تھا۔ تاہم ان تینوں افراد کے نشانات آپس میں خلط ملط ہو چکے تھے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے جلدی میں چھری کے دستے کو صاف کرنے کی کوشش کی گئی ہو اور یہ کوشش پوری طرح کامیاب نہ ہوئی ہو۔

اس کے علاوہ بھی بہت سی ٹیکنیکل باتیں رپورٹ میں درج تھیں جو قارئین سسپنس کے

لئے خالی از دلچسپی ہوں گی اس لئے میں ان کے ذکر سے پرہیز کرتے ہوئے براہِ راست عدالتی کارروائی کی طرف آتا ہوں۔

مقدمے کی ابتدائی کارروائی مکمل ہونے کے بعد عدالت نے ملزم پر فردِ جرم عائد کر دی۔ ملزم نے صحت جرم سے انکار کر دیا۔ اسی وقت میں نے ملزم کی درخواست ضمانت جج کے سامنے پیش کر دی۔

وکیل استغاثہ نے ضمانت کے خلاف دلائل دیتے ہوئے کہا۔''یور آنر! ملزم ایک خطرناک شخص ہے۔ پولیس کی تحویل میں وہ اقرارِ جرم کر چکا ہے لیکن عدالت میں وہ اپنے بیان سے منحرف ہو گیا ہے۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ وہ ایک دروغ گو اور چالاک آدمی ہے۔ اس لئے اس کی ضمانت پر رہائی انصاف اور قانون کے منافی ہو گی۔''

''جناب عالی!'' میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور اپنے مؤکل کی حمایت میں بولنا شروع کیا۔''لگتا ہے، میرے فاضل دوست پولیس کی تحویل میں دیئے گئے بیان کی حقیقت سے واقف نہیں ہیں اس لئے وہ میرے مؤکل کو دروغ گو اور چالاک آدمی سے تعبیر کر رہے ہیں۔'' ایک لمحے کے توقف سے میں نے اضافہ کیا۔''یور آنر، پولیس کسٹڈی میں میرے مؤکل کا نیم اقبالی بیان پولیس کا عظیم الشان ''کارنامہ'' ہے۔ پولیس کے مشہورِ زمانہ ''اختیارات'' سے کون واقف نہیں ہے۔ وہ اپنی طاقت کے استعمال سے ایک ہاتھی کو بھی یہ بیان دینے پر مجبور کر سکتی ہے کہ وہ ہاتھی نہیں بلکہ ایک ہرن ہے۔ محض اس بناء پر ملزم کی ضمانت کو روکنا کہ وہ پولیس کی تحویل میں اقبالی بیان دے چکا ہے، صریحاً انصاف کے تقاضوں کے منافی ہو گا۔''

وکیل استغاثہ نے کہا۔''یور آنر! بات صرف ملزم کے اقبالی بیان تک محدود نہیں ہے بلکہ آلہ قتل پر اس کی انگلیوں کے نشانات بھی پائے گئے ہیں۔ ان حالات کی روشنی میں ملزم کسی بھی طور ضمانت کا حق دار نہیں ہے۔''

میں نے کہا۔''جناب عالی! جیسا کہ میرے فاضل دوست نے معزز عدالت کو بتایا ہے کہ آلہ قتل پر ملزم کی اُنگلیوں کے نشانات بھی پائے گئے ہیں۔ ''بھی پائے گئے ہیں'' کا مطلب واضح طور پر یہی ہے کہ ملزم کے علاوہ بھی کسی کی انگلیوں کے نشانات کی موجودگی پائی گئی ہے۔ فنگر پرنٹس کی رپورٹ کے مطابق آلہ قتل یعنی پیپر نائف کے دستے پر تین افراد کی انگلیوں کے نشانات کا وجود پایا گیا ہے۔ اول مقتول منصور علی کرمانی، دوئم میرا مؤکل اور اس مقدمے کا ملزم آصف علی اور سوئم نا معلوم۔'' ایک لمحے کو رُک کر میں نے جج کی جانب

سوالیہ نظر سے دیکھا پھر اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے کہا۔''یور آنر! مقتول اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ موقع واردات پر پائی جانے والی مقتول کی لاش سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ مقتول نے خودکشی نہیں کی۔ آلہ قتل چونکہ مقتول کی میز کا ایک آئٹم تھا اس لئے وہ اکثر و بیشتر اس کے استعمال میں رہتا ہو گا لہٰذا اس کے دستے پر مقتول کی اُنگلیوں کے نشانات کا پایا جانا خالی از امکان نہیں ہے۔ جہاں تک میرے مؤکل کی اُنگلیوں کے نشانات کا تعلق ہے تو اس کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ اپنے باپ سے گفت وشنید کے دوران میں وہ غیر ارادی طور پر پیپر نائف سے کھیلتا رہا تھا اسی لئے اس کے دستے پر میرے مؤکل کی اُنگلیوں کے نشانات ثبت ہو گئے۔ بعد ازاں جب باپ بیٹے میں ترش کلامی بڑھ گئی تو میرے مؤکل نے باپ کا پیش کردہ چیک پھاڑ کر اُس کی میز پر پھینکا اور غصے میں وہاں سے روانہ ہو گیا۔''

میں نے تھوک نگل کر حلق تر کیا اور ضمانت کے حق میں دلائل کا سلسلہ دراز کرتے ہوئے کہا۔''جناب عالی! اگر استغاثہ محض آلہ قتل پر میرے مؤکل کی انگلیوں کے نشانات کی موجودگی کے سبب اسے ملزم ٹھہرا رہا ہے تو پھر وہ تیسرے شخص کی اُنگلیوں کے نشانات کو کیوں فراموش کر رہا ہے۔ یہ بھی تو ممکن ہے کہ قتل اسی شخص نے کیا ہو جس کی انگلیوں کے نشانات کا تجزیہ کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی گئی۔ پولیس کا یہ فرض بنتا تھا کہ وہ دفتر کے پورے عملے کے فنگر پرنٹس سے ان نشانات کا موازنہ کرتی لیکن ایسی کوئی کوشش نہیں کی گئی۔'' میں نے ایک لمحے کے توقف سے اضافہ کیا۔''یور آنر! میرے مؤکل کی گرفتاری بدنیتی پر مبنی ہے۔ پولیس کے پاس ملزم کی گرفتاری کا اس کے سوا اور کوئی جواز نہیں ہے کہ وقوعہ کے روز مقتول اور ملزم میں تلخ کلامی ہوئی تھی اور یہ کہ آلہ قتل پر میرے مؤکل کی اُنگلیوں کے نشانات پائے گئے ہیں۔ جناب عالی! آلہ قتل پر تو کسی تیسرے شخص کے فنگر پرنٹس بھی پائے گئے ہیں۔ پولیس نے ان فنگر پرنٹس پر تحقیق کرنے کی بجائے میرے مؤکل کو ہی کیوں گرفتار کر لیا؟''

اپنی بات ختم کرنے کے بعد میں نے فاتحانہ انداز میں وکیل استغاثہ کی جانب دیکھا۔ وکیل استغاثہ نے جج کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''یور آنر! گرفتاری کی بنیاد صرف اتنی سی نہیں ہے کہ آلہ قتل پر ملزم کی انگلیوں کے نشانات پائے گئے ہیں۔'' ایک لمحے کے توقف سے اُس نے اپنا بیان جاری رکھا۔''جناب عالی! مقتول کا منیجر یوسف فاروقی اس بات کا گواہ ہے کہ ملزم نے مقتول کو خطرناک نتائج کی دھمکیاں بھی دی تھیں۔ مقتول ایک صلح جو اور امن پسند شخص تھا۔ ملزم کے سوا آج تک اُس کی کسی سے معمولی نوک جھونک بھی نہیں ہوئی تھی یعنی مقتول کا اپنے بیٹے آصف علی کے سوا کسی

سے کوئی تنازع نہیں تھا۔ ملزم جب مقتول کے دفتر سے رخصت ہو گیا تو منیجر یوسف فاروقی نے اندر کمرے میں اپنے باس کو میز پر سر ٹکائے مردہ پایا۔ ایسی صورت میں منصور علی کرمانی کا قاتل ملزم کے سوا کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا۔''

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''جناب عالی! عدم علم سے عدم وجود لازم نہیں آتا۔'' ایک لمحے کو رُک کر میں نے تمسخرانہ انداز میں وکیل استغاثہ کو دیکھا، پھر روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے کہا۔ ''جناب عالی! میرے فاضل دوست کا اس بات پر زور کہ مقتول کا اپنے بیٹے یعنی میرے مؤکل کے سوا کسی سے کوئی تنازع نہیں تھا، عدم علمی کی نشان دہی کرتا ہے۔ میری معلومات کے مطابق مقتول کا منیجر یوسف فاروقی عرصہ دو سال سے مقتول کو جانتا ہے۔ اتنے عرصے میں کوئی شخص کسی دوسرے شخص کی زندگی کے ہر ہر پہلو سے واقفیت حاصل نہیں کر سکتا۔ پوری طرح اس کے دوستوں کا تعین کر سکتا ہے اور نہ دشمنوں کا۔ پھر جب کہ مقتول ایک ایسا شخص تھا جس نے بھانت بھانت کے لوگوں سے مل کر ہر سیاہ و سپید کام کیا تھا۔ اس راہ کے تمام مسافروں کو تو قدم قدم پر دشمنوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ایسے لوگوں کے بارے میں وثوق سے یہ کہا جائے کہ ان کا کسی سے کوئی لڑائی جھگڑا نہیں تھا، مبنی بر دروغ ہوگا۔ منیجر یوسف فاروقی نے کہا کہ میرے مؤکل کے سوا مقتول کا کسی سے کوئی تنازع نہیں تھا اور پولیس نے آنکھیں بند کر کے اس بیان پر یقین کر لیا۔ جرح کے دوران میں، میں پولیس کے مؤقف کا پول کھول دُوں گا۔ فی الحال معزز عدالت سے میری استدعا ہے کہ میرے مؤکل کی ضمانت منظور کی جائے۔''

جج نے وکیل استغاثہ کو مخاطب کرتے ہوئے سوال کیا۔ ''اب آپ کیا کہتے ہیں وکیل صاحب؟''

''جناب عالی! ملزم کی گرفتاری صرف اس بناء پر نہیں کی گئی کہ اس کی مقتول سے، وقوعہ کے روز تلخ کلامی ہو گئی تھی۔'' وکیل استغاثہ نے کہا۔ ''پولیس کو اور بھی بہت سے شواہد ملے ہیں۔''

''مثلاً؟'' جج نے اپنا چشمہ درست کرتے ہوئے استفسار کیا۔

وکیل استغاثہ نے جواب دیا۔ ''میں فی الحال ان شواہد کی تفصیل میں جانا مناسب نہیں سمجھتا۔ عدالتی کارروائی کے دوران میں مناسب موقع پر اس کا ذکر کروں گا۔ سر دست اتنا عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ملزم کئی مرتبہ مقتول کو مقدمے بازی کی دھمکی دے چکا تھا۔''

''کس قسم کی مقدمے بازی؟'' جج نے پوچھا۔

وکیل استغاثہ نے بتایا۔ ''جناب عالی! مقتول اور اس کی بیوی دلشاد بانو کے درمیان عرصہ چار سال سے علیحدگی چل رہی تھی۔ اس دوران میں مقتول خدا ترسی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے بچوں کے اخراجات کے لئے ہر ماہ ایک ہزار روپے کا چیک ملزم کو نہایت پابندی کے ساتھ دیتا رہا تھا لیکن پچھلے چند ماہ سے ملزم نے دھمکی آمیز انداز میں یہ مطالبہ کرنا شروع کر دیا تھا کہ یا تو چیک کی رقم کو دُگنا کر دیا جائے یا پھر وہ انہیں پانچ لاکھ روپے یک مشت ادا کر دے۔ بصورت دیگر وہ عدالت کا دروازہ کھٹکھٹائیں گے اور اسے وقت ڈال دیں گے۔''

وکیل استغاثہ نے اپنی بات ختم کی تو جج نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔ میں نے کہا۔ ''جناب عالی! میرے فاضل دوست نے معزز عدالت میں ابھی میرے مؤکل سے منسوب کر کے جو باتیں بیان کی ہیں کیا وہ ان کو ثابت بھی کر سکتے ہیں؟''

وکیل استغاثہ نے جواب دیا۔ ''مناسب موقع پر میں ثبوت فراہم کر دوں گا۔''

میرا مؤکل آصف علی مجھے بتا چکا تھا کہ وقوعہ کے روز تلخ کلامی صرف اس بات پر ہوئی تھی کہ وہ رقم میں اضافے کا مطالبہ کر رہا تھا۔ لیکن منصور علی کرمانی اس بات کے لئے تیار نہیں تھا۔ ازیں علاوہ مقدمے بازی کی بات ہوئی تھی اور نہ ہی پانچ لاکھ روپے یک مشت ادا کرنے کا اس نے کوئی مطالبہ کیا تھا۔

میں نے روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے متاثر کن لہجے میں کہا۔ ''یور آنر! مقتول اگر گزشتہ چار سال سے اپنے بچوں کی کفالت کے لئے مالی امداد کر رہا تھا تو یہ اُس کا فرض بنتا تھا۔ البتہ جہاں تک پانچ لاکھ روپے یک مشت کے مطالبے کا تعلق ہے یا مقدمے بازی کا معاملہ ہے اس میں کوئی حقیقت کا پہلو نظر نہیں آتا۔ میرے موکل نے صرف چیک کی رقم میں اضافے کا مطالبہ کیا تھا۔''

''آپ اپنی بات کو ثابت کر سکتے ہیں؟'' وکیل استغاثہ نے پوچھا۔

میں نے کہا۔ ''میرے فاضل دوست! میں آپ کی طرح یہ جواب نہیں دوں گا کہ میں مناسب موقع پر ثبوت فراہم کروں گا۔ کیونکہ میں موجودہ موقع کو سب سے زیادہ مناسب سمجھتا ہوں۔''

پھر میں نے جج کی طرف مُڑتے ہوئے کہا۔ ''جناب عالی! مقتول چار سال قبل اپنی بیوی یعنی میرے مؤکل کی والدہ دلشاد بانو کو طلاق دے چکا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ دلشاد بانو اپنے تینوں بچوں کو ساتھ لے کر مقتول کے گھر سے نکل گئی تھی۔ ایسی صورت میں مقدمے

بازی کا کیا سوال؟''

آصف علی نے حیرت زدہ نظروں سے پہلے مجھے اور اس کے بعد اپنی ماں کی جانب دیکھا۔ دلشاد بانو نے نظر جھکا دی۔

وکیل استغاثہ نے سوال اٹھایا۔ ''میرے فاضل دوست! کیا آپ وہ طلاق نامہ عدالت میں پیش کر سکتے ہیں؟''

''وہ طلاق زبانی ہوئی تھی۔'' میں نے کہا۔ ''اس سلسلے میں کوئی کاغذی کارروائی نہیں کی گئی تھی۔''

وکیل استغاثہ طنزیہ انداز میں مسکرایا پھر بولا۔ ''بیگ صاحب! آپ کو یہ تو معلوم ہو گا کہ عائلی قوانین کی رو سے زبانی طلاق کی کوئی بھی اہمیت نہیں ہوتی۔ یونین کونسل کی طرف سے اس کی توثیق نہایت ہی ضروری ہوتی ہے۔''

میں نے اُس کے طنز کو نظر انداز کر کے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''عائلی قوانین کی باریکیاں مجھے بخوبی معلوم ہیں لیکن اس دنیا میں ابھی تک ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو اللہ کے قوانین کو دنیاوی قوانین پر فوقیت دیتے ہیں۔ دلشاد بانو کا شمار بھی انہی لوگوں میں ہوتا ہے۔ اس کا ایمان ہے کہ مقتول منصور علی کرمانی نے اسے تین مرتبہ طلاق دی تو پھر طلاق ہو گئی۔ وہ اپنے شوہر سے جائز اور ناجائز کی جنگ لڑ رہی تھی اور وہ یہ جنگ ہار گئی۔ اس نے اپنے بچوں پر بھی یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ وہ ایک طلاق یافتہ عورت ہے۔ اس کی اولاد کو آج یہ بات معلوم ہوئی ہے۔ میرے مؤکل نے بارہا اپنی والدہ کو اپنے حقوق حاصل کرنے کے لئے اکسایا لیکن اس نے ہمیشہ اس کی مخالفت کی کیونکہ طلاق کے بعد، اس کے خیال میں وہ منصور علی کرمانی سے کوئی تعلق نہیں رکھتی تھی، اس کی کسی چیز پر دلشاد بانو کا کوئی حق نہیں تھا۔''

جج نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے سوال کیا۔ ''بیگ صاحب! آپ نے تھوڑی دیر پہلے جائز اور ناجائز کی جنگ کا ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ دلشاد بانو وہ جنگ ہار گئی تھی۔ اس سے آپ کا کیا مطلب تھا؟''

''جناب عالی!'' جج کی دلچسپی کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے میں نے وضاحت آمیز لہجے میں کہا۔ ''دلشاد بانو کو باوثوق ذرائع سے پتہ چل گیا تھا کہ اس کا شوہر منصور علی کرمانی کنسٹرکشن کے کام میں گھپلے بازی اور انتہائی بددیانتی سے کام لیتا تھا۔ دلشاد بانو کا موقف یہ تھا کہ اس انداز میں حاصل ہونے والی دولت سراسر مالِ حرام تھی اور وہ اپنے بچوں کی پرورش رزقِ

حلال سے کرنا چاہتی تھی۔ دلشاد بانو شوہر کو راہِ راست پر لانے کی جتنی کوشش کرتی، منصور علی کرمانی راہ خرابی پر اتنا ہی آگے بڑھ جاتا۔ پھر صبح و شام ان کے درمیان لڑائی جھگڑا ہونے لگا اور ایک روز بات اتنی بڑھ گئی کہ منصور علی کرمانی نے واشگاف الفاظ میں دلشاد بانو کو طلاق دے دی۔ دلشاد بانو جنگ ہار گئی۔''

میری بات ختم ہوئی تو وکیل استغاثہ نے چوٹ کی۔ ''دلشاد بانو جس مال کو حرام کمائی سمجھتی تھی، بعد ازاں وہ اسی رقم سے اپنے بچوں کا پیٹ پالتی رہی۔'' پھر وہ میری جانب دیکھتے ہوئے چبھتے ہوئے لہجے میں مستفسر ہوا۔ ''بیگ صاحب! آپ کا مؤکل آصف علی اپنے باپ مقتول آصف علی کرمانی سے ہر ماہ جو چیک وصول کرتا تھا اس کی ''صحت'' کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟''

''میرے فاضل دوست!'' میں نے معتدل لہجے میں جواب دیا۔ ''میں عرض کر چکا ہوں کہ میرے مؤکل کی والدہ اپنے شوہر مقتول منصور علی کرمانی سے جائز اور ناجائز کی جو جنگ لڑ رہی تھی، حالات کی ستم ظریفی نے اس جنگ میں اُسے شکست فاش سے ہمکنار کیا تھا۔ ایک طرف مقتول نے اُسے طلاق دے دی تھی تو دوسری جانب اُس کی اولاد نے عدمِ تعاون کا مظاہرہ کرتے ہوئے اُس کا سینہ چھلنی کر دیا تھا۔ وہ منصور علی کرمانی کی دی ہوئی رقم کو اپنے گھر میں استعمال کرنے کی روادار ہرگز نہیں تھی۔ لیکن آصف علی اس سے اختلاف کر رہا تھا۔ پھر جب چھوٹے دونوں بچوں کو بھی اُس نے بڑے بھائی کا ہمنوا پایا تو وہ مجبور ہو گئی۔ ایک مرحلے پر اُسے یہ اندیشہ لاحق ہو گیا کہ اگر اس نے بچوں پر زیادہ سختی کی تو ممکن ہے وہ بغاوت پر اتر آئیں اور اسے چھوڑ کر باپ کے پاس چلے جائیں۔ وہ اپنے بچوں کو کھونا نہیں چاہتی تھی اسی لئے یہ کڑوا گھونٹ پینے پر آمادہ ہو گئی۔ تاہم اپنی گزر بسر کے لئے اس نے سلائی کڑھائی کا کام شروع کر دیا۔ وہ منصور علی کرمانی کی دی ہوئی رقم کو اپنے لئے حرام تصور کرتی تھی۔''

میں نے بات ختم کر کے اپنے مؤکل آصف علی کی جانب دیکھا۔ اُس کی گردن جھکی ہوئی تھی۔ گردن کے جھکاؤ سے ندامت اور پشیمانی واضح طور پر جھلک رہی تھی۔

جج نے وکیل استغاثہ سے پوچھا۔ ''اب آپ کیا کہتے ہیں وکیل صاحب؟''

اُس نے پھر ضمانت کے خلاف دلائل دینا شروع کر دیئے۔ ''جناب عالی! ملزم ایک نہایت ہی خطرناک شخص ہے۔ یہ قتل کا کیس ہے۔ اگر وہ ہاتھ سے نکل گیا تو بڑے مسائل اُٹھ کھڑے ہوں گے۔''

میں نے کہا۔ ''جناب عالی! میرا مؤکل انتہائی شریف اور قانون پسند آدمی ہے۔ اگر ایک لمحے کے لئے یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ وہ اپنے باپ کے قتل میں ملوث ہے تو اس کا عمل اس کی تصدیق نہیں کرتا۔ وہ مقتول کے دفتر سے نکل کر حسب معمول اپنی کمپنی کے کام نمٹانے کے بعد اپنے دفتر پہنچا جہاں پہلے سے موجود پولیس نے اُسے حراست میں لے لیا۔ اگر واقعی میرے مؤکل نے اپنے باپ کو قتل کیا ہوتا تو اس کا خوفزدہ ہو جانا لازمی تھا۔ ایسی صورت میں وہ اپنی کمپنی کے دفتر جانے کی بجائے کہیں فرار ہونے کی کوشش کرتا۔ لیکن اس نے ایسا کچھ نہیں کیا۔''

''اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ملزم خاصا چالاک اور عیار انسان ہے۔'' وکیل استغاثہ نے اپنی کوشش جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''وہ اپنے رویئے سے یہ ظاہر نہیں ہونے دینا چاہتا تھا کہ وہ کتنا بڑا ''کارنامہ'' سرانجام دے چکا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''میرے مؤکل کا ماضی بے داغ اور ریکارڈ شفاف ہے۔ میرے فاضل دوست نے میرے مؤکل کی جس چالاکی اور عیاری کا ذکر کیا ہے وہ عادی مجرموں کے حصے میں آتی ہیں۔ میں معزز عدالت سے التماس کروں گا کہ وہ میرے مؤکل کو ضمانت پر رہا کرنے کے احکامات صادر کرے۔''

وکیل استغاثہ نے پھر وہی راگ الاپنا شروع کر دیا کہ ملزم انتہائی خطرناک شخص ہے، وغیرہ وغیرہ۔ جج چند لمحات تک اُس کی تقریر سنتا رہا پھر اُس سے پوچھا۔

''آپ پرانی باتوں کو ہی دہراتے رہیں گے یا کوئی نئی بات بھی کریں گے؟''

وہ بولا۔ ''جناب عالی! نئی بات تو جرح کے دوران ہی میں سامنے آئے گی۔ فی الحال تو میں یہ عرض کر رہا ہوں کہ یہ تین سو دو کا کیس ہے اور......''

''یہ بات آپ پہلے بھی بتا چکے ہیں۔'' جج نے قطع کلامی کرتے ہوئے سخت لہجے میں کہا، پھر مجھے مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔ ''بیگ صاحب! ضمانت کا کیا انتظام کیا ہے آپ نے؟''

چوہدری سوئٹس کا مالک عباس چوہدری اس وقت عدالت کے کمرے میں موجود تھا۔ میری معلومات کے مطابق وہ شخصی ضمانت دینے پر تیار ہو گیا تھا۔ وہ آصف علی کے کردار، اوصاف اور چال چلن سے مطمئن تھا۔

میں نے کہا۔ ''جناب عالی! شخصی ضمانت کا بندوبست کیا گیا ہے۔''

جج نے تھوڑی دیر بعد ملزم آصف علی کو پچاس ہزار روپے کی شخصی ضمانت پر رہا کرنے کا

حکم صادر کر دیا۔

ضمانت کی کاغذی کارروائی مکمل ہونے میں کچھ وقت لگ گیا۔ اس کے بعد آصف علی کی ہتھکڑی کھول دی گئی۔ اب وہ ضمانت پر آزاد تھا۔ تاہم اُسے یہ ہدایت کر دی گئی تھی کہ وہ متعلقہ تھانے میں اطلاع دیئے بغیر شہر سے باہر نہیں جائے گا۔

میں نے جج کو مخاطب کرتے ہوئے استدعا کی۔ ''جناب عالی! پولیس کو اس بات کے لئے پابند کیا جائے کہ وہ آلہ قتل پر پائے جانے والے تیسری قسم کے اُنگلیوں کے نشانات کا معمہ جلد از جلد حل کرے تا کہ کیس کی صورتِ حال مزید واضح ہو سکے۔''

جج نے انکوائری افسر سب انسپکٹر فرید خان کو ہدایت کی کہ وہ اس سلسلے میں ''کرمانی بلڈرز'' کے پورے اسٹاف کے فنگر پرنٹس حاصل کرے اور آلہ قتل پر پائے جانے والے نشانات سے ان کا موازنہ کرے۔

اس کے بعد جج نے آئندہ پیشی کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کر دی۔ اگلی پیشی پر باقاعدہ سماعت ہونا تھی اور استغاثہ کے گواہوں کو میری جرح کا سامنا کرنا تھا۔ تاریخ ڈیڑھ ماہ بعد کی تھی۔

ہم عدالت کے کمرے سے باہر آئے تو دلشاد بانو بہت خوش تھی۔ اُس نے تشکر آمیز لہجے میں کہا۔ ''بیگ صاحب! آپ نے تو کمال کر دیا۔ ایک ہی پیشی پر میرے بیٹے کو چھڑا لیا۔''

میں نے اُس کے ساتھ چلتے ہوئے وضاحتی لہجے میں کہا۔ ''خاتون! ابھی صرف آصف علی کی شخصی ضمانت ہوئی ہے۔ آپ اس آزادی کو اس کی رہائی نہ سمجھیں۔ مقدمہ تو بہرحال چلے گا۔ جب فیصلہ آصف علی کے حق میں نہیں ہو جاتا، اسے ہر پیشی پر باقاعدگی کے ساتھ عدالت میں حاضر ہونا پڑے گا۔''

وہ اطمینان بخش لہجے میں بولی۔ ''بیگ صاحب! آپ ضمانت کروانے میں کامیاب ہو گئے ہیں تو یہ بہت اچھا شگون ہے۔ اللہ کے حکم سے فتح بھی ہماری ہی ہو گی۔''

''ان شاء اللہ'' میں نے پُروثوق انداز میں کہا۔

وہ میرا شکریہ ادا کر کے فی الفور اپنے بیٹے کے ساتھ وہاں سے رخصت ہو گئی۔ میں پارکنگ میں کھڑی اپنی گاڑی کی جانب بڑھ گیا۔

۞......۞

میں نے جیسے ہی متعلقہ عدالت کے کمرے میں قدم رکھا، اسی وقت ہمارے کیس کی آواز پڑ گئی۔ تمام افراد اپنی جگہ پر موجود تھے۔ جج مقدمے کی فائل کا مطالعہ کر رہا تھا۔

استغاثہ کی جانب سے آٹھ گواہوں کی فہرست پیش کی گئی تھی۔ حاجی حبیب اللہ۔ یہ ایک کولڈ اسپاٹ چلاتا تھا اور جس گلی میں ”کرمانی بلڈرز“ کا دفتر واقع تھا اس گلی کے کونے پر اس کی دُکان تھی۔ دوسرا گواہ فاسٹ فوڈ ریسٹورنٹ کا ایک بیرا عبدالغنی تھا۔ مذکورہ ریسٹورنٹ اسی بلڈنگ کے نیچے واقع تھا جس میں ”کرمانی بلڈرز“ کا دفتر تھا۔ تیسرا گواہ مذکورہ بلڈنگ کا چوکی دار افسر خان تھا۔ چوتھا گواہ ”کرمانی بلڈرز“ کا چپراسی کلیم الدین، پانچواں گواہ اسی ادارے کا اکاؤنٹنٹ توصیف احمد، چھٹا گواہ مقتول کی بیوہ صدف، ساتواں گواہ مقتول کا منیجر یوسف فاروقی اور آٹھواں گواہ انکوائری افسر فرید خان تھا۔ پولیس نے آلہ قتل پر پائے جانے والے تیسرے فنگر پرنٹس کا سراغ لگا لیا تھا۔ وہ منیجر یوسف فاروقی کی انگلیوں کے نشانات تھے۔

عدالت کی کارروائی کا باقاعدہ آغاز ہوا اور جج نے پہلے گواہ مکہ کولڈ اسپاٹ کے مالک حاجی حبیب اللہ کو طلب کر لیا۔

لمحہ بھر کے بعد ایک باریش شخص گواہوں کے کٹہرے میں پہنچ گیا۔ وہ حاجی حبیب اللہ تھا۔ اُس نے سچ بولنے کا حلف اٹھانے کے بعد مختصر بیان دیا۔ اس کے مطابق وقوعہ کے روز ملزم اس کی دُکان کے سامنے سے نہایت ہی تیز رفتاری سے گزرا تھا اور وہ بہت غصے میں دکھائی دیتا تھا۔

حاجی حبیب اللہ ایک سیدھا سادہ اور شریف انسان نظر آتا تھا۔ اس کا بیان ختم ہوا تو وکیل استغاثہ جرح کے لئے آگے بڑھا۔

”حاجی صاحب!“ وکیل استغاثہ نے ملزم آصف علی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے حاجی حبیب اللہ سے پوچھا۔ ”کیا آپ نے اسی شخص کو وقوعہ کے روز اپنی دُکان کے سامنے سے غضب ناک انداز میں گزرتے ہوئے دیکھا تھا؟“

”جی ہاں، وہ یہی لڑکا تھا۔“

وکیل استغاثہ نے پوچھا۔ ”حاجی صاحب! کیا آپ معزز عدالت کو بتانا پسند کریں گے کہ یہ واقعہ کتنے بجے پیش آیا تھا؟“

”میرا خیال ہے، اس وقت پونے چار بجے تھے۔“ حاجی حبیب اللہ نے جواب دیا۔

وکیل استغاثہ نے اسی قسم کے دو چار مزید سوالات کئے، پھر اپنی جگہ پر جا کر بیٹھ گیا۔ اس کے بعد میں گواہ کے کٹہرے کے قریب آ کر کھڑا ہوا اور حاجی حبیب اللہ کو مخاطب کرتے ہوئے سوال کیا۔

”حاجی صاحب۔! ابھی تھوڑی دیر پہلے آپ نے وکیل استغاثہ کے ایک سوال کے جواب میں بتایا ہے کہ میرا مؤکل وقوعہ کے روز بڑے غضب ناک انداز میں آپ کی دُکان کے سامنے سے گزرا تھا۔“ اُس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ میں نے پوچھا۔ ”معزز عدالت میں آپ نے جو بیان دیا ہے اس میں آپ نے بتایا ہے کہ میرا مؤکل نہایت ہی تیز رفتاری سے آپ کی دُکان کے سامنے سے گزرا تھا۔ آپ کے بیان میں یہ تضاد کیوں ہے؟“

”آبجیکشن یور آنر!“ وکیل استغاثہ نے اعتراض جڑ دیا۔ ”معزز گواہ نے عدالت کو بیان دیتے ہوئے یہ بھی کہا تھا کہ ملزم اس وقت بہت غصے میں دکھائی دے رہا تھا۔ اگر کوئی شخص غصیلے انداز میں تیز رفتاری سے گزرے گا تو اسے غضب ناک انداز میں گزرنا ہی کہا جائے گا۔“

”تھینک یو مائی ڈیئر کونسلر۔“ میں نے وکیل استغاثہ کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اس وضاحت کے لئے میں آپ کا احسان مند ہوں۔“ پھر میں گواہ حاجی حبیب اللہ کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”حاجی صاحب! اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ میرا مؤکل آپ کی دُکان کے سامنے سے دوڑتے ہوئے گزرا تھا؟“

اُس نے نفی میں گردن ہلائی۔ میں نے پوچھا۔ ”پھر تیز رفتاری سے آپ کی کیا مراد ہے؟“

حاجی حبیب اللہ نے وضاحت کی۔ ”ملزم اس وقت ہنڈا ففٹی پر سوار تھا اور نہایت ہی خطرناک انداز میں موٹر سائیکل کو اڑائے لئے جا رہا تھا جیسے جہنم کی بلائیں اس کا پیچھا کر رہی ہوں۔“

”ہوں! جہنم کی بلائیں۔“ میں نے معنی خیز انداز میں دہرایا پھر حاجی حبیب اللہ سے سوال کیا۔ ”حاجی صاحب! آپ نے تھوڑی دیر پہلے معزز عدالت کو بتایا ہے کہ ملزم پونے چار بجے آپ کی دُکان کے سامنے سے گزرا تھا۔ کیا آپ نے اسی وقت گھڑی دیکھی تھی؟“

”اس وقت تو نہیں دیکھی تھی۔“ حاجی حبیب اللہ نے جواب دیا۔ ”لیکن پانچ منٹ کے بعد کسی شخص نے مجھ سے وقت دریافت کیا تو اس وقت میری گھڑی میں چار بجنے میں دس منٹ باقی تھے۔ اسی سے میں نے اندازہ لگایا کہ جب ملزم وہاں سے گزرا تو اس وقت کم و بیش پونے چار بجے ہوں گے۔“

”حاجی صاحب! ذرا سوچ کر بتائیں۔“ میں نے گواہ کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے

سوال کیا۔ ''ملزم نے اُس وقت کس قسم کا لباس پہن رکھا تھا؟''

حاجی حبیب اللہ نے جواب دیا۔ ''ملزم نے سیاہ پتلون پر سلیٹی رنگ کی شرٹ پہن رکھی تھی اور آنکھوں پر دُھوپ کا سیاہ چشمہ تھا۔''

''شکریہ حاجی صاحب!'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''ماشاء اللہ آپ کا مشاہدہ خاصا مضبوط ہے۔''

دوسرا گواہ فاسٹ فوڈ ریسٹورنٹ کا بیرا عبدالغنی تھا۔ اُس نے سچ بولنے کا حلف اُٹھانے کے بعد مختصر بیان ریکارڈ کروایا۔ وکیل استغاثہ نے دو چار سرسری سے سوالات پوچھے اور اپنی جگہ پر آ کر بیٹھ گیا۔ میں جج کی اجازت حاصل کرنے کے بعد گواہوں والے کٹہرے کے پاس آیا اور استغاثہ کے گواہ عبدالغنی پر اپنی جرح کا آغاز کیا۔

''عبدالغنی! تمہاری عمر کیا ہے؟''

اُس نے جواب دیا۔ ''بائیس سال۔''

''اس ریسٹورنٹ میں تم کتنے عرصے سے کام کر رہے ہو؟''

''چار سال سے۔''

میں نے پوچھا۔ ''اس دوران میں تمہارے ہاتھ سے اس ریسٹورنٹ کے کتنے برتن ٹوٹے ہیں؟''

وہ فخریہ لہجے میں بولا۔ ''صرف ایک پلیٹ۔''

''ویری گڈ۔'' میں نے توصیفی انداز میں کہا، پھر پوچھا۔ ''ذرا ذہن پر زور دو اور یاد کر کے بتاؤ کہ تم نے جو پلیٹ توڑی تھی اس پر کیا بنا ہوا تھا؟''

''وہ پلیٹ دراصل ایک گاہک کی غلطی سے ٹوٹی تھی۔'' وہ صفائی پیش کرتے ہوئے بولا۔ ''میں برتن اٹھا کر کچن کی جانب جا رہا تھا کہ مذکورہ گاہک کا دھکا مجھے لگا اور میرے ہاتھ سے پلیٹ چھوٹ کر فرش پر جا پڑی۔ وہ پلیٹ چونکہ میرے ہاتھ سے گری تھی اس لئے میں اسے اپنے ہی کھاتے میں ڈالوں گا۔''

میں نے اُس کی بیان کردہ تفصیل کو تحمل سے سنا اور کہا۔ ''ابھی تک تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا؟''

''اوہ، آئی ایم سوری۔'' وہ معذرت خواہانہ انداز میں بولا پھر بتایا۔ ''اس پلیٹ کے ایک کونے میں سرخ گلاب کا پھول پرنٹ تھا۔ اس کے ساتھ دو سبز رنگ کی پتیاں بھی تھیں۔''

''یہ کتنا عرصہ پہلے کی بات ہے؟''

''میرا خیال ہے، دو سال سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے۔''

''اس کا مطلب ہے تمہاری یادداشت خاصی توانا ہے۔''

''اللہ کے فضل سے۔'' وہ مسکرایا۔

میں نے پوچھا۔ ''عبدالغنی! تم نے پہلے پولیس کو اور بعد ازاں معزز عدالت میں بیان دیا ہے کہ وقوعہ کے روز تم نے ملزم آصف علی کو اپنے ریسٹورنٹ کے سامنے سے بڑی افراتفری کے عالم میں گزرتے ہوئے دیکھا تھا۔ اچھی طرح سوچ کر بتاؤ۔ اُس وقت ملزم نے کس قسم کے کپڑے پہن رکھے تھے؟''

اُس نے تامل کرتے ہوئے جواب دیا۔ ''ملزم اُس وقت سیاہ رنگ کی پتلون پہنے ہوئے تھا۔ شرٹ ہلکے نیلے رنگ کی تھی اور غالباً اُس نے دُھوپ کا چشمہ بھی لگا رکھا تھا۔''

''غالباً کیوں، یقیناً کیوں نہیں؟''

وہ بولا۔ ''غالباً اس لئے کہہ رہا ہوں کہ ممکن ہے وہ دُھوپ کا چشمہ نہ ہو، نظر کا چشمہ ہو۔ آج کل نظر کے چشمے بھی اس طرح کے آنے لگے ہیں کہ وہ دُھوپ ہی کے محسوس ہوتے ہیں۔''

میں نے پوچھا۔ ''عبدالغنی! کیا ملزم اس وقت وہاں سے پیدل ہی گزر رہا تھا؟''

''نہیں جناب۔'' اُس نے نفی میں دائیں بائیں گردن ہلائی۔ ''وہ ہنڈا ففٹی پر سوار تھا۔''

''اس وقت اُس کا موڈ کیسا تھا؟''

''خاصا برہم تھا۔''

''شکریہ مسٹر عبدالغنی۔'' میں نے کہا۔ پھر جج کی جانب دیکھتے ہوئے اضافہ کیا۔ ''مجھے اور کچھ نہیں پوچھنا جناب عالی۔''

حاجی حبیب اللہ اور عبدالغنی کے بیانات تقریباً ملتے جلتے تھے۔ میں ایک بات کی وضاحت کر دوں کہ عدالت کے کمرے میں، ایک وقت میں صرف ایک گواہ پر جرح کی جاتی ہے۔ اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ایک گواہ کے بیان سے دوسرے گواہ کا بیان متاثر نہ ہو۔ اس اصول کی سختی سے پابندی کی جاتی ہے۔ جج کے حکم پر استغاثہ کے تیسرے گواہ افسر خان کو عدالت کے کمرے میں بلایا گیا۔

افسر خان اس بلڈنگ کا چوکیدار تھا جس میں ''کرمانی بلڈرز'' کا دفتر واقع تھا۔ افسر خان کا بیان بھی سابق دو گواہان سے ملتا جلتا تھا۔ اُس نے خاصے غصے میں میرے مؤکل کو بلڈنگ سے نکلتے ہوئے دیکھا تھا۔ وکیل استغاثہ کے سوالات کے جواب میں افسر خان نے

جو کچھ بتایا اس کا خلاصہ یہ تھا کہ وہ ہر ماہ آصف علی کو وہاں آتے جاتے دیکھتا تھا۔ وہ آتے اور جاتے وقت افسر خان کے سلام کا جواب خوش اخلاقی سے دیتا تھا۔ وقوعہ کے روز بھی آمد کے وقت میرے مؤکل نے مسکرا کر افسر خان کے سوال کا جواب دیا تھا لیکن وقت رخصت اُس نے افسر خان کی جانب ایک نظر دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا تھا اور افسر خان کے پکارنے کے باوجود بھی وہ غصے میں وہاں سے نکل گیا تھا۔

اپنی باری پر میں نے افسر خان پر جرح کرتے ہوئے سوال کیا۔ ''افسر خان! تم نے بتایا ہے کہ ہر ماہ آتے جاتے ملزم آصف علی تم سے علیک سلیک کرتا تھا۔ کیا وہ ہر ماہ کسی مخصوص تاریخ کو آتا تھا یا کسی بھی وقت آ جاتا تھا؟''

افسر خان نے جواب دیا۔ ''خو وکیل صیب، یہ لڑکا مڑ کا ہر مہینے تین تاریخ کو ادھر آتا تھا۔''

''کیا تمہیں معلوم ہے کہ ملزم ایک خاص تاریخ کو وہاں کیا لینے آتا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں صیب، ام کو کچھ مالوم نئیں اے۔''

''افسر خان!'' میں نے اگلا سوال کیا۔ ''کیا تم جانتے ہو کہ میرا مؤکل مقتول منصور علی کرمانی کا بیٹا ہے؟''

''جی، ام جانتا ہے۔'' اُس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''ام کو یہ بات بوت پہلے سے مالوم اے۔''

''میں نے پوچھا۔ ''افسر خان، وقوعہ کے روز میرے مؤکل نے تمہارے سلام کا جواب نہیں دیا تھا۔ حتیٰ کہ تمہارے پکارنے پر بھی اُس نے مڑ کر تمہیں نہیں دیکھا تھا اور غصے میں وہاں سے چلا گیا تھا۔ کیا تم نے اس خفگی کی وجہ معلوم کرنے کی کوشش کی تھی؟''

''او جی، وکیل صیب! ام کو توڑی دیر کے لئے مالوم او گیا تا کہ بچہ لوگ نے اپنے والد صیب کو کتل متل کر دیا تا۔'' افسر خان نے جواب دیا۔

''تمہیں یہ بات کیسے معلوم ہوئی تھی؟'' میں نے اُس کے چہرے پر نگاہ گاڑتے ہوئے سوال کیا۔ ''کیا تم اوپر ''کرمانی بلڈرز'' کے دفتر میں گئے تھے؟''

افسر خان نے بتایا۔ ''ام اوپر کی طرف جا رہا تا تو راستے میں مینجر صیب نے ام کو بتایا تا۔''

''کیا بتایا تھا؟''

''خو یہی بتایا تا کہ آصپ علی نے اپنے والد صیب کو چھری سے قتل کر دیا اے۔''

میں نے ایک دو مزید سوالات کے بعد اپنی جرح ختم کر دی۔

افسر خان کے بعد ''کرمانی بلڈرز'' کا اکاؤنٹنٹ توصیف احمد اور چپراسی باری باری گواہی کے لئے پیش ہوئے۔ دونوں کے بیانات میں بہت زیادہ مماثلت پائی جاتی تھی۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ دونوں نے ایک ہی وقت میں میرے مؤکل کو اپنے باپ کے کمرے سے نکلتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ اس وقت شدید غصے میں تھا اور پاؤں پٹختا ہوا وہاں سے گیا تھا۔ چپراسی کلیم الدین، اکاؤنٹنٹ کے لئے سگریٹ کا پیکٹ خرید رہا تھا اور اکاؤنٹنٹ توصیف احمد اس وقت اپنے کیبن نما کمرے میں موجود تھا۔ مذکورہ کیبن نما کمرا مقتول منصور علی کرمانی کے کمرے سے ملحق تھا اور کوئی بھی شخص اُس کی نظر میں آئے بغیر باس کے کمرے میں آ جا نہیں سکتا تھا کیونکہ جس کھڑکی کے نزدیک توصیف احمد کی کرسی لگی ہوئی تھی اس کھڑکی سے باس کے کمرے کا دروازہ واضح طور پر دکھائی دیتا تھا۔

اکاؤنٹنٹ توصیف احمد اور چپراسی کلیم الدین سے اس کے سوا کوئی بات معلوم نہ ہو سکی کہ انہوں نے میرے مؤکل اور اس مقدمے کے ملزم آصف علی کو منصور علی کرمانی کے کمرے سے طیش کے عالم میں باہر نکلتے ہوئے دیکھا تھا۔ اور یہ کوئی قابل ذکر بات نہیں تھی۔

عدالتی کارروائی یہیں تک پہنچی تھی کہ عدالت کا وقت ختم ہو گیا۔ جج نے دو ماہ بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کرنے کا اعلان کر دیا۔

چوہدری سوئٹس کمپنی کا مالک عباس چوہدری اس روز بھی عدالت کے کمرے میں موجود تھا۔ ہم باہر آئے تو اُس نے مجھ سے پوچھا۔

''بیگ صاحب! کیا خیال ہے، اس کیس پر آپ کی گرفت کیسی ہے؟''

میں نے ٹھوس لہجے میں جواب دیا۔ ''بہت مضبوط۔''

''اس کا مطلب ہے، آصف علی کے باعزت رہا ہونے کے امکانات اچھے خاصے ہیں؟''

''نہایت ہی روشن امکانات ہیں۔''

وہ قدرے سنجیدہ لہجے میں بولا۔ ''بیگ صاحب! سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے ابھی تک اس کیس میں کوئی ہلچل نظر نہیں آئی۔''

''ایک دو پیشی کے بعد آپ کو ہلچل بھی نظر آئے گی اور ہلا گلا بھی۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''میرا کام کرنے کا اپنا ایک انداز ہے۔ آپ دیکھتے جائیں۔ ان شاء اللہ جلد

دُودھ کا دُودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔''

''اللہ آپ کی زبان مبارک کرے بیگ صاحب!'' آصف علی کی والدہ دلشاد بانو نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔''میں آپ کی اب تک کی کارکردگی سے بالکل مطمئن ہوں۔''

عباس چوہدری نے کہا۔'' آصف علی گزشتہ دو سال سے میرے پاس کام کر رہا ہے۔ اس کی شرافت اور ایمانداری کی تو میں قسم کھانے کو تیار ہوں۔ میری دُعا بلکہ کوشش یہی ہوگی کہ یہ جلد از جلد اس چکر سے نکل جائے۔''

''میں آصف علی کو اَیک ناکردہ جرم کے چکر سے نکالنے کے لئے ہی یہ دوڑ دھوپ کر رہا ہوں۔'' میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔''آپ بالکل بے فکر ہو جائیں۔ جو بھی ہو گا وہ ہمارے حق میں ہی ہوگا۔''

دلشاد بانو مجھے دُعائیں دیتے ہوئے آصف علی کے ساتھ رُخصت ہو گئی۔ عباس چوہدری کچھ دیر تک مجھ سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا، پھر مجھ سے بھرپور مصافحہ کر کے اپنی گاڑی کی جانب بڑھ گیا۔

✡......✡
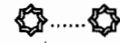
منظر اسی عدالت کا تھا اور گواہوں کے کٹہرے میں مقتول منصور علی کرمانی کی بیوہ مسز صدف کرمانی کھڑی تھی۔ اُس کی عدت کی مدت پوری ہو چکی تھی لیکن اُس کے حلیے اور ٹپ ٹاپ کو دیکھ کر کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ چند ماہ قبل اس کے شوہر کو قتل کر دیا گیا تھا۔

اللہ نے صدف کو اچھا خاصا حسین بنایا تھا لیکن اُس نے اپنے چہرے پر گہرا میک اپ تھوپ رکھا تھا۔ اُس کی عمر زیادہ سے زیادہ بائیس سال رہی ہوگی۔ اُس نے نہایت ہی قیمتی زرق برق لباس زیب تن کر رکھا تھا۔ جسم پر زیورات کی بھی بہتات تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ عدالت میں گواہی دینے نہیں بلکہ کسی مقابلہ حسن میں شرکت کرنے آئی ہو۔

صدف نے سچ بولنے کا حلف اُٹھانے کے بعد اپنا بیان ریکارڈ کروایا۔ وکیل استغاثہ کی جرح کا لب لباب یہ تھا کہ مقتول اکثر گھر میں آصف علی کے ناجائز مطالبات کا ذکر کرتا رہتا تھا۔ صدف نے اس بات کی تصدیق کی کہ اس کا مقتول شوہر اُسے ملزم کی دھمکیوں کے بارے میں اکثر بتاتا رہتا تھا اور اس وجہ سے خاصا پریشان بھی رہتا تھا۔ ظاہر ہے، صدف نے جو بیان دیا تھا اور وکیل استغاثہ کے سوالوں کے جواب میں جو کچھ بتایا تھا وہ ایک رٹا رٹایا سبق تھا۔

میں جج کی اجازت سے اپنی باری پر جرح کے لئے اٹھا اور مسز کرمانی کو مخاطب کرتے

ہوئے کہا۔''مسز کرمانی! کوئی بھی سوال پوچھنے سے پہلے میں آپ کے شوہر کی ناگہانی موت پر دلی افسوس کا اظہار کروں گا۔ مجھے اس سانحے سے واقعی دُکھ پہنچا ہے۔''

''تھینک یو وکیل صاحب۔'' اُس نے خاصی کراری آواز میں میرا شکریہ ادا کیا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے شوبز سے متعلق کوئی خاتون انٹرویو دیتے ہوئے اختیار کرتی ہے۔

میں نے جرح کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔''مسز کرمانی! مقتول منصور علی کرمانی سے آپ کی شادی کو کتنا عرصہ ہوا تھا؟''

''کم و بیش ایک سال۔''

''مجھے پتہ چلا ہے کہ اس سے پہلے آپ مقتول کے دفتر ہی میں کام کرتی تھیں؟'' میں نے سوال کیا۔

نے جواب دیا۔''آپ کی معلومات درست ہیں۔''

''یہ۔'' میں نے زیرلب مسکراتے ہوئے کہا اور پوچھا۔''کیا یہ بھی درست ہے کہ مقتول پ کو پسند کرنے لگا تھا اور شادی کے لئے آپ کے پیچھے پڑ گیا تھا؟'' میں نے خاور حسین کی فراہم کردہ معلومات کی روشنی میں سلسلہ سوالات کو آگے بڑھایا۔

وکیل استغاثہ فوراً بول اُٹھا۔''مجھے سخت اعتراض ہے جناب عالی! وکیل صفائی گواہ کی نجی زندگی کو زیر بحث لا رہے ہیں۔ اس بات کا زیر ساعت کیس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔''

''بظاہر تو واقعی کوئی تعلق نہیں ہے۔'' میں نے وکیل استغاثہ کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ ''لیکن ممکن ہے، آگے چل کر کوئی گہرا تعلق بھی نکل آئے۔'' ایک لمحے کو رُک کر میں نے کٹہرے میں کھڑی ہوئی صدف کی جانب دیکھا اور کہا۔''اگر آپ کو کوئی اعتراض ہو تو میں اس موضوع کو موقوف کر دیتا ہوں۔''

وہ فراخ دلی سے مسکرائی اور بولی۔''آپ اپنی جرح جاری رکھیں وکیل صاحب۔''

میں نے فاتحانہ نظر سے وکیل استغاثہ کو دیکھا۔ اُس کے چہرے پر برہمی کے آثار واضح طور پر دکھائی دے رہے تھے۔ اُسے اپنے گواہ کا رویہ سخت ناگوار گزر رہا تھا۔ میں دوبارہ گواہ کی جانب متوجہ ہو گیا۔

''صدف صاحبہ! آپ نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا؟''

وہ بولی۔''ہم دونوں ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے تھے۔''

میں نے پوچھا۔''آپ ''کرمانی بلڈرز'' میں کتنے عرصے کام کرتی رہی تھیں؟''

وہ تھوڑی دیر سوچنے کے بعد بولی۔''تقریباً نصف سال۔''

''کیا یہ سچ ہے کہ ''کرمانی بلڈرز'' میں آپ کو یوسف فاروقی نے ملازمت دلوائی تھی؟''
میں نے سوال کیا۔

''جی ہاں، یہ سچ ہے۔''

میں نے پوچھا۔''کیا یہ بھی درست ہے کہ یوسف فاروقی آپ کے کزن ہیں؟''

''بالکل درست ہے۔'' وہ پُراعتماد لہجے میں بولی۔

''میں نے سنا ہے، کبھی وہ آپ کے منگیتر بھی رہ چکے ہیں۔'' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

''آں...... ہاں......نن......نہیں۔'' وہ گڑبڑا گئی اور امداد طلب نظر سے وکیل استغاثہ کو دیکھنے لگی۔

میں نے قدرے سخت لہجے میں پوچھا۔''آپ کا جواب تصدیق اور تردید کا آمیزہ ہے۔ میں اس سے کیا مطلب اخذ کروں؟''

جج نے تنبیہی لہجے میں کہا۔''بی بی! وکیل صاحب کے سوال کا ''ہاں'' یا ''نہ'' میں جواب دو۔''

صدف قدرے سنبھلے ہوئے لہجے میں بولی۔''آپ نے بالکل غلط سنا ہے۔ یوسف فاروقی میرے کزن ضرور ہیں لیکن ہماری منگنی کبھی نہیں ہوئی تھی۔''

میں نے سوالات کے زاویئے کو تبدیل کرتے ہوئے پوچھا۔''صدف صاحبہ! آپ نے اپنے بیان میں اس بات کا خاص طور پر ذکر کیا ہے کہ آپ کے مقتول شوہر میرے مؤکل کی دھمکیوں سے اکثر پریشان رہتے تھے۔ کیا آپ اس عدالت کو بتائیں گی کہ ملزم آپ کے شوہر کو کس قسم کی دھمکیاں دیتا تھا؟''

''وہ اپنی والدہ کی طرف سے مقدمہ کرنے کی دھمکیاں دیتا تھا۔'' صدف نے پھنسی ہوئی آواز میں جواب دیا۔''اور ہر ماہ چیک کی رقم کو بڑھانے کا مطالبہ کرتا رہتا تھا۔''

میں نے پوچھا۔''کیا آپ کو یہ بات معلوم نہیں تھی کہ مقتول اپنی پہلی بیوی یعنی ملزم کی والدہ دلشاد بانو کو طلاق دے چکا ہے؟''

''یہ بات میرے علم میں نہیں تھی۔''

''مقتول نے آپ کو کیا بتا رکھا تھا؟''

صدف نے جواب دیا۔''انہوں نے مجھے علیحدگی کے بارے میں بتایا تھا۔''

میں نے اپنی جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔''صدف صاحبہ! آپ نے

کہاں تک تعلیم حاصل کر رکھی ہے؟''

''میں گریجویٹ ہوں۔''

''ماشاء اللہ۔'' میں نے توصیفی انداز میں کہا، پھر پوچھا۔''شادی کے وقت یا بعد میں آپ نے نکاح نامے کے مندرجات کا مطالعہ تو کیا ہوگا؟''

اُس نے اثبات میں جواب دیا۔

میں نے سوال کیا۔''نکاح نامے کے کالم نمبر اکیس کے سامنے خالی جگہ پر کیا لکھا گیا تھا؟''

وہ ذہن پر زور دیتے ہوئے بولی۔''مجھے یاد نہیں آ رہا، یہ کس قسم کا کالم تھا۔''

''میں آپ کو یاد دلاتا ہوں۔'' میں نے تعاون آمیز لہجے میں کہا۔ پھر بتایا۔''اس کالم میں بتایا جاتا ہے کہ آیا یہ شادی دولہا کی پہلی شادی ہے یا......''

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ وہ جلدی سے بولی۔''ہاں، مجھے یاد آ گیا ہے۔ اس کالم میں ''عقد ثانی'' کا اندراج کیا گیا تھا۔''

''بہت خوب۔'' میں نے سراہنے والے انداز میں کہا پھر نکاح نامے کے مذکورہ کالم کی تفصیل سے اُسے آگاہ کرنے لگا۔''صدف صاحبہ! نکاح نامے کے کالم نمبر اکیس میں واضح طور پر تحریر ہے کہ آیا دولہا کے یہاں پہلے سے کوئی بیوی موجود ہے؟ اگر ہے تو کیا اُس نے دوسری شادی کے لئے مسلم عائلی قوانین کے آرڈی ننس مجریہ انیس سو اکسٹھ عیسوی کے تحت ثالثی کونسل سے عقد ثانی کا اجازت نامہ حاصل کر لیا ہے؟'' ایک لمحے کو رُک کر میں نے صدف کی آنکھوں میں جھانکا پھر سوال کیا۔''کیا آپ کے مقتول شوہر نے اس قسم کا کوئی اجازت نامہ حاصل کیا تھا؟''

''مجھے اس بارے میں کچھ معلوم نہیں ہے۔'' وہ پریشان نظر آنے لگی۔

میں نے پوچھا۔''نکاح خواں نے کوئی اعتراض نہیں کیا تھا؟''

دلشاد بانو سے مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ اس قسم کا اجازت نامہ حاصل نہیں کیا گیا تھا پھر اس کے خیالات کے مطابق تو وہ مطلقہ تھی۔ لہٰذا ایسے کسی اجازت نامے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی تھی۔ میں نے صدف کو اُلجھانے کے لئے اس قسم کے سوالات کئے تھے تاکہ گھبراہٹ میں اُس کے منہ سے کوئی ایسی بات نکل جائے جو بعد ازاں میرے لئے مفید ہو۔

میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے صدف نے بتایا۔''نکاح خواں کا انتظام یوسف فاروقی نے کیا تھا۔ البتہ میرے نکاح نامے کے کالم نمبر اکیس میں ایسی کوئی تحریر رقم نہیں کی

گئی جس سے ظاہر ہو کہ ایسا کوئی اجازت نامہ حاصل کیا گیا تھا۔''

''اس کا واضح مطلب یہی ہے کہ اجازت نامہ حاصل نہیں کیا گیا تھا۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''اور اس کی وجہ یہ ہے کہ مقتول اپنی پہلی بیوی کو طلاق دے چکا تھا۔ تاہم کالم نمبر ا کیس میں اگر ''عقد ثانی'' لکھا گیا تھا تو اس کی تفصیل درج کرنا ضروری تھا جو بوجہ نہیں کی گئی۔ ان حالات و واقعات کی روشنی میں ایک بات یہ بھی سامنے آتی ہے کہ مقتول ملزم کی وجہ سے کسی بھی طرح خوف زدہ نہیں تھا اور نہ ہی اس کے پریشان ہونے کی کوئی وجہ سمجھ میں آتی ہے۔''

وکیل استغاثہ نے مداخلت ضروری سمجھی۔ ''میرے فاضل دوست! آپ کس طرح کہتے ہیں کہ مقتول، ملزم کے مطالبات اور دھمکیوں سے پریشان نہیں تھا؟''

''میں یہ بات اس طرح کہتا ہوں کہ مقتول اپنی بیوی کو طلاق دے چکا تھا۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اس لئے اُسے دلشاد بانو کی جانب سے کسی قسم کی مقدمے بازی سے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔''

وکیل استغاثہ نے اپنی ذہانت کا ثبوت دیتے ہوئے مجھ پر چوٹ کی۔ ''میرے فاضل دوست! آپ ایک بات بھول رہے ہیں۔ زبانی کلامی طلاق کی کوئی قانونی حیثیت نہیں ہوتی۔ دلشاد بانو مقدمے بازی کی پوزیشن میں تھی۔''

''یاد دہانی کا بہت بہت شکریہ۔'' میں نے مصنوعی تشکرانہ لہجے میں کہا۔ ''حالانکہ میں یہ نکتہ ہرگز نہیں بھولا تھا۔'' ایک لمحے کو رُک کر میں نے اضافہ کیا۔ ''میرے فاضل دوست، ابھی آپ نے ایک اہم نکتے کی جانب میری توجہ مبذول کرا کے مجھ پر جو احسانِ عظیم کیا ہے، میں وہ احسان کھڑے کھڑے اتار دینا چاہتا ہوں۔ فار یور کائنڈ انفارمیشن مائی ڈیئر کونسلر! اگر زبانی کلامی طلاق کی کوئی قانونی حیثیت نہیں ہے تو پھر اس کا واضح مطلب یہی ہوا کہ دلشاد بانو قانون کی نظر میں ہنوز مقتول کے نکاح میں ہے۔ بلکہ اب وہ اس کی بیوہ ہے۔ ایسی صورت میں پہلی بیوی کی اجازت کے بغیر مقتول کی صدف صاحبہ سے شادی قانونی زبان مین کالعدم قرار پائے گی۔ آپ کا اس سلسلے میں کیا خیال ہے؟''

وہ خفت آمیز انداز میں بغلیں جھانکنے لگا۔

میں نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔ ''میرے فاضل دوست! آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا؟''

جج پوری دلچسپی سے میری جرح سن رہا تھا۔ وکیل استغاثہ نے سنبھالا دیتے ہوئے کہا۔

''میرا خیال ہے، ہم اصل موضوع سے خاصے ہٹ گئے ہیں۔ اس عدالت میں منصور علی کرمانی مرڈر کیس زیرِ سماعت ہے۔''

''شکریہ میرے فاضل دوست۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ پھر کٹہرے میں کھڑی استغاثہ کی گواہ صدف کرمانی کی جانب متوجہ ہو گیا۔

''مسز کرمانی!'' میں نے اُسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''منصور علی کرمانی کی وفات کے بعد اس کی منقولہ و غیر منقولہ جائیداد کی آپ ہی وارث ہیں۔''

وہ جلدی سے بولی۔ ''اس میں کیا شک ہے۔ پہلی بیوی کو تو وہ طلاق دے چکے تھے۔''

''زبانی کلامی۔'' میں نے گہری چوٹ کی۔ پھر وکیل استغاثہ کی طرف دیکھا۔

صدف نے کہا۔ ''میں زبانی کلامی اور تحریری طلاق کے جھگڑے میں نہیں پڑنا چاہتی۔'' ایک لمحے کے وقفے سے اُس نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''گلشن اقبال والا بنگلہ اور گاڑی میرے نام ہے۔ ''کرمانی بلڈرز'' کے کاروبار میں، میں انچاس فی صد کی حصے دار ہوں۔ اس سلسلے میں تمام قانونی دستاویزات مکمل ہیں۔ ہاں، اگر منصور علی کے ''کرمانی بلڈرز'' والے اکیاون فی صد کاروبار میں سے کوئی شخص حصے کا طلب گار یا دعوے دار ہے تو اُسے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانا چاہئے۔ مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔''

اُس چالاک عورت نے نہایت ہی مہارت کے ساتھ مقتول کی بیشتر دولت و جائیداد پر پکا قانونی قبضہ جما رکھا تھا۔ میں نے کھنکھار کر گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔

''صدف صاحبہ! میرے مؤکل کی والدہ مقتول کی جانب سے ایک کوڑی کی طلب گار بھی نہیں ہے اور نہ ہی وہ توقع کرتی ہے کہ اُسے کچھ دلایا جائے۔ اُس کی دانست میں مقتول کی دولت و جائیداد پر اس کا کوئی حق نہیں بنتا۔ البتہ مقتول کے بچوں کو بہرحال ''کرمانی بلڈرز'' کے اکیاون فی صد کاروبار میں سے حصہ ضرور ملنا چاہئے۔''

وکیل استغاثہ نے موقع تاک کر چوٹ کی۔ ''کوئی بھی قاتل کسی قسم کی جائیداد میں حصے دار نہیں ہو سکتا۔''

میں نے حیرت سے اُس کی جانب دیکھا اور پوچھا۔ ''کیا یہ ثابت ہو چکا ہے کہ قتل میرے مؤکل ہی نے کیا ہے؟''

''یہ بھی ثابت ہو ہی جائے گا۔'' وہ بے پروائی سے بولا۔

میں نے کہا۔ ''جب تک کسی شخص پر جرم ثابت نہیں ہو جاتا، وہ ملزم کہلاتا ہے۔ میرے مؤکل کو قبل از وقت قاتل کہنا خلافِ قانون ہے۔ میں اس سلسلے میں معزز عدالت سے

پُرزور احتجاج کرتا ہوں۔''

جج نے میرے احتجاج کو سنجیدگی سے نوٹ کرتے ہوئے وکیل استغاثہ کو سرزنش کی۔ پھر مجھے مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔ ''بیگ صاحب! آپ گواہ سے کوئی اور سوال کریں گے؟''

''نہیں جناب عالی۔'' میں نے مؤدبانہ انداز میں کہا۔ ''میں محترمہ صدف کرمانی پر اپنی جرح مکمل کر چکا ہوں۔''

اس کے ساتھ ہی عدالت کا وقت ختم ہو گیا۔ آج خاصی تاخیر سے ہمارے کیس کی باری آئی تھی اس لئے زیادہ وقت نہیں مل سکا تھا۔

جج نے پندرہ روز بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کر دی۔

✡......✡
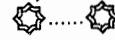
آئندہ پیشی پر مقتول کا منیجر یوسف فاروقی گواہی دینے کے لئے کٹہرے میں آیا۔ وہ لگ بھگ تیس سال کا ایک فربہ اندام شخص تھا۔ اُس نے سچ بولنے کا حلف اٹھانے کے بعد عدالت کے روبرو وہی بیان دیا جو وہ اس سے پہلے پولیس کو دے چکا تھا۔ اس کا بیان ریکارڈ ہو چکا تو وکیل استغاثہ نے اس سے چند سرسری سے سوال کئے۔ اس کے بعد میری باری آئی۔

میں نے اُس کے کٹہرے کے نزدیک جا کر سوالات کا سلسلہ شروع کیا۔ ''فاروقی صاحب! پولیس کی تحقیق اور فنگر پرنٹس کی تازہ ترین رپورٹ سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ آلۂ قتل پر پائے جانے والے تیسری قسم کے نشانات آپ کی انگلیوں کے ہیں۔ اس بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟''

وہ سرسری سے لہجے میں بولا۔ ''یہ کوئی اتنی اہم بات نہیں ہے۔ کاغذ کاٹنے والی چھری عام استعمال کی چیز تھی۔ جو بھی اس سے کاغذ کاٹے گا، اُس کی اُنگلیوں کے نشانات اس کے دستے پر ثبت ہو جائیں گے۔''

میں نے کہا۔ ''آلۂ قتل یعنی پیپر نائف عام استعمال کی چیز تو تھی لیکن اس کے دستے پر خاص افراد کی اُنگلیوں کے نشانات پائے گئے ہیں، یعنی مقتول منصور علی کرمانی، میرا مؤکل آصف علی اور آپ......''

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ یوسف فاروقی نے جلدی سے کہا۔ ''آپ کہنا کیا چاہ رہے ہیں؟''

''میں یہ بتانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ مقتول منصور علی کرمانی کا قتل ایک سوچی سمجھی

پلاننگ کے تحت کیا گیا ہے۔'' میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''مقتول کے علاوہ آلۂ قتل پر میرے مؤکل اور آپ کی اُنگلیوں کے نشانات پائے گئے ہیں۔ لیکن صرف میرے مؤکل کی گرفتاری عمل میں آئی ہے۔ آپ آزاد پھر رہے ہیں، ایسا کیوں؟''

''یہ تو آپ پولیس والوں سے پوچھیں۔'' وہ ایک دم بھڑک اُٹھا۔

میں نے کہا۔ ''پولیس والوں سے بھی پوچھا جائے گا۔'' ایک لمحہ توقف کر کے میں نے جرح کا سلسلہ جاری رکھا اور پوچھا۔ ''فاروقی صاحب! فی الحال آپ یہ بتائیں کہ وقوعہ کے روز ملزم آصف علی کتنے بجے ''کرمانی بلڈرز'' کے دفتر میں پہنچا تھا؟''

اُس نے جواب دیا۔ ''سوا تین بجے۔''

''اُس وقت آپ مقتول کے پاس ہی بیٹھے ہوئے تھے؟''

''جی ہاں۔'' اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''ہمارے درمیان نہایت ہی اہم کاروباری امور پر بات چیت ہو رہی تھی۔''

میں نے پوچھا۔ ''اس وقت آپ مقتول کے دفتر کے کس حصے میں بیٹھے ہوئے تھے؟''

''منصور صاحب کی میز کے سامنے تین کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔'' فاروقی نے جواب دیا۔ ''میں اُن ہی میں سے ایک پر بیٹھا ہوا تھا۔''

''کون سی کرسی پر؟''

''جو میز کے بائیں کونے پر رکھی ہوئی تھی۔''

میں نے پوچھا۔ ''بائیں کونے سے آپ کی مراد ہے میز کا وہ سرا جو کمرے کی مشرقی دیوار کی جانب ہے؟''

''بالکل۔ میری یہی مراد ہے۔''

''ملزم کس کرسی پر آ کر بیٹھا تھا؟''

''میرے دائیں ہاتھ والی آخری کرسی پر۔'' فاروقی نے ہاتھ کے اشارے سے جواب دیا۔

میں نے پوچھا۔ ''دائیں ہاتھ والی آخری کرسی سے آپ کی مراد کہیں وہ کرسی تو نہیں جو میز کے دائیں کونے کے پاس کمرے کی مغربی دیوار کی سمت رکھی ہوئی تھی؟''

''جناب، آپ کیا گھما پھرا کر ایک ہی بات پوچھ رہے ہیں۔'' یوسف فاروقی نے زچ ہوتے ہوئے کہا۔ ''سیدھی سی بات یہ ہے کہ منصور علی صاحب کی میز کے سامنے تین کرسیاں موجود تھیں۔ سیدھے ہاتھ والی کرسی پر ملزم آ کر بیٹھا تھا اور اُلٹے ہاتھ والی کرسی پر میں پہلے

سے موجود تھا۔ درمیان میں ایک کرسی خالی تھی......اور کچھ؟‘‘

’’اس وضاحت کا بہت بہت شکریہ فاروقی صاحب۔‘‘ میں نے تشکر آمیز انداز میں کہا، پھر پوچھا۔’’آپ کا سیدھا ہاتھ، مقتول کا اُلٹا ہاتھ ہوا اور اسی طرح آپ کا اُلٹا ہاتھ، مقتول کا سیدھا ہاتھ ہوا نا؟‘‘

’’ظاہر ہے۔‘‘ یوسف فاروقی نے اثبات میں سر ہلایا۔’’ہم آمنے سامنے جو بیٹھے ہوئے تھے۔‘‘

میں نے اچانک سوالات کا زاویہ تبدیل کر دیا۔’’فاروقی صاحب! آپ نے پہلے پولیس کو اور بعد ازاں معزز عدالت میں بیان دیا ہے کہ آپ کی موجودگی میں مقتول اور ملزم کے مابین کچھ تلخ کلامی ہونے لگی تھی۔ اس کے بعد ہی مقتول نے آپ کو کمرے سے باہر جانے کا اشارہ کیا تھا۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ ان کے بیچ تلخ کلامی کا سبب کیا تھا؟‘‘

’’چیک کی رقم اور کچھ حقوق وغیرہ کے بارے میں ملزم اپنے باپ سے اُلجھ رہا تھا۔‘‘

میں نے پوچھا۔’’جب آپ کمرے سے باہر نکلے تو اس وقت گھڑی میں کیا بجا تھا؟‘‘

’’اُس وقت تین بج کر چالیس منٹ ہوئے تھے۔‘‘

’’آپ کا جواب مبنی بر اندازہ ہے یا آپ نے گھڑی میں وقت دیکھا تھا؟‘‘

’’میں نے گھڑی میں وقت دیکھا تھا۔‘‘

’’اس کے فوراً بعد آپ مقتول کے کمرے میں گئے تھے؟‘‘

’’میں نے ایسا ہی کیا تھا۔‘‘

میں نے کہا۔’’مقتول کے کمرے میں آپ نے جو منظر دیکھا وہ آپ کے رونگٹے کھڑے کر دینے کے لئے کافی تھا۔ کیا میں کچھ غلط کہہ رہا ہوں؟‘‘

اُس نے ایک جھرجھری لی۔’’آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔‘‘

میں نے کہا۔’’مقتول اپنی میز پر اس طرح سر ڈالے پڑا تھا کہ اُس کی گردن پر دائیں جانب ایک گہرا زخم نظر آ رہا تھا۔ مقتول کی شہ رگ کٹ چکی تھی اور خون بڑی تیزی سے خارج ہو کر میز پر پھیل رہا تھا؟‘‘

’’جی ہاں، وہ ایک دلدوز منظر تھا۔‘‘

’’آپ نے دیکھا، میز کے دائیں کونے پر چیک کے پُرزے بکھرے ہوئے تھے۔ میرا مطلب ہے وہ کونہ جہاں ایک کرسی پر تھوڑی دیر پہلے ملزم بیٹھ اپنے باپ سے بحث و تکرار میں مصروف تھا؟‘‘

یوسف فاروقی نے تائیدی لہجے میں کہا۔’’بالکل، میں نے یہی دیکھا تھا۔ میز کا وہ کونہ منصور صاحب کی طرف سے دیکھا جائے تو بایاں شمار ہوگا۔‘‘

’’پھر کاغذ کاٹنے والی وہ چھری بھی آپ کی نظر میں آگئی جس کی مدد سے مقتول کی گردن پر وار کیا گیا تھا۔‘‘ میں نے اپنا بیان جاری رکھا۔’’مذکورہ خون آلود چھری میز کے بائیں کونے میں پڑی تھی۔ یعنی میز کا وہ کونہ منصور علی کرمانی کی طرف سے دیکھا جائے تو دایاں شمار ہو گا؟‘‘

’’آپ بالکل درست فرما رہے ہیں۔‘‘ یوسف فاروقی دھیرے سے بولا۔

میں نے پوچھا۔’’اس کے بعد آپ نے کیا، کیا تھا؟‘‘

’’میں نے فوراً پولیس کو فون کر دیا تھا۔‘‘

میں نے پوچھا۔’’آپ نے پولیس کو فون کتنے بجے کیا تھا؟‘‘

’’تقریباً چار بجے۔‘‘

’’پولیس کتنے بجے جائے وقوعہ پر پہنچی تھی؟‘‘

’’ساڑھے چار بجے۔‘‘

میں نے ایک مرتبہ پھر سوالات کا زاویہ تبدیل کر دیا اور پوچھا۔’’فاروقی صاحب! کیا یہ سچ ہے کہ مقتول کی بیوہ صدف آپ کی کزن ہیں؟‘‘

وہ تامل کرتے ہوئے بولا۔’’ہاں، یہ سچ ہے۔‘‘

’’کیا یہ بھی درست ہے کہ ’’کرمانی بلڈرز‘‘ میں آپ کی سفارش کے طفیل صدف کو ملازمت مل سکی تھی؟‘‘

وہ متذبذب لہجے میں بولا۔’’میں نے سفارش تو کی تھی لیکن سچی بات یہ ہے کہ صدف ایک ٹیلنٹڈ لڑکی ہے۔ کسی اہل اور موزوں شخص کی سفارش کرنا کوئی بری بات تو نہیں۔‘‘

’’یقیناً بری بات نہیں ہے۔‘‘ میں نے اُس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ پھر کہا۔’’صدف غالباً ’’کرمانی بلڈرز‘‘ میں ٹائپسٹ کی حیثیت سے آئی تھی۔ بعد ازاں وہ ترقی کر کے مقتول کی سیکرٹری بن گئی تھی۔‘‘

’’ہاں، ایسا ہی ہوا تھا۔‘‘ اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔’’اس سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ صدف واقعی ٹیلنٹڈ لڑکی تھی۔‘‘

’’بجا فرمایا آپ نے۔‘‘ میں نے تائیدی لہجے میں کہا۔’’یہی ٹیلنٹڈ لڑکی بعد ازاں سیکرٹری کے عہدے سے ترقی کر کے مقتول کی بیوی بن گئی اور......‘‘ میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ

کر ایک لمحے کو خاموشی اختیار کی، پھر ڈرامائی لہجے میں کہا۔ ''اور اس سلسلے میں آپ نے مقتول کی بہت مدد کی تھی۔''

''کیسی مدد؟'' وہ ایسے چونکا جیسے اچانک کوئی ان ہونی ہوگئی ہو۔ ''میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا؟''

میں نے کہا۔ ''آپ نے صدف کو مقتول سے شادی کرنے پر آمادہ کیا تھا اور اس کے بدلے مقتول نے بطور انعام آپ کو اچھی خاصی رقم عطا کی تھی۔''

خاور حسین کی فراہم کردہ معلومات بہت مفید ثابت ہو رہی تھیں۔ کٹہرے میں کھڑا ہوا یوسف فاروقی ایک دم چیخ اٹھا۔

''یہ بالکل جھوٹ ہے، بکواس ہے۔ میں نے ایسی کوئی کوشش نہیں کی تھی۔'' وہ برہمی سے بولا۔ ''صدف اور منصور علی کرمانی ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے تھے اور شادی ان کی باہمی رضامندی سے ہوئی تھی۔''

میں نے کہا۔ ''کیا یہ بھی جھوٹ ہے کہ اس شادی سے ایک ہفتہ پہلے آپ نے اپنے اکاؤنٹ میں مبلغ دس ہزار روپے جمع کروائے تھے؟''

''ہاں، یہ بھی جھوٹ ہے۔'' وہ ڈھٹائی سے بولا۔

''اس کی تصدیق آپ کے بینک سے ہوسکتی ہے؟''

''آپ میرے بینک سے تصدیق کریں یا عالمی بینک سے۔'' وہ جھنجھلاہٹ آمیز لہجے میں بولا۔ ''مجھے کوئی پرواہ نہیں ہے۔''

میں نے پوچھا۔ ''کیا آپ اس بات کی بھی تردید کریں گے کہ آپ کی صدف سے منگنی ہو چکی تھی؟''

''میں بڑے شوق سے اس کی تردید کروں گا۔''

''کیا اب بھی آپ کا صدف کے گھر آنا جانا ہے؟''

وہ منہ بگاڑ کر بولا۔ ''رشتے دار ایک دوسرے کے گھر آتے جاتے ہی رہتے ہیں۔ کیوں، آپ کو کوئی اعتراض ہے؟''

''کوئی اعتراض نہیں ہے۔'' میں نے زیر لب کہا۔ ''دراصل میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ صدف کی شادی کے بعد سے مقتول کی موت تک یعنی منصور علی کرمانی کی زندگی میں آپ نے صدف سے ملنے منصور علی کے بنگلے پر جانا تقریباً ختم کر دیا تھا۔ منصور علی کی بیوی بن جانے کے باوجود صدف آپ کی کزن تھی اور.....'' میں نے جملہ ادھورا چھوڑ کر معنی خیز نظر

سے یوسف فاروقی کو دیکھا اور کہا۔ ''اور رشتے دار تو ایک دوسرے کے گھر آتے جاتے ہی رہتے ہیں۔''

یوسف فاروقی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وکیل استغاثہ سے اپنی موجودگی کا ثبوت دیتے ہوئے احتجاجی لہجے میں کہا۔

''آبجیکشن یور آنر! میرے فاضل دوست نے غیر متعلقہ باتوں سے معزز عدالت کے قیمتی وقت کو ضائع کرنے کا مصمم ارادہ کر رکھا ہے۔ وہ استغاثہ کے گواہوں کے نجی معاملات کو کرید کر جانے کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ انہیں چاہئے کہ اپنے مؤکل کی فکر کریں۔''

میں نے کہا۔ ''میرے پُرخلوص فاضل دوست، آپ کے نیک مشورے کا از حد شکریہ۔''

ایک لمحے کے توقف سے میں نے اضافہ کیا۔ ''میں اپنے مؤکل کے دفاع کی طرف سے ایک لمحے کو بھی غافل نہیں ہوا ہوں۔ میری جرح کا ایک ایک لفظ میرے مؤکل کے ''بریت اکاؤنٹ'' میں جمع ہو رہا ہے۔ آپ کو اس سلسلے میں دُبلا ہونے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔''

وکیل استغاثہ میرے اس وار پر کھسیانا ہو کر دائیں بائیں دیکھنے لگا۔ جج نے تنبیہی انداز میں کہا۔ ''آپ حضرات آپس میں اُلجھنے سے پرہیز کریں اور عدالتی کارروائی کو آگے بڑھانے کی کوشش کریں۔''

پھر جج نے مجھ سے پوچھا۔ ''بیگ صاحب! آپ استغاثہ کے گواہ پر مزید جرح کریں گے؟''

میں نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''جناب عالی! میں اپنا کام کر چکا۔ اگر معزز عدالت کی اجازت ہو تو میں اس کیس کے تفتیشی افسر سے چند سوالات کرنا چاہتا ہوں۔''

جج نے اجازت دے دی۔

انکوائری افسر سب انسپکٹر فرید خان آ کر کٹہرے میں کھڑا ہو گیا اور سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے سوال کیا۔ ''آئی۔ او صاحب! اگر میں یہ کہوں کہ منصور علی کرمانی نے خودکشی کی ہے تو آپ اس سلسلے میں کیا کہیں گے؟''

''میں آپ کے خیال کی تردید کروں گا۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''کہیں آپ یہ بات اس لئے تو نہیں کہہ رہے کہ آلۂ قتل پر.....''

''آپ سوال نہ کریں، صرف میرے سوال کا جواب دیں۔'' اُس کی بات پوری ہونے

سے پہلے ہی میں نے اُسے ٹوک دیا۔ وہ خجل سا ہو کر معاندانہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے پوچھا۔ ''آلہ قتل پر تین افراد کی انگلیوں کے نشانات پائے گئے ہیں۔ اگر منصور علی کرمانی نے خودکشی نہیں کی تو پھر یقیناً اسے قتل کیا گیا ہے۔ کیا میں صحیح کہہ رہا ہوں؟''

''آپ کا کہنا بالکل درست ہے۔'' وہ جلدی سے بولا۔ ''اور یہ قتل آپ کے مؤکل ملزم آصف علی نے کیا ہے۔''

''کیونکہ آلہ قتل پر اُس کی اُنگلیوں کے نشانات کا وجود ملا ہے؟''

''بالکل یہی بات ہے۔''

میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''آلہ قتل پر تو استغاثہ کے گواہ یوسف فاروقی کی اُنگلیوں کے نشانات بھی پائے گئے ہیں۔ آپ کا دھیان اس طرف کیوں نہیں گیا؟''

وہ جز بز ہوتے ہوئے بولا۔ ''استغاثہ کے گواہ کے فنگر پرنٹس کا ٹیسٹ بعد میں ہوا تھا۔''

''یعنی آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اگر مذکورہ ٹیسٹ پہلے ہو جاتا تو آپ میرے مؤکل کی بجائے استغاثہ کے گواہ یوسف فاروقی کو گرفتار کر لیتے؟''

وہ قطعیت سے بولا۔ ''میں ہرگز یہ نہیں کہنا چاہتا۔ ہم اوّل آخر ملزم آصف علی پر ہی ہاتھ ڈالتے۔''

''اس کی کوئی خاص وجہ؟''

''قتل کا محرک۔'' وہ ٹھوس لہجے میں بولا۔ ''واقعاتی شہادتیں اور پس پردہ حالات ملزم آصف علی کی ہی جانب اشارہ کرتے ہیں۔ پھر ملزم نے پولیس کی تحویل میں اقبالِ جرم بھی کر لیا تھا۔''

میں نے اچانک پلٹا کھایا اور انکوائری افسر کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔ ''موقع واردات کا نقشہ آپ ہی نے بنایا تھا؟''

اُس نے اثبات میں جواب دیا۔ میں نے پوچھا۔ ''اس نقشے کی تفصیلات تو آپ کے ذہن میں تازہ ہی ہوں گی۔''

''جی ہاں، تازہ ہیں۔'' اُس نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔ ''اور اس نقشے کی ایک کاپی میری فائل میں بھی موجود ہے۔ علاوہ ازیں ایک کاپی چالان رپورٹ کے ساتھ منسلک ہے۔''

''بہت خوب۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''آپ اپنی فائل کو کھول کر سامنے رکھ لیں۔ میں موقع واردات کی جزئیات بیان کرتا جاتا ہوں۔ جہاں پر میں غلطی کروں،

آپ مجھے فوراً ٹوک دیں۔''

وکیل استغاثہ نے اعتراض کیا۔ ''یور آنر، وکیل صفائی خوامخواہ ڈرامائی انداز اختیار کر کے عدالت کا وقت ضائع کرنا چاہتے ہیں۔''

جج نے وکیل استغاثہ کے اعتراض کو مسترد کرتے ہوئے مقدمے کی فائل کھول کر جائے وقوعہ کا نقشہ اپنے سامنے پھیلا لیا، پھر سوالیہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔ میں نے اُس کے چہرے کے تاثرات سے اندازہ لگا لیا کہ وہ میرے بولنے کا بے چینی سے منتظر تھا۔

میں نے بولنا شروع کیا۔ ''منصور علی کرمانی کا کمرہ سائز میں بارہ ضرب پندرہ فٹ ہے۔ کمرے میں داخلے کا دروازہ شمالی دیوار میں ہے۔ کمرے میں داخل ہوں تو سامنے یعنی جنوبی دیوار کے ساتھ مقتول کی کرسی نظر آ جائے گی۔ اس ریوالونگ چیئر کے آگے ایک کنگ سائز نیم بیضوی میز موجود ہے۔ مذکورہ میز کی لمبائی سات فٹ اور چوڑائی لگ بھگ چار فٹ ہے۔ اس میز کے سامنے ملاقاتیوں کے لئے تین خوب صورت کرسیاں بچھی ہوئی ہیں۔ مقتول کی کرسی کی دائیں جانب ایک سائیڈ ٹیبل بھی رکھی ہوئی ہے جس کی اونچائی نیم بیضوی میز کے برابر اور لمبائی کم و بیش تین فٹ ہے۔ مذکورہ میز کمرے کی جنوبی دیوار کو نیم بیضوی میز کے دائیں کونے سے ملا دیتی ہے۔ کمرے کی جنوبی دیوار ہی میں، داخلی دروازے کے بالکل سامنے، زمین سے ایک فٹ کی اونچائی پر ایک ایئر کنڈیشنر نصب ہے۔'' میں ہر جملے کے بعد ذرا توقف کر کے سوالیہ نظر سے انکوائری افسر کو دیکھتا تھا۔ وہ سر کو اثباتی جنبش دیتا اور میں دوبارہ بولنا شروع کر دیتا۔ ''جب پولیس موقع واردات پر پہنچی تو مقتول منصور علی کرمانی اپنی نیم بیضوی میز پر سر ڈالے موت کو گلے لگا چکا تھا۔ اس کی گردن کی دائیں جانب لگنے والے گھاؤ نے شہ رگ کو بھی کاٹ دیا تھا۔ آلہ قتل یعنی کاغذ کاٹنے والی چھری نیم بیضوی میز کے مشرقی حصے میں موجود تھی۔ ایک ہزار روپے مالیت کے چیک کے ٹکڑے مذکورہ بالا میز کے مغربی حصے پر بکھرے ہوئے تھے۔ مقتول جس ریوالونگ چیئر پر براجمان تھا اس کی سیٹ کی لمبائی دو فٹ اور چوڑائی ڈیڑھ فٹ تھی۔''

میں اچانک خاموش ہو کر حاضرین عدالت کا جائزہ لینے لگا۔ جج، وکیل استغاثہ اور انکوائری افسر کی نگاہیں مجھ پر ٹکی ہوئی تھیں۔ انکوائری افسر نے میرے کسی جملے کی تردید یا کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔ میں نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور روئے سخن انکوائری افسر کی جانب موڑتے ہوئے سوال کیا۔

''آئی۔ او صاحب! جب آپ موقع واردات پر پہنچے تو آپ نے وہاں کوئی افراتفری

محسوس کی؟''

اُس نے جواب دیا۔''کرمانی بلڈرز کا تمام اسٹاف مقتول کے کمرے کے باہر جمع تھا۔''

''میں نے موقع واردات کے بارے میں سوال کیا ہے۔'' میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔''مقتول کے دفتری کمرے کے اندر آپ کو کسی قسم کی ابتری نظر آئی؟''

اُس نے جواب دیا۔''نہیں جناب، سب کچھ معمول کے مطابق ویسا ہی تھا جیسا مشیر نامے میں تحریر کیا گیا ہے۔''

''شکریہ سب انسپکٹر صاحب۔'' میں نے دھیمے لہجے میں کہا، پھر جج کی طرف دیکھتے ہوئے با آواز بلند اضافہ کیا۔''مجھے اور کچھ نہیں پوچھنا جناب عالی۔''

اس کے ساتھ ہی عدالت کا مقررہ وقت ختم ہوگیا۔ جج نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔''بیگ صاحب! استغاثہ کے گواہوں کے بیانات اور جرح تو مکمل ہو چکی۔ آپ نے صفائی کے گواہوں کی فہرست داخل نہیں کی۔ اس سلسلے میں آپ کا کیا ارادہ ہے؟''

میں نے کہا۔''جناب عالی! اپنے مؤکل کی صفائی کے لئے میرے دلائل ہی کافی ہوں گے۔ آپ دلائل کے لئے نئی تاریخ دے دیں۔''

وکیل استغاثہ بول اٹھا۔''جناب عالی! دلائل کا مرحلہ آنے سے پہلے میں ملزم پر جرح کرنا چاہتا ہوں۔''

جج نے وکیل استغاثہ کے مطالبے کو ملحوظ رکھتے ہوئے ایک ہفتے بعد کی تاریخ دے دی۔ اس کے بعد عدالت برخاست ہوگئی۔

آئندہ پیشی پر وکیل استغاثہ نے میرے مؤکل پر جرح مکمل کر لی۔ اُس نے گھما پھرا کر سینکڑوں سوالات کئے لیکن اس تمام کارروائی میں کوئی قابل ذکر بات نہیں ہے اس لئے اس ذکر کو گول کرتے ہوئے براہِ راست دلائل کی جانب آتا ہوں۔

✡......✡
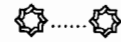
عدالت کا کمرہ پوری طرح بھرا ہوا تھا۔ جج اپنی کرسی پر متمکن تھا اور متعلقہ دیگر تمام افراد بھی کمرے میں موجود تھے۔ جج نے عدالتی کارروائی کا آغاز کیا۔ وکیل استغاثہ نے میرے مؤکل کے خلاف دلائل کا سلسلہ شروع کر دیا۔

آدھے گھنٹے تک وہ دُھواں دھار انداز میں اس بات پر زور دیتا رہا کہ میرا مؤکل ایک قاتل ہے۔ اس نے اپنے باپ کو موت کے گھاٹ اتارا ہے اس لئے اسے قرار واقعی سزا ملنی چاہئے۔ وکیل استغاثہ کے دلائل میں کوئی نئی بات نہیں تھی اس لئے اس تفصیل کا ذکر میں

ضروری نہیں سمجھتا۔ میں نے ایک بات واضح طور پر محسوس کی کہ جج، وکیل استغاثہ کے دلائل کو نہایت بے دلی سے سنتا رہا تھا کیونکہ وہ تمام دلائل انتہائی غیر متاثر کن تھے۔

اپنی باری پر میں نے جج کی اجازت حاصل کرنے کے بعد اپنے مؤکل اور اس مقدمے کے ملزم آصف علی کی بے گناہی کے حق میں دلائل دینا شروع کئے۔ میں نے کہا۔

''جناب عالی! میرا مؤکل انتہائی معصوم اور بے قصور انسان ہے۔ اسے ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت اس کیس میں پھانسا گیا ہے۔''

وکیل استغاثہ نے فوراً مداخلت کی۔''آپ پہلے بھی کئی مرتبہ اپنے مؤکل کو بے گناہ کہہ چکے ہیں۔ کوئی ثبوت بھی ہے آپ کے پاس؟''

''بڑا مضبوط ثبوت ہے میرے پاس۔'' میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

جج نے کہا۔''بیگ صاحب! آپ وہ ثبوت عدالت میں پیش کریں۔''

میں نے کہا۔''جناب عالی! میں انکوائری افسر کو تھوڑی زحمت دینا چاہتا ہوں۔ اگر عدالت کو کوئی اعتراض نہ ہو تو وہ میرے پاس چلے آئیں۔''

جج نے اجازت دے دی۔ انکوائری افسر میرے نزدیک آ کر کھڑا ہوگیا اور سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے اپنے کوٹ کی جیب سے درزیوں والا انچی ٹیپ (فیتہ) برآمد کیا اور انکوائری افسر کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

''یہ لیجئے آئی۔ او صاحب!''

اُس نے تعجب خیز نظروں سے مجھے دیکھا اور پوچھا۔''میں اس کا کیا کروں؟''

''ابھی بتاتا ہوں، آپ پکڑیں تو سہی۔'' میں نے سرسری سے لہجے میں کہا، پھر اپنے مؤکل کی جانب متوجہ ہوگیا۔

''آصف علی!'' میں نے اُسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔''اپنا بازو سامنے پھیلا لو۔''

اُس نے میرے حکم کی تعمیل کی۔ میں نے کہا۔''مٹھی کو بند کرو۔''

آصف علی نے مٹھی بند کر دی۔ میں نے انکوائری افسر کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔''آئی او صاحب! اگر آپ برا نہ مانیں تو ملزم کے بازو کو اس فیتے سے ناپ لیں۔''

وہ تامل کرتے ہوئے آگے بڑھا اور آصف علی کے پھیلے ہوئے بازو کو انچی ٹیپ سے ناپنے لگا۔ جب وہ یہ کام مکمل کر چکا تو میں نے سوال کیا۔''آئی۔ او صاحب، کیا پیائش آئی ہے؟''

اُس نے فیتے پر درج ہندسوں کو شمار کرتے ہوئے جواب دیا۔''دوفٹ پانچ انچ۔''

میں نے پوچھا۔ ''آپ نے بازو کو کندھے سے مٹھی تک ناپا ہے نا؟''
اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔ میں نے اُس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے انچی ٹیپ واپس لے لیا اور جج کی میز پر پڑے ہوئے آلۂ قتل کو اٹھا لیا۔ مذکورہ پیپر نائف سیلوفین کی مخصوص تھیلی میں بند تھا۔ میں نے وہ تھیلی، آئی۔او کی آنکھوں کے سامنے لہراتے ہوئے کہا۔

''میرے خیال میں اس چھری کی لمبائی تقریباً نو انچ ہے۔ یعنی چار انچ کا دستہ اور پانچ انچ کا پھال جو انتہائی تیز دھار ہے۔ کیا آپ میرے خیال سے اتفاق کرتے ہیں؟''

''آپ بالکل درست کہہ رہے ہیں۔''

میں نے پوچھا۔ ''اگر یہ چھری ملزم کے ہاتھ میں تھما دی جائے تو ملزم کے بازو کی لمبائی کتنی ہو جائے گی یعنی چھری سمیت؟''

وہ حساب لگاتے ہوئے بولا۔ ''تین فٹ دو انچ۔''

''بالکل غلط۔'' میں نے تیز آواز میں کہا۔ ''جب چھری ہاتھ میں تھامی جائے گی تو چھری کا دستہ مٹھی کے اندر بند ہو جائے گا اور صرف ننگا پھل بازو کی لمبائی میں اضافہ کرے گا۔ اس طرح ملزم کے بازو کی کل لمبائی دو فٹ اور دس انچ ہو جائے گی۔ ایم آئی رائٹ؟''

وہ خجالت آمیز لہجے میں بولا۔ ''سوری، مجھ سے غلطی ہو گئی۔ آپ کا حساب بالکل درست ہے۔''

''شکریہ اس تعاون کا آئی۔او صاحب۔'' میں نے عام سے لہجے میں کہا پھر جج کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے دلائل کا سلسلہ جاری رکھا۔

''یور آنر! میرا مؤکل جس کرسی پر بیٹھ کر مقتول سے گفتگو کر رہا تھا، اس کرسی کے سامنے کنگ سائز نیم بیضوی میز موجود تھی۔ واضح رہے کہ مذکورہ میز کی مصدقہ چوڑائی چار فٹ ہے۔ میرا مؤکل کرسی پر بیٹھے بیٹھے اگر پیپر نائف سے مقتول پر حملہ آور ہوتا تو وہ زیادہ سے زیادہ دو فٹ دس انچ تک حملہ کر سکتا تھا۔ بہ فرضِ محال اگر یہ سوچا جائے کہ ملزم نے کرسی سے کھڑے ہو کر اور آگے کو جھکتے ہوئے اپنے باپ پر چھری سے وار کیا تھا تو ہم محتاط اندازے کے مطابق ملزم کی دسترس میں ایک فٹ کا اضافہ کر لیتے ہیں۔ اس طرح ملزم کے حملے کی رینج تین فٹ دس انچ ہو جائے گی یا زیادہ سے زیادہ چار فٹ۔

جناب عالی! اب آپ مقتول کی جانب سے فاصلے کا حساب بھی سن لیں۔ مقتول جس کرسی پر براجمان تھا، اس کی مصدقہ لمبائی یعنی سیٹ کی لمبائی دو فٹ ہے۔ اگر مقتول کرسی پر سیدھا بھی بیٹھا ہو گا تو میز سے اُس کی گردن کا فاصلہ دو فٹ تو ہو گا ہی۔ ایسی صورت میں یہ

کہا جا سکتا ہے کہ ملزم سے مقتول کا فاصلہ پورے چھ فٹ تھا جبکہ ملزم کے حملے کی رینج زیادہ سے زیادہ چار فٹ تھی۔ جناب عالی! ان اعداد و شمار کی روشنی میں یہ ممکن نہیں کہ ملزم نے مقتول کی گردن کو پیپر نائف سے نشانہ بنایا ہو۔''

وکیل استغاثہ نے کمزور سا اعتراض اٹھایا۔ ''یہ بھی تو ممکن ہے کہ مقتول آگے کی جانب میز پر بازو ٹکائے بیٹھا ہو؟''

میں نے کہا۔ ''اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے تو بھی ملزم کے حملے کو ثابت نہیں کیا جا سکتا۔'' پھر میں نے جج کی طرف دیکھتے ہوئے سلسلۂ دلائل جاری رکھا۔

''جناب عالی! مقتول کی گردن پر دائیں جانب پیپر نائف سے حملہ کیا گیا تھا۔ یہ بات بھی میرے مؤکل کی بے گناہی کو ثابت کرتی ہے۔ اگر میرا مؤکل مقتول پر حملہ کرتا اور وہ حملہ بالفرض کامیاب بھی ہو جاتا تو اس صورت میں مقتول کی گردن کی بائیں جانب پر زخم لگنا چاہئے تھا یا زیادہ سے زیادہ گردن کے سامنے والے حصے پر۔ لیکن شواہد اس کے بالعکس نشاندہی کرتے ہیں۔ مقتول کی گردن پر پایا جانے والا مہلک گھاؤ، اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ مقتول کے عقب سے اُس کی گردن پر وار کیا گیا تھا جو ظاہر ہے میرا مؤکل تو نہیں کر سکتا تھا۔

جناب عالی! استغاثہ کے نہایت ہی اہم گواہ یوسف فاروقی نے اس بات کی تصدیق کی ہے کہ جب وہ وقوعہ کے روز کمرے سے اٹھ کر باہر نکلا تو اس وقت مقتول اور ملزم میں اچھی خاصی تلخ کلامی ہو رہی تھی۔ یور آنر، جب دو افراد میں کسی بات پر ترش تلخی کی باتیں ہو رہی ہوں اس وقت وہ دونوں ایک دوسرے کی طرف سے غافل نہیں ہوتے۔ یہ تو فرض کرنا بھی محال ہے کہ میرے مؤکل نے مقتول سے چھ فٹ کے فاصلے پر رہتے ہوئے بھی اس کی گردن پر چھری سے وار کر ڈالا اور وہ اتنا غافل تھا کہ اپنے بچاؤ کے لئے کچھ بھی نہیں کر سکا۔

جناب عالی! اس امکان کا تو تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ میرا مؤکل اپنی جگہ سے اٹھا ہو گا اور مقتول کے عقب میں جا کر اُس نے مقتول کی گردن پر چھری چلائی ہو گی۔ مقتول کوئی مٹی کا بے جان کھلونا نہیں تھا کہ میرے مؤکل کی راہ میں مزاحمت نہ کرتا جب کہ اُس کے ہاتھ کی پہنچ میں میز کے کونے پر کال بیل کا بٹن تھا۔ وہ میرے مؤکل کے خطرناک عزائم کو دیکھتے ہی پلک جھپکتے میں گھنٹی بجا کر باہر سے کسی کو بلا سکتا تھا لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔

یور آنر! پولیس کے تیار کردہ چالان اور وقوعہ کے نقشے سے بھی یہ بات ثابت ہوتی ہے

کہ کمرے میں کسی قسم کی ابتری یا افراتفری کے آثار نہیں پائے گئے تھے۔ اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ کمرے میں کوئی ہنگامی قسم کی صورت حال پیش نہیں آئی تھی۔ اگر میرا مؤکل واقعی مقتول پر حملہ آور ہوتا تو ایسا ممکن نہیں تھا کہ مقتول گھنٹی نہ بجاتا، وہ اپنے بچاؤ کی کوئی ترکیب نہ آزماتا یا وہ حملے سے بچنے کے لئے کرسی سے اُٹھ کھڑا نہ ہوتا۔

جناب عالی! یہ تو انسانی فطرت ہے...... بلکہ ہر زندہ چیز کی فطرت ہے کہ جب اس پر کسی قسم کا حملہ کیا جائے تو وہ لاشعوری طور پر فوراً اپنے آپ کو بچانے کے لئے پیچھے ہٹتا ہے۔ لیکن زیر ساعت کیس میں ایسی کوئی بات نظر نہیں آتی۔ مشیر نامے اور پولیس رپورٹ سے ظاہر ہوتا ہے کہ مقتول نے بڑی شرافت سے میز پر گردن رکھ کر کہا ہو گا...... آؤ میرے بچے، میری گردن کاٹ دو۔

جناب عالی! حالات و واقعات سے یہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے کہ میرا مؤکل بے گناہ ہے۔ اس کی مقتول سے تلخ کلامی ہوئی اور اُس نے چیک پھاڑ کر باپ کی میز پر پھینکا اور غصے میں دفتر سے نکل گیا۔ اس کے بعد ہی مقتول کو موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ اور اس بات میں منطقی و عقلی طور پر شک و شبے کی گنجائش نہیں ہے کہ مقتول کو اس کی بے خبری میں عقبی سمت سے وار کر کے موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ جب کسی شخص کو بہ ہوش و حواس کسی تیز دھار آلے کی مدد سے قتل کیا جاتا ہے تو جائے وقوعہ کی حالت چیخ چیخ کر اس ظلم و زیادتی کا اعلان کر رہی ہوتی ہے۔ جبکہ مقتول کے قتل پر اس کی میز پر موجود اسٹیشنری اور دیگر اشیاء کی ترتیب تک میں فرق نہیں آیا۔

جناب عالی! آج تک کسی شخص نے مشتعل ہو کر اتنے ''سلیقے'' سے قتل نہیں کیا اور نہ ہی دنیا میں کوئی ایسا احمق ہو گا جو اپنے سامنے چھری بردار مشتعل شخص کو دیکھ کر ''شرافت'' سے میز پر گردن ڈال دے۔ کوئی مخبوط الحواس ہی اپنی جان کا ایسا دشمن ہو گا جبکہ مقتول منصور علی کرمانی ایک سمجھدار، ذہین، چالاک، دُور اندیش اور ذہنی طور پر نارمل انسان تھا۔ ایک معمولی راج مستری سے اس شہر کے معروف بلڈر تک کا سفر اس کی ذہانت اور کامیابی پر دلالت کرتا ہے۔

جناب عالی! ان تمام حقائق کی روشنی میں، میں معزز عدالت سے استدعا کروں گا کہ میرے مؤکل کو باعزت طور پر بری کرنے کے احکامات جاری کئے جائیں تاکہ اس کی نیک نامی اور ساکھ بحال ہو سکے۔ دیٹس آل یور آنر۔''

جج کافی دیر تک اپنے سامنے پھیلے ہوئے کاغذات کو اُلٹ پلٹ کر دیکھتا رہا، پھر وہ وکیل

استغاثہ اور انکوائری افسر کی جانب دیکھتے ہوئے مستفسر ہوا۔

''آپ حضرات کچھ کہنا چاہتے ہیں؟''

آئی۔ او نے کہا۔ ''جناب عالی! میں سردست کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ویسے وکیل صفائی کے دلائل خاصے وزنی ہیں۔ مجھے نئے سرے سے کیس کا مطالعہ کرنا پڑے گا۔''

''یعنی آپ کے پاس کچھ ایسے شواہد جمع ہیں جو وکیل صفائی کے دلائل کو توڑ سکیں؟'' جج نے چبھتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

''ناٹ ایٹ آل یور آنر۔'' آئی۔او نے نفی میں گردن ہلائی۔ ''میں کیس کا دوبارہ مطالعہ کر کے اصل قاتل تک پہنچنا چاہتا ہوں۔''

''یعنی آپ تسلیم کرتے ہیں کہ ملزم آصف علی بے گناہ ہے؟''

''فی الحال تو یہی نظر آ رہا ہے۔''

جج نے فیصلے کے لئے تاریخ دے کر عدالت برخاست کر دی۔

۞......۞

اگلی پیشی پر عدالت نے میرے مؤکل آصف علی کو باعزت بری کر دیا اور انکوائری افسر سب انسپکٹر فرید خان کو ہدایت کی کہ وہ عرصہ سات یوم کے اندر نیا چالان عدالت میں پیش کر دے۔

بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ پولیس نے ''کرمانی بلڈرز'' کے منیجر یوسف فاروقی کو گرفتار کر کے اقبالِ جرم کرا لیا تھا۔ یوسف فاروقی کی جانب پولیس کا دھیان میری جرح کی وجہ سے گیا تھا۔ یوسف فاروقی کچا مجرم تھا اس لئے وہ پولیس کی تفتیش کے سامنے زیادہ دیر نہ ٹھہر سکا اور اُس نے سب کچھ من وعن بیان کر دیا۔

یوسف فاروقی ایک کائیاں، چال باز اور منصوبہ ساز شخص تھا۔ وہ صدف کا کزن تھا اور جس وقت چاہتا، صدف سے شادی کر سکتا تھا لیکن صدف چونکہ ایک غریب خاندان سے تعلق رکھتی تھی اس لئے وہ گھاٹے کا سودا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ دولت کے حصول کے لئے اُس نے منصور علی کرمانی کو ٹارگٹ بنایا۔ پہلے اُس کا بھرپور اعتماد حاصل کیا، پھر صدف کو اُس کے یہاں ملازمت دلوائی۔ جب منصور علی کرمانی نے صدف میں دلچسپی ظاہر کی تو یوسف فاروقی کو اپنی منزل قریب نظر آنے لگی۔ اُس نے منصور علی پر احسان کرتے ہوئے صدف سے اُس کی شادی کروا دی۔ صدف چونکہ یوسف کی احسان مند تھی اس لئے اُن کی بات کو بڑی اہمیت دیتی تھی۔ صدف نے یوسف کی ہدایات پر عمل کرتے ہوئے منصور علی کی دولت و

جائیداد پر اپنا قبضہ مضبوط کرنا شروع کر دیا۔ پھر جب یوسف کو احساس ہوا کہ اب منصور علی کا کھیل ختم ہو جانا چاہئے تو وہ موقع کی تاک میں رہنے لگا۔ اُس نے شروع ہی سے قربانی کے بکرے کے طور پر آصف علی کو چن رکھا تھا اور کسی مناسب موقع کا منتظر تھا۔ پھر وقوعہ کے روز تین جون کو اُسے وہ سنہری موقع مل ہی گیا۔ اُس نے آصف علی کے رخصت ہوتے ہی کمرے میں جا کر خاموشی سے منصور علی کرمانی کا کام تمام کر دیا۔ وہ کسی کام کے بہانے مقتول کے عقب میں گیا تھا اور پیپر نائف کو اُس کی گردن کی دائیں جانب ''استعمال'' کر ڈالا۔

یوسف فاروقی بڑی حد تک اپنے منصوبے میں کامران ہو چکا تھا۔ اُس نے حرص و ہوس کی بساط پر جو مہلک چال چلی تھی اس کے نتیجے میں آصف علی کو موت کی سزا ہو جاتی اور صدف کے توسط سے مقتول منصور علی کرمانی کی ساری دولت و جائیداد اُس کے قبضے میں آ جاتی۔ صدف کو شادی کے لئے تیار کرنا اُس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔

مگر...... اُس نے جو سوچا تھا، وہ پورا نہ ہو سکا۔ اُس کے خواب چکنا چور ہو گئے۔ اب پھانسی کا پھندا یا جیل کی تاریک کوٹھری ہی اُس کا مقدر تھی۔

✡......✡

عذابِ ماضی

منگل کے روز جو آخری شخص میرے دفتر میں داخل ہوا اُس نے سرمئی رنگ کا شلوار سوٹ پہن رکھا تھا۔ رنگت سانولی، آنکھوں پر نظر کا چشمہ اور پاؤں میں اُس کے بند چپل تھی۔ پہلی نظر میں، میں نے اُس کی عمر کا اندازہ لگ بھگ پچاس لگایا جو بعد ازاں درست ثابت ہوا۔ اس وقت وہ خاصا تھکا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ اُس کے چہرے سے پریشانی مترشح تھی۔

میں نے حسب عادت پیشہ ورانہ مسکراہٹ سے اُس کا استقبال کیا اور بیٹھنے کے لئے کرسی پیش کی۔ وہ بہ نظر غائر میرے کمرے کا جائزہ لینے کے بعد کرسی پر بیٹھ گیا۔ رسمی کلمات کے بعد میں نے سوالیہ نظر سے اُسے دیکھا تو وہ بولا۔

''مجھے مرزا امجد بیگ صاحب سے ملنا ہے۔''

''میں ہی مرزا امجد بیگ ایڈووکیٹ ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔

اُس نے اپنا تعارف کرواتے ہوئے بتایا۔ ''وکیل صاحب! میرا نام فضل کریم ہے اور میں حیدر آباد سے آیا ہوں۔''

''جی۔'' میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا پھر کہا۔ ''فرمایئے، میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟''

فضل کریم نامی شخص نے بتایا۔ ''مجھے تبسم نیازی صاحب نے آپ کے پاس بھیجا ہے۔''

''تبسم نیازی......'' میں نے سوچنے والے انداز میں کہا۔

وہ جلدی سے بولا۔ ''وہی جو اخبار والے ہیں۔'' پھر اُس نے اپنی جیب سے ایک وزیٹنگ کارڈ نکال کر میری جانب بڑھا دیا۔

میں نے اُس کارڈ پر ایک نگاہ ڈالی اور فوراً پہچان گیا۔ تبسم نیازی صاحب حیدر آباد پریس کلب کے ایک اعلیٰ عہدے دار اور میدانِ صحافت کی ایک معروف شخصیت تھے۔ کسی زمانے میں وہ کراچی سے شائع ہونے والے ایک اخبار کے ایڈیٹر بھی رہ چکے تھے۔ انہی دنوں کی میری اُن سے یاد اللہ تھی۔ ملاقات ہوئے چونکہ کئی سال گزر گئے تھے اس لئے ان کا

نام میرے ذہن سے اتر گیا تھا۔ لیکن کارڈ دیکھتے ہی مجھے سب کچھ یاد آ گیا تھا۔
''جی فضل کریم صاحب!'' میں نے اپنے سامنے بیٹھے ہوئے ادھیڑ عمر شخص کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ کس سلسلے میں تشریف لائے ہیں۔ میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟''

وہ ملتجیانہ لہجے میں بولا۔ ''آپ ایک مانے ہوئے وکیل ہیں اور میں آپ سے قانونی مدد کا طلب گار ہوں۔ آپ تبسم صاحب کو تو جانتے ہیں نا۔ انہوں نے مجھے یقین دلایا تھا کہ میں آپ سے مل لوں تو میرا مسئلہ حل ہو جائے گا۔''

اُس نے دوبارہ تبسم نیازی کا حوالہ دیا تو میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ''تبسم صاحب سے میرے دوستانہ مراسم ہیں۔ اگرچہ ملاقات ہوئے ایک عرصہ گزر چکا ہے۔'' ایک لمحے کے توقف سے میں نے پوچھا۔ ''آپ نے ابھی تک اپنا مسئلہ بیان نہیں کیا؟''

وہ ایک ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے بولا۔ ''میرے بیٹے کو پولیس نے گرفتار کر لیا ہے۔''

''کس جرم میں؟''

''اُس پر قتل کا الزام ہے۔''

میں نے رف پیڈ اور قلم سنبھال لیا پھر پوچھا۔ ''کیا اُسے حیدر آباد میں گرفتار کیا گیا ہے؟''

''نہیں جناب، وہ کراچی میں گرفتار ہوا ہے۔''

''مقتول کون ہے؟''

''ایک پچیس سالہ خوب صورت عورت۔'' اُس نے جواب دیا۔

میں تیزی سے اہم پوائنٹس نوٹ کرتا جا رہا تھا۔ میں نے فضل کریم کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ''آپ کے زیرِحراست بیٹے کا نام کیا ہے؟''

''جبار احمد۔''

''کیا وہ سیر و تفریح کے لئے کراچی آیا ہوا تھا؟''

اُس نے نفی میں سر ہلایا اور بتایا۔ ''جبار ایک ماہ قبل روزگار کے سلسلے میں کراچی آیا تھا۔''

''اُس کا ذریعہ معاش کیا تھا؟''

''وہ ایک بہت اچھا پلمبر ہے۔''

میں نے پوچھا۔ ''کراچی آنے سے پہلے وہ حیدر آباد میں بھی یہی کام کرتا تھا؟''

فضل کریم کے چہرے پر افسردگی کی چادر کچھ اور دبیز ہو گئی۔ وہ شکستہ لہجے میں گویا ہوا۔

''پلمبرنگ کا کام اُس نے حال ہی میں شروع کیا تھا۔ کراچی میں اس کام کا پہلا تجربہ تھا۔''

''آپ کے بیان میں تضاد پایا جاتا ہے محترم فضل کریم صاحب!'' میں نے گہری نظر سے اُسے گھورتے ہوئے کہا۔ ''پہلے آپ نے بتایا ہے کہ آپ کا بیٹا جبار احمد ایک بہت عمدہ قسم کا پلمبر ہے۔ اب آپ فرما رہے ہیں کہ پلمبرنگ کا کام اُس نے حال ہی میں شروع کیا تھا اور کراچی میں اس کام کا پہلا تجربہ تھا۔ آپ اپنے بیان کی وضاحت کریں گے؟''

وہ تامل کرتے ہوئے بولا۔ ''میں نے پہلے بھی سچ کہا تھا اور اب بھی جھوٹ نہیں بول رہا ہوں۔'' ایک لمحے کے توقف سے اُس نے وضاحتی لہجے میں بتایا۔ ''بیگ صاحب! میں ایک طویل عرصے سے حیدر آباد میں کپڑے کی دُکان چلا رہا ہوں۔ میری رہائش اور دُکان لیاقت اشرف کالونی میں ہے۔ میری دُکان کا نام ''الحمد کلاتھ ہاؤس'' ہے۔ جبار پہلے میرے ساتھ ہی دُکان پر بیٹھتا تھا۔ پھر ایک ناکردہ جرم کی پاداش میں وہ جیل چلا گیا۔ سات سال بعد وہ رہا ہوا تو اُس نے پلمبرنگ کا پیشہ اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔ دراصل جیل کے اندر وہ ایک تجربے کار قیدی سے یہ ہنر سیکھتا رہا تھا اور اس میں اتنا مشاق ہو گیا تھا کہ اس کام کو مستقل اپنانے کا فیصلہ کر بیٹھا۔''

جب فضل کریم نے اپنے بیٹے کے جیل جانے کا تذکرہ کیا تو میں چونک گیا تھا۔ قتل کے الزام میں گرفتار ایک ایسے شخص کا کیس میرے سپرد کیا جا رہا تھا جو کچھ عرصہ قبل سات سال کی جیل کاٹ کر آیا تھا۔ میں نے موجودہ صورتِ حال کو نظر انداز کرتے ہوئے کریدنے والے لہجے میں پوچھا۔

''آپ کا بیٹا کس جرم میں جیل گیا تھا؟''

''وہ ایک ناکردہ جرم تھا جناب......''

میں نے قدرے ناگواری سے کہا۔ ''یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے۔''

وہ متذبذب نظر آنے لگا۔ میں نے تنبیہی لہجے میں کہا۔ ''فضل کریم صاحب! ڈاکٹر سے مرض، وکیل سے جرم نہیں چھپانا چاہئے۔ اگر ان دونوں مسیحاؤں سے بھرپور استفادہ مقصود ہو تو ہر بات کھول کر سچ سچ بتا دینا چاہئے۔''

وہ جزبز ہو کر بولا۔ ''بیگ صاحب آپ سے کچھ چھپانا چاہتا ہوں اور نہ ہی آپ سے کوئی جھوٹ بولنے کا ارادہ لے کر یہاں پہنچا ہوں۔''

''پھر آپ میرے سوال کا جواب دینے میں متامل کیوں ہیں؟''

''میں سوچ رہا تھا، شاید آپ جبار احمد کے بارے میں کوئی غلط تاثر قائم کر لیں گے اور

فوراً میری مدد سے انکار کر دیں گے۔'' وہ ندامت آمیز لہجے میں بولا۔

میں نے کہا۔ ''مجھے اللہ نے اتنی عقل دے رکھی ہے کہ میں کسی شخص کے بارے میں تاثر قائم کرتے وقت غلط اور صحیح کا خیال رکھ سکوں۔ اگر آپ میرے سوالوں کے ٹھیک ٹھیک جواب نہیں دیں گے تو میں سمجھوں گا آپ عدم تعاون کا اظہار کر رہے ہیں۔ ایسی صورت میں، میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکوں گا۔''

''میں آپ کے ہر سوال کا جواب دوں گا۔'' وہ سنجیدہ لہجے میں بولا۔

میں نے پوچھا۔ ''آپ کا بیٹا جبار ماضی میں کس ناکردہ جرم میں جیل گیا تھا؟''

اُس نے جواب دیا۔ ''ایک شخص اُس کی جان کے درپے تھا۔ اُس شخص کے پاس ریوالور تھا اور دونوں میں ہاتھا پائی ہو رہی تھی۔ پھر ایک موقع پر مذکورہ ریوالور جبار کے ہاتھ میں آ گیا۔ اسی وقت حملہ آور شخص نے جبار کے ریوالور والے ہاتھ پر جھپٹا مارا۔ اتفاق سے ریوالور چل گیا۔ دو فائر ہوئے۔ ایک گولی حملہ آور کے کندھے میں لگی، دوسری اُس کے گھٹنے کی چپنی کو توڑتی ہوئی گزر گئی۔ حملہ آور فائرنگ کی دہشت اور شدید زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے موقع پر ہی بے ہوش ہو گیا۔ پولیس نے تھوڑی ہی دیر بعد جبار کو قاتلانہ حملے کے الزام میں گرفتار کر لیا۔ اس پر ارادۂ ارتکابِ قتلِ عمد کا کیس بنا اور وہ سات سال کے لئے جیل چلا گیا۔ جبار نے تو اپنی جان بچانے کے لئے مذکور شخص سے ریوالور چھینا تھا مگر پولیس نے ہماری ایک نہ سنی۔ وہ غریبوں کی سنتی ہی کب ہے۔ عدالتی ریمانڈ کے دوران میں، میں جبار کی بریت کے لئے کوشش کر ہی رہا تھا کہ اُس نے خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی مار لی۔''

فضل کریم اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔ میں نے اضطراری لہجے میں دریافت کیا۔ ''جبار نے ایسا کیا کر دیا تھا؟''

''اُس نے پولیس کسٹڈی میں اقرارِ جرم کر لیا تھا۔''

مجھے حیرت کا ایک جھٹکا لگا۔ میں نے پوچھا۔ ''آپ کا مطلب ہے، جبار نے حملہ آور پر بالارادہ فائرنگ کا اقبال کر لیا تھا؟''

''جی ہاں، اُس گدھے کے بچے نے یہی کیا تھا۔''

فضل کریم کو اس وقت مطلق یہ احساس نہیں تھا کہ وہ خود کو گدھا کہہ رہا تھا۔ میں نے پوچھا۔ ''اس کی کوئی خاص وجہ تھی؟''

''یہ راز آج تک میری سمجھ میں نہیں آیا جناب۔''

میں نے کہا۔ ''ہو سکتا ہے، اُس کا ضمیر جاگ اُٹھا ہو۔''

''میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا بیگ صاحب!''

میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ممکن ہے، جبار نے واقعتاً حملہ آور پر بالارادہ گولی چلائی ہو جس سے وہ شدید زخمی ہو گیا تھا۔ بعض لوگ اپنی غلطی پر بہت جلد پچھتانے لگتے ہیں۔ پولیس کی تحویل میں جبار کو احساس ہوا ہو گا کہ میں نے ایک انسانی جان کو ضررِ شدید پہنچا کر بہت بڑا گناہ کیا ہے۔ اس احساسِ جرم نے اُسے اندر سے جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہو گا اور اپنے ضمیر کا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے اس نے پولیس کو سب کچھ سچ سچ بتا دیا ہو گا۔ یہ ناممکن تو نہیں ہے۔''

''ناممکن تو بہت کچھ نہیں ہے بیگ صاحب۔'' وہ یاسیت انگیز لہجے میں بولا۔ ''لیکن مجھے ایک بات کا صد فیصد یقین ہے کہ جبار سے اتفاقاً گولی چل گئی تھی۔ وہ سزائے بے گناہی کا شکار ہوا ہے۔''

''آپ کے اس صد فیصد یقین کا کوئی جواز بھی ہے؟''

''بس میرا دل کہتا ہے۔''

''اولاد کے بارے میں تمام والدین کا دل یہی زبان بولتا ہے۔'' میں نے سرسری لہجے میں کہا، پھر پوچھا۔ ''آپ نے مذکورہ حملہ آور کا نام نہیں بتایا؟''

''اُس کا نام وارث علی تھا۔''

''تھا کا مطلب کیا ہوا؟''

''وہ اب زندہ نہیں ہے۔'' فضل کریم نے بتایا۔ ''اس واقعے کے دو سال بعد وہ چل بسا تھا۔ اُس کے کندھے کا زخم تو جلدی بھر گیا تھا مگر گھٹنے کی ہڈی کا آپریشن ناگزیر ہو گیا تھا۔ آپریشن کیا گیا لیکن وہ آپریشن زیادہ کامیاب نہ رہا۔ زخم ٹھیک ہونے کی بجائے ناسور کی شکل اختیار کر گیا تھا۔ اسی ناسور نے آگے چل کر وارث علی کی جان لے لی۔ وہ اس واقعے کے بعد بالکل بجھ کر رہ گیا تھا۔ کسی سے کوئی بات نہیں کرتا تھا۔''

''اوہ!'' میں نے متاسفانہ انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ''محترم! ابھی تک آپ نے یہ نہیں بتایا کہ وارث علی کی آپ کے بیٹے سے دشمنی کیا تھی، وہ کیوں ریوالور بدست اُس پر حملہ آور ہوا تھا؟''

فضل کریم نے پُرسوچ لہجے میں جواب دیا۔ ''جبار احمد نے وارث علی کی چھوٹی بہن انیلا کو گھر سے بھگا لیا تھا۔ وہ دونوں کہیں فرار ہو گئے تھے۔''

مجھے حیرت کا ایک اور جھٹکا لگا۔ فضل کریم پے در پے انکشاف کر رہا تھا۔ انکشافات بھی

سنسنی خیز اور چونکا دینے والے تھے۔ میرا متوقع مؤکل خاصا ‘‘نیک نام’’ واقع ہوا تھا۔

میں نے استہزائیہ آمیز طنزیہ لہجے میں پوچھا۔ ‘‘اور آپ کے خیال میں اغواء کی ایک واردات خوامخواہ آپ کے لختِ جگر کے سر ڈال دی گئی تھی؟’’

‘‘نہیں، ایسی بات نہیں تھی۔’’ اُس کا جواب ذو معنی تھا۔

‘‘اس کا مطلب ہوا آپ تسلیم کرتے ہیں کہ جبار احمد نے حقیقتاً انیلا کو اغواء کیا تھا؟’’

‘‘وہ اغوا نہیں بلکہ ایک حماقت تھی جس میں انیلا اور جبار کی باہمی رضامندی شامل تھی۔’’ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ‘‘صرف جبار احمد کو ہی موردِ الزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔’’

‘‘لیکن جبار احمد کو بری الذمہ بھی نہیں سمجھا جا سکتا۔’’ میں نے کہا۔

وہ بولا۔ ‘‘مجھے یہ تسلیم ہے اسی لئے تو از خود آپ کو بتا رہا ہوں۔’’

میں نے پوچھا۔ ‘‘اور اس اغوا کیس میں جبار احمد کو کتنی سزا ہوئی تھی؟’’

‘‘ایک رات کی بھی نہیں۔’’ اُس نے جواب دیا۔

میں نے تعجب خیز نظر سے اُسے دیکھا۔ ‘‘میں سمجھا نہیں۔’’

وہ بات دراصل یہ ہے وکیل صاحب!’’ فضل کریم نے تفصیل بیان کرتے ہوئے بتایا۔

‘‘دونوں خاندانوں کو یہ بات معلوم تھی کہ جبار احمد اور انیلا ایک دوسرے کو بے پناہ چاہتے تھے۔ انیلا کے والدین کو یقین تھا کہ وہ اپنی مرضی سے جبار کے ساتھ گئی ہو گی۔ بس جی بدنامی کے ڈر سے اس واقعے کی رپورٹ ہی تھانے میں درج نہیں کروائی گئی تھی پھر سزا کا کیا سوال۔ ویسے دو ماہ کے بعد وہ دونوں واپس آ گئے تھے۔ اس کے بعد ہی وارث علی نے جبار احمد پر قاتلانہ حملہ کیا تھا اور جواباً خود زخمی ہو کر بستر سے جا لگا تھا۔’’

‘‘اور آپ کا بیٹا سات سال کے لئے جیل چلا گیا تھا؟’’ میں نے کہا۔

‘‘جی ہاں۔’’ فضل کریم نے اثبات میں سر ہلایا۔ ‘‘حالانکہ اگر وہ میری بات مان لیتا اور میری مرضی کا بیان دیتا تو یقیناً سزا سے بچ سکتا تھا۔’’

میں نے ماضی کے قصوں کو سمیٹتے ہوئے پیش آمدہ حالات کی جانب رُخ کیا اور فضل کریم سے سوال کیا۔ ‘‘آپ نے کچھ دیر پہلے بتایا تھا کہ آپ کے بیٹے کو پولیس نے ایک پچیس سالہ خوب رو عورت کے قتل کے الزام میں گرفتار کر رکھا ہے اور اس وقت وہ عدالتی ریمانڈ پر تھانے میں بند ہے۔ آپ مجھے اُس حسین و جمیل مقتولہ کا نام تو بتائیں اور یہ بھی وضاحت کریں کہ جبار احمد کی مذکورہ عورت سے کیا دشمنی تھی یا پولیس نے آپ ہی کے بیٹے کو کیوں گرفتار کیا ہے۔ جبار کا اس عورت کے قتل سے کیا تعلق ہے؟’’

وہ میرے سوالات سے بوکھلا گیا پھر گلا صاف کرتے ہوئے بولا۔ ‘‘میں اس بارے میں زیادہ نہیں جانتا جناب۔ پولیس نے محض اس بناء پر جبار کو گرفتار کیا ہے کہ وہ مقتولہ کے بنگلے پر ایک ہفتے سے مرمت کا کچھ کام کر رہا تھا اور یہ کہ جائے واردات سے پولیس کو جو رینچ پانا دستیاب ہوا ہے وہ جبار کی ملکیت ہے۔’’

‘‘اس رینچ پانے کا قتل سے بھی کوئی تعلق ہے؟’’ وہ ایک لمحے کو خاموش ہوا تو میں نے پوچھا۔

فضل کریم نے جواب دیا۔ ‘‘بیگ صاحب! اس عورت کو مذکورہ رینچ پانے ہی سے قتل کیا گیا ہے۔’’

‘‘یعنی آلہ قتل، رینچ پانا آپ کے بیٹے کی ملکیت ہے؟’’ میں نے تشویش ناک لہجے میں پوچھا۔

اس نے اثبات میں جواب دیا۔

میں نے ایک فوری خیال کے تحت سوال کیا۔ ‘‘مقتولہ کا نام بتانا شاید آپ بھول گئے ہیں۔’’

اُس نے بتایا۔ ‘‘مقتولہ کا نام انیلا صدیقی ہے۔’’

‘‘انیلا......’’ میں نے چونکتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ‘‘یعنی آپ کا مطلب......’’

وہ قطع کلامی کرتے ہوئے بولا۔ ‘‘آپ بالکل صحیح خطوط پر سوچ رہے ہیں۔ انیلا صدیقی درحقیقت وہی عورت ہے جسے ماضی میں جبار احمد نے ‘‘اغوا’’ کیا تھا اور جو جبار احمد سے بہت محبت کرتی تھی۔ جبار کے جیل جانے کے کچھ عرصے بعد انیلا نے کراچی آ کر سلطان صدیقی نامی ایک شخص سے شادی کر لی تھی اور انیلا صدیقی ہو گئی تھی۔ سلطان صدیقی کی رہائش نرسری کے علاقے میں ہے۔’’

‘‘اوہ مائی گاڈ!’’ میں نے متاسفانہ انداز میں کہا۔ ‘‘وھاٹ اے ڈینجرس گائے۔’’

‘‘جی کیا مطلب؟’’ فضل کریم نے چونک کر مجھے دیکھا۔

میں نے کہا۔ ‘‘کچھ نہیں۔ میرے کہنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ آپ کا سپوت ماشاء اللہ خاصا ‘‘ہونہار’’ ہے۔’’

وہ میرے لہجے میں پوشیدہ طنز کو محسوس کرتے ہوئے بولا۔ ‘‘بیگ صاحب! جبار احمد مجرم نہیں ہے۔ وہ دراصل تھوڑا بے وقوف ہے۔ موجودہ قتل کے کیس میں اُسے پھانسنے کے لئے کوئی گہری سازش کی گئی ہے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ وہ بے گناہ ہے۔ وہ قتل جیسا گھناؤنا

فعل کبھی نہیں کر سکتا۔''

میں نے کہا۔''آپ کو تو یہ بھی یقین ہے کہ جبار نے انیلا کو اغواء نہیں کیا تھا بلکہ وہ خود اس کے ساتھ گئی تھی۔ علاوہ ازیں آپ کے بیٹے نے وارث علی پر گولی بھی نہیں چلائی تھی۔ اسی طرح آپ اب پورے وثوق سے کہہ رہے ہیں کہ انیلا صدیقی کے قتل میں بھی اس کا کوئی ہاتھ نہیں ہے بلکہ اسے کسی گہری سازش کے تحت ملوث کیا جا رہا ہے۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟''

آخری جملہ میں نے فضل کریم کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ادا کیا تھا۔ وہ خجالت آمیز انداز میں بولا۔''مجھے یہی ڈر تھا کہ آپ کو میری بات کا یقین نہیں آئے گا اور آپ جبار احمد کا کیس لینے سے انکار کر دیں گے۔''

میں نے کہا۔''پہلی بات تو یہ کہ میں نے ابھی تک یہ کیس لینے یا نہ لینے کا کوئی فیصلہ نہیں کیا۔ مجھے جب تک ملزم کی بے گناہی کا یقین نہ ہو جائے اس وقت تک میں کوئی کیس ہاتھ میں نہیں لیتا۔ دوسری بات.....''

میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی وہ بول اُٹھا۔''بیگ صاحب! میرا بیٹا بالکل بے قصور اور بے گناہ ہے۔ آپ یقین کریں، اُسے ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت پھانسا گیا ہے۔''

''آپ کے پاس اپنے موقف کو سچا ثابت کرنے کے لئے کوئی ٹھوس ثبوت ہے؟'' میں نے ایک اہم سوال کیا۔

وہ سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔''میرا دل گواہی دیتا ہے کہ جبار کا اس قتل میں کوئی ہاتھ نہیں ہے۔ یہی سب سے بڑی صداقت ہے۔''

میں نے کہا۔''معاف کیجئے گا فضل صاحب! عدالت دل کی کہی ہوئی باتوں کو تسلیم نہیں کرتی۔ وہاں کسی بھی بات کی صداقت کو شواہد کی کسوٹی پر پرکھا اور ٹھوس ثبوتوں کی روشنی میں جانچا جاتا ہے۔''

''اس کا مطلب ہے، آپ جبار احمد کا کیس نہیں لیں گے۔'' وہ مایوسی سے بولا۔''آپ کو جبار کی بے گناہی کے لئے جس قسم کے ثبوت درکار ہیں وہ تو میں آپ کو مہیا نہیں کر سکتا البتہ آپ اپنی فیس کی فکر نہ کریں۔ میں اپنی بھری پری دُکان کو بیچ کر بھی اپنے بیٹے کو بچانے کے لئے داؤ پر لگا دوں گا۔''

میں نے کہا۔''فضل صاحب! فیس تو میں آپ سے اس وقت لوں گا جب میں آپ کے

کیس کی پیروی کرنے پر تیار ہو جاؤں گا۔''

''اور کیس کی پیروی کا فیصلہ آپ کب کریں گے؟''

''جب مجھے یقین ہو جائے گا کہ جبار احمد واقعی بے گناہ ہے۔'' میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔''یہ میرے پیشے کا اصول ہے جس پر میں کبھی سودا نہیں کرتا۔''

فضل کریم نے پوچھا۔''میں آپ کو جبار احمد کی بے گناہی کا یقین دلانے کے لئے کیا کر سکتا ہوں؟''

''مجھے آپ کے بھرپور تعاون کی ضرورت ہے۔'' میں نے کہا۔

''میں ہر قسم کے تعاون کے لئے تیار ہوں۔''

میں نے پوچھا۔''آپ جبار احمد سے ملاقات کر چکے ہیں؟''

''جی ہاں۔''

''کیا جبار نے آپ کو بتایا ہے کہ وہ ایک ہفتے تک مقتولہ کے بنگلے میں پلمبرنگ کا کیا کام کرتا رہا ہے؟'' میں نے استفسار کیا۔''وہ کس مقصد سے وہاں گیا تھا۔ وہ سلطان صدیقی کے بنگلے میں کام حاصل کرنے میں کیونکر کامیاب ہوا تھا اور اس کا رنچ پانا جائے وقوعہ پر کیوں پایا گیا تھا؟''

فضل کریم نے ایک لمحے کے تامل کے بعد جواب دیا۔ میں نے یہ تمام سوالات اور اسی نوعیت کے کئی دوسرے سوالات بھی اس سے پوچھے تھے مگر اس نے کوئی واضح جواب نہیں دیا۔''میں خود اس بارے میں بہت پریشان ہوں۔''

''صورت حال واقعی اُلجھی ہوئی اور پریشان کن ہے۔'' میں نے خیال انگیز لہجے میں کہا۔

وہ بولا۔''بیگ صاحب! آپ جبار احمد سے تھانے میں ایک ملاقات کر لیں۔ ممکن ہے، وہ آپ کو کوئی خاص بات بتا دے۔''

''یہ تو کرنا ہی پڑے گا۔'' میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔''جب تک وہ مجھے حقیقت حال سے آگاہ نہیں کرے گا، میں اس کے لئے کچھ نہیں کر سکوں گا۔''

''میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا، یہ سب ہو کیا رہا ہے۔'' وہ دونوں ہاتھوں سے پیشانی کو تھامتے ہوئے بولا۔

میں نے پوچھا۔''آپ نے بتایا ہے، جبار احمد ایک ماہ پہلے کراچی آیا تھا۔ کیا اس وقت جبار نے آپ کو بتایا تھا کہ وہ کون سے مشن پر روانہ ہوا تھا؟''

"اُس نے مجھے اتنا ہی بتایا تھا کہ روزگار کے سلسلے میں کراچی جا رہا ہے۔"

"انیلا کے حوالے سے کوئی بات نہیں ہوئی تھی؟"

"بالکل نہیں۔" وہ قطعیت سے بولا۔ "اگر وہ ایسا کوئی ذکر کرتا تو میں اُسے فوراً روک دیتا، اُسے کبھی بھی کراچی کا رُخ نہیں کرنے دیتا۔"

"اس کا مطلب ہے، آپ کے علم میں یہ بات موجود تھی کہ انیلا حیدر آباد سے سیدھی کراچی آئی تھی۔" میں نے سوال کیا۔

وہ بولا۔ "یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ وہاں حیدر آباد میں محلے کے اکثر لوگ جانتے ہیں کہ انیلا اپنے والدین کے ساتھ کراچی آ گئی تھی۔ یہاں کورنگی میں انیلا کا چچا رہتا تھا۔ وہ لوگ سیدھے کورنگی ہی پہنچے تھے مگر یہ پانچ سال پہلے کی بات ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "آپ کے کچھ رشتے دار کراچی میں بھی رہتے ہیں؟"

"نہیں جناب، یہاں ہمارا کوئی نہیں رہتا۔"

"پھر جبار احمد نے کہاں قیام کر رکھا تھا؟"

فضل کریم نے جواب دیا۔ "مجھے یہاں آ کر پتہ چلا ہے کہ وہ اعظم بستی کے ایک کوارٹر میں رہائش پذیر تھا۔ پولیس نے جبار کو اسی کوارٹر سے گرفتار کیا ہے اور وہ تو ایک عجیب سی بات بھی بتاتے ہیں۔" وہ خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگا۔

میں نے جلدی سے پوچھا۔ "کون سی عجیب بات؟"

وہ سنی ان سنی کرتے ہوئے خواب ناک لہجے میں بولا۔ "یہ پولیس والے بھی جانے کیسی کیسی داستانیں تیار کر لیتے ہیں۔ بھلا جبار احمد کو خودکشی کرنے کی ضرورت کیوں کر پیش آ سکتی تھی؟"

ان یکے بعد دیگرے انکشافات نے میری دلچسپی کو دو چند بڑھا دیا تھا، میں نے فوراً پوچھا۔ "یہ خودکشی کا کیا معاملہ ہے بھئی؟"

"پولیس والوں کا کہنا ہے۔" فضل کریم خلا میں گھورتے ہوئے بولا۔ "جب انہوں نے جبار احمد کو اعظم بستی والے کوارٹر سے گرفتار کیا تو وہ خودکشی کرنے جا رہا تھا۔ کمرے کے اندر عین وسط میں ایک کرسی رکھی ہوئی تھی۔ اس کرسی پر جبار احمد کھڑا تھا اور اوپر چھت میں پنکھے کے کنڈے سے باریک اور مضبوط نائیلون کی ایک ڈوری جھول رہی تھی جس کے زیریں سرے پر پھانسی کا پھندا موجود تھا۔ اگر پولیس والوں کو وہاں پہنچنے میں ذرا تاخیر ہو جاتی تو جبار احمد اس موذی پھندے کو اپنی گردن میں ڈال کر کرسی کو پاؤں مار کر گرا چکا ہوتا۔ پھر

پولیس والوں کو وہاں اُس کی جھولتی ہوئی لاش ہی ملتی۔"

میں نے پوچھا۔ "جبار احمد کو کس تھانے میں رکھا گیا ہے؟"

میرے اندر جبار احمد کے بارے میں ایک عجیب سا تجسس بھڑک اُٹھا تھا۔ پہلے میں نے یہی سوچا تھا کہ دوسرے روز عدالتی بکھیڑوں سے فارغ ہو کر جبار سے ملنے جاؤں گا لیکن اب میری خواہش تھی کہ گھر جانے سے قبل اُس سے ملاقات ضرور کر لوں۔

میرے استفسار پر فضل کریم نے متعلقہ تھانے کا نام بتایا۔ میں نے اُس سے کہا۔ "اب آپ کا کیا ارادہ ہے۔ کراچی میں ہی قیام کریں گے یا واپس حیدر آباد جائیں گے؟"

"اگر آپ ضروری سمجھتے ہیں تو میں کسی ہوٹل میں ٹھہر جاتا ہوں۔"

"مجھے کل شام میں آپ کی ضرورت پڑے گی۔"

"پھر تو میں واپس ہی چلا جاتا ہوں۔" فضل کریم نے کہا، پھر پوچھا۔ "ویسے آپ جبار احمد سے ملنے تھانے کب جائیں گے؟"

میں نے جواب دیا۔ "میں اُس سے کل ہی مل سکوں گا۔" میں نے دانستہ جھوٹ بولا تھا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ اگر میں فضل کریم کو یہ بتا دیتا کہ میں ابھی اور اسی وقت جبار احمد کے پاس جانے والا ہوں تو وہ بھی میرے ساتھ ضرور تھانے جاتا۔ یہی میں چاہتا نہیں تھا۔

وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ "تو بیگ صاحب! کل میں کتنے بجے تک حاضر ہو جاؤں؟"

"چار بجے تک آ جائیں۔"

وہ اپنی جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے بولا۔ "کچھ ایڈوانس رقم فیس کی مد میں رکھ لیں۔ باقی بعد میں دیکھ لیں گے۔"

میں نے جلدی سے کہا۔ "اس کی ضرورت نہیں ہے فضل صاحب! فیس میں آپ سے ایڈوانس ہی لوں گا اور پوری لوں گا، پہلے مجھے کسی فیصلے پر پہنچ جانے دیں۔"

"ٹھیک ہے۔" اُس نے جیب سے ہاتھ نکال لیا۔ "میرا خیال ہے جبار احمد سے ملاقات کے بعد ہی آپ کسی فیصلہ کن نتیجے پر پہنچیں گے؟"

"جی ہاں، بالکل۔" میں نے مختصراً کہا۔

اُس نے میرا شکریہ ادا کیا اور مصافحہ کرنے کے بعد رخصت ہو گیا۔ میں اپنے دیگر کلائنٹس کو جلدی جلدی فارغ کرنے لگا۔ جب فضل کریم میرے دفتر میں آیا تھا تو بس میں جانے کی تیاری ہی کر رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ میرا آخری ملاقاتی ثابت ہو گا لیکن اس

سے گفتگو کے دوران میں دو تین مزید کلائنٹس میرے دفتر کی انتظار گاہ میں جمع ہو چکے تھے۔

جب میں متعلقہ تھانے پہنچا تو رات کے آٹھ بج رہے تھے۔

اس تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں ہے کہ میں نے کس طرح ملزم جبار احمد سے ملاقات کی۔ ریمانڈ کی مدت کے دوران میں ملزم سے ملنے کی راہ میں کون کون سی دُشواریاں پیش آتی ہیں۔ پولیس والوں کو کس طرح رام کیا جاتا ہے۔ پیار، محبت اور دھونس دھاندلی کا استعمال کن مواقع پر کیا جاتا ہے، میں یہ ساری باتیں بالتفصیل کئی بار لکھ چکا ہوں۔

قصہ مختصر، جبار احمد سے ایک طویل ملاقات کے بعد مجھے جو معلومات حاصل ہوئیں ان کا خلاصہ میں آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں تاکہ عدالتی کارروائی کے دوران میں آپ کا ذہن کسی اُلجھن کا شکار نہ ہو۔ ایک بات کی وضاحت کرتا چلوں کہ ان میں سے بہت سی باتیں مجھے بعد میں معلوم ہوئی تھیں لیکن واقعات کے تسلسل کا خیال رکھتے ہوئے پہلے بیان کی جا رہی ہیں۔ اسی طرح بعض باتیں میں دانستہ گول کر رہا ہوں جن کا ذکر عدالتی کارروائی کے دوران میں مناسب موقع پر آئے گا۔

☆......☆
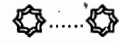
جبار احمد اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا تھا۔ وہ پڑھائی میں زیادہ دلچسپی نہیں لیتا تھا۔ چنانچہ اس کی نالائقیوں سے تنگ آ کر فضل کریم نے اُسے اپنے ساتھ کپڑے کی دُکان پر لے جانا شروع کر دیا تھا۔ وہ مڈل سے آگے نہیں پڑھ سکا تھا۔ رفتہ رفتہ اُس نے کپڑے کی خرید و فروخت کے معاملات کو بہ طریق احسن سمجھنا شروع کر دیا اور چند ہی سال میں وہ ماہر دُکان دار بن گیا۔ اب زیادہ تر وقت وہی دُکان پر نظر آتا تھا البتہ فضل کریم نے دُکان پر جانا نہیں چھوڑا تھا۔ بس وہ دوپہر میں دو تین گھنٹے آرام کے لئے گھر چلا جاتا تھا۔

انیلا سے جبار احمد کی پہلی ملاقات ''الحمد کلاتھ ہاؤس'' پر ہی ہوئی تھی۔ وہ کالج سے واپسی پر ایک کپڑے کا بھاؤ معلوم کرنے کے لئے تھوڑی دیر اُس کی دُکان پر رُک گئی تھی۔ اس وقت فضل کریم دُکان پر موجود نہیں تھا۔ جبار نے پہلی نظر ہی میں انیلا کو پسند کر لیا تھا۔ انیلا فرسٹ ایئر کی طالبہ تھی۔ کالج کی یونیفارم میں وہ جبار کی نظر کو کچھ زیادہ ہی بھا گئی تھی۔ وہ چاؤ چاؤ سے انیلا کو مختلف تھان کھول کھول کر دکھانے لگا۔ وہ جو محض کپڑے کا بھاؤ پوچھنے آئی تھی، جاتے وقت ایک سوٹ کا کپڑا بھی خرید کر لے گئی تھی جس کی ادائیگی اُسے دوسرے روز کرنا تھی۔ ایک ہی محلے کی بات تھی اس لئے انیلا کو اُدھار دیتے ہوئے زیادہ محسوس نہ ہوا۔ جبار احمد کا تو حال یہ تھا کہ اس وقت اگر انیلا پوری دُکان بھی لوٹ کر لے جاتی تو اُسے کوئی

افسوس نہ ہوتا۔ گویا وہ دل و جان ہار بیٹھا تھا، ایک دُکان اس کیفیت میں بھلا کیا حیثیت رکھتی تھی۔

دوسرے روز حسب وعدہ انیلا نے ایک سوٹ کے کپڑے کی قیمت ادا کر دی۔ جبار رقم لینے کو تیار نہیں تھا لیکن انیلا کے اصرار کو دیکھتے ہوئے اُس نے زیادہ ضد نہیں کی۔ پھر اکثر یہ ہونے لگا کہ جب بھی ان کا سامنا ہوتا، وہ مسکراتی ہوئی آنکھوں سے ایک دوسرے کو دیکھتے۔

جبار احمد تو سچے دل سے انیلا پر عاشق ہو گیا تھا۔ انیلا کے رویئے سے بھی یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ بھی اُسے پسند کرنے لگی تھی۔ پھر ایک روز انہوں نے ایک دوسرے پر اپنی پسندیدگی کا اظہار کر دیا۔ اس کے بعد تمام مراحل محبت پلک جھپکتے میں طے ہو گئے۔

جب اُن کی محبت جنون میں داخل ہونے لگی تو سب پر عیاں ہو گئی۔ انیلا کا بڑا بھائی وارث علی آتش زیر پا ہو گیا اور جبار احمد کو مزہ چکھانے کی تاک میں رہنے لگا۔ اسی دوران میں جبار نے اپنے والدین کے توسط سے اپنا رشتہ انیلا کے گھر بھیجا۔ دوسری جانب سے شدید ترین ردِعمل کا اظہار کیا گیا۔ بہ الفاظ دیگر انیلا کے والدین نے فضل کریم اور اُس کی بیوی کو خوب کھری کھری سنا کر رخصت کیا۔ وہ دونوں مایوس و نامراد واپس لوٹ آئے۔

ان دنوں انیلا انٹرمیڈیٹ کے امتحانات سے فارغ ہو چکی تھی اور کالج بند تھے۔ والدین نے اُس کے گھر سے نکلنے پر پابندی لگا دی تھی اور وارث علی اس پر خصوصی نظر رکھتا تھا۔ مگر وہ پھر بھی موقع تاک کر چوری چھپے جبار سے ملنے دُکان پر پہنچ جاتی تھی۔ انیلا کی عمر اس وقت اٹھارہ سال تھی جب کہ جبار احمد لگ بھگ تیئس سال کا تھا۔ اس عمر کی محبت میں بڑی کشش ہوا کرتی ہے۔ محبت کرنے والے پہاڑوں سے ٹکرانے کا عزم رکھتے ہیں اور آنکھیں بند کر کے بے خوف و خطر بڑی سے بڑی مصیبت میں کود پڑتے ہیں۔ اس دوران میں محبت کے متوالوں کی جتنی سخت مخالفت کی جاتی ہے، ان کی محبت اتنی ہی شدت اختیار کر جاتی ہے۔

جبار احمد اور انیلا نے جب واضح طور پر محسوس کیا کہ سیدھے طریقے سے ان کا ملاپ ممکن نہیں ہے تو انہوں نے گھر سے بھاگنے کا فیصلہ کر لیا۔ پھر ایک روز وہ دونوں حسب پروگرام لیاقت اشرف کالونی حیدر آباد سے غائب ہو گئے۔ دونوں گھرانوں کو ان کے تعلقات کی نوعیت کا علم تھا اس لئے بدنامی اور رُسوائی کے ڈر سے تھانے میں رپورٹ درج نہیں کرائی گئی اور ان کی واپسی کا انتظار کیا جانے لگا...... خاموش انتظار!

تقریباً دو ماہ بعد وہ واپس لوٹے تھے۔

جبار احمد نے مجھے بتایا کہ یہ دو ماہ انہوں نے نواب شاہ میں گزارے تھے۔ نواب شاہ

میں جبار کا ایک دوست ادریس احمد رہتا تھا۔ وہاں اُس کا ایک بہت بڑا جنرل اسٹور تھا۔ جبار احمد نے ادریس کو ساری صورتِ حال سے آگاہ کیا اور اُسے اعتماد میں لے لیا۔ پھر اُسی کے توسط سے ان دونوں نے فوراً شادی کر لی۔ ان کا خیال تھا کہ کچھ عرصے بعد جب وہ واپس حیدر آباد جائیں گے تو انہیں میاں بیوی کی حیثیت سے تسلیم کرلیا جائے گا لیکن ہوا اس کے بالعکس۔

جبار احمد سیدھا اپنے گھر نہیں گیا تھا۔ اُس نے چند روز اپنے ایک دوست کے یہاں رُک کر حالات کا جائزہ لینے کا پروگرام بنایا تھا۔ اُس کا مذکورہ دوست منظور علی کھوکھر محلہ میں رہتا تھا اور اسٹیشن روڈ پر اُس کا ایک چھوٹا سا ہوٹل تھا۔ اُس نے ابھی تک شادی نہیں کی تھی۔ جبار نے منظور علی کو بھی تاکید کردی تھی کہ وہ فی الحال ان کی شادی اور وہاں ان کی موجودگی کو پوشیدہ رکھے۔ مناسب وقت آنے پر وہ خود ہی سامنے آجائیں گے۔

یہی جبار احمد کی بھول تھی۔ اگر وہ خطرات مول لے کر گھر سے بھاگ ہی گئے تھے تو انہیں واپسی کا رُخ نہیں کرنا چاہئے تھا اور اگر واپس بھی آ گئے تھے تو انہیں چوروں کی طرح چھپ کر حالات کا جائزہ لینے کے بجائے بہادری کے ساتھ ان حالات کا مقابلہ کرنا چاہئے تھا۔ وہ دونوں باہمی رضامندی سے شادی کر چکے تھے اور اب میاں بیوی تھے اس لئے زیادہ فکرمندی کی کوئی بات نہیں تھی۔ چند روز کے بعد انیلا کے والدین کا غصہ ٹھنڈا ہو جاتا اور وہ مجبوراً ان کے رشتے کو تسلیم کر لیتے یا پھر وہ ہمیشہ کے لئے اپنی بیٹی سے قطع تعلق کر لیتے۔

منظور علی کے گھر میں مقیم ہوئے ابھی دو روز ہی گزرے تھے کہ کسی طرح وارث علی کو ان کی واپسی اور روپوشی کی خبر مل گئی۔ وہ تو پہلے ہی ادھار کھائے بیٹھا تھا۔ اس نے کہیں سے ایک ریوالور حاصل کیا اور ان دونوں کو جہنم واصل کرنے کھوکھر محلّہ پہنچ گیا۔ وہ شام کا وقت تھا اور منظور علی اس وقت اپنے ہوٹل پر تھا۔ گھر میں انیلا اور جبار موجود تھے۔

وارث علی غصے کے عالم میں اُن دونوں کو قتل کرنے کے ارادے سے نکلا تھا لیکن وہاں پہنچ کر جو حالات پیش آئے اس نے وارث علی کا سارا پروگرام غتربود کر دیا۔

جبار احمد، وارث علی کو دیکھ کر پہلے تو گھبرا گیا لیکن پھر اُس نے کسی خیال کے تحت اُسے گھر کے اندر بلا لیا۔ وہ وارث علی کو گھر کے اندر بٹھا کر ساری صورتِ حال سے آگاہ کرنا چاہتا تھا مگر اندر پہنچتے ہی وارث علی نے ایک طوفان کھڑا کر دیا۔ انیلا بھی فوراً ان کے قریب آ گئی۔ وارث علی، جبار احمد کو مغلظات میں تول رہا تھا۔ انیلا نے بیچ میں آنے کی کوشش کی تو وارث علی نے اُسے ایک زوردار چانٹا رسید کر دیا۔ یہ دیکھ کر جبار احمد بھی مشتعل ہو گیا پھر ان

دونوں میں باقاعدہ ہاتھا پائی ہونے لگی۔ اسی دوران میں وارث علی نے ریوالور نکال لیا لیکن جبار احمد اُسے گولی چلانے کا موقع نہیں دے رہا تھا۔ اسی چھینا جھپٹی میں ریوالور، وارث علی کے ہاتھ سے نکل کر دُور جا گرا۔

جبار احمد، وارث علی کی طرف سے تھوڑی دیر کے لئے غافل ہوا تو اُس نے جبار کو داؤ مار کر زمین پر گرا دیا پھر اُس کے سینے پر سوار ہو کر اس کا گلا دبانے لگا۔

''تمہارے لئے تو میرے یہ دونوں ہاتھ ہی کافی ہیں۔'' وارث علی اپنے ہاتھوں کی گرفت کو سخت کرتے ہوئے جنونی انداز میں چیخا۔ ''میں تمہارا سارا عشق آج ناک کے راستے نکال دوں گا۔''

جبار اُس کے مقابلے میں کوئی مٹی کا مادھو تو نہیں تھا۔ بس اس وقت وہ وارث علی کے داؤ پر آ گیا تھا۔ اُس نے انیلا کو مخاطب کر کے خرخراتی ہوئی آواز میں کہا۔

''انیلا! وہ ریوالور اٹھا لو اور فوراً جا کر منظور علی کو بلا لاؤ۔''

انیلا نے جبار کے کہنے پر ریوالور تو اٹھا لیا مگر وہاں سے گئی نہیں بلکہ وہ وارث علی کو مخاطب کرتے ہوئے بولی۔

''بھائی! ان کو چھوڑ دیں۔ ہم نے کوئی گناہ نہیں کیا۔''

''ہاں، تم دونوں ابھی ابھی حج کر کے لوٹے ہو۔'' وارث علی نے تیز لہجے میں کہا۔ اُس کے ہاتھ بدستور جبار احمد کی گردن کو دبوچے ہوئے تھے۔

انیلا نے کہا۔ ''آپ میری بات تو سنیں۔ میں آپ کو سب کچھ بتاتی ہوں۔ شاید آپ کسی غلط فہمی کا شکار ہو گئے ہیں۔''

''مجھے کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی۔'' وہ پھنکارا۔ ''میں آج تم دونوں کو نیست و نابود کر دوں گا۔ اس حرامی کے بعد تمہاری باری ہے۔''

انیلا گڑگڑائی۔ ''خدا کے واسطے بھائی۔ ان کا کوئی قصور نہیں ہے۔ آپ ان کو چھوڑ دیں اور ہمیں صفائی پیش کرنے کا موقع تو دیں۔''

''تمہیں اپنے یار کی بڑی فکر لگی ہوئی ہے۔'' وارث علی نے انیلا کو گھورتے ہوئے خونخوار لہجے میں کہا۔ ''میں اس بدذات کو تمہاری آنکھوں کے سامنے موت کے گھاٹ اتار دوں گا۔ تم دیکھتی جاؤ۔''

انیلا نے دیکھا، جبار احمد کا چہرہ سرخ انگارہ ہو رہا تھا اور اس کی آنکھیں باہر کو اُبل پڑ رہی تھیں۔ وہ چیختے ہوئے بولی۔

"وارث علی! میں کہتی ہوں ان کے اوپر سے اتر جاؤ ورنہ میں گولی چلا دوں گی۔"

"اس مردود کی خاطر بھائی پر گولی چلاؤ گی؟"

"یہ میرے لئے بہت اہم ہیں۔"

"تو پھر چلاؤ گولی۔" وارث علی نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ "میں بھی تو دیکھوں کہ تمہارے عشق میں کتنی صداقت ہے۔"

انیلا نے بے بسی سے کہا۔ "میری بات کو مذاق نہ سمجھو وارث! میں واقعی گولی چلا دوں گی۔" اس کا عاشق شوہر اس وقت لب دم تھا۔

"میں نے کہا نا، چلاؤ گولی۔"

اور انیلا نے گولی چلا دی...... ایک دہکتا ہوا انگارا سا وارث علی کے دائیں کندھے میں اتر گیا۔ وہ تکلیف کی شدت سے دوہرا ہو گیا۔ جبار کی گردن پر سے اُس کے ہاتھوں کی گرفت چھوٹ گئی۔

جبار احمد پھڑپھڑایا اور دونوں ہاتھوں سے اپنی گردن کو مسلنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی وہ تیز تیز سانس بھی لے رہا تھا۔ اس دوران میں وارث علی قدرے سنبھل چکا تھا اور دوبارہ جبار احمد کی طرف بڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ انیلا نے کوئی رسک لینا مناسب نہ سمجھا اور دوسرا فائر کر دیا۔ اس مرتبہ گولی وارث علی کے بائیں گھٹنے کو چکنا چور کر گئی تھی۔ اُس کے حلق سے ایک دلخراش چیخ برآمد ہوئی اور وہ بائیں ٹانگ کو تھام کر زمین پر تڑپنے لگا۔ اُس کے منہ سے بلند و بانگ کراہیں خارج ہو رہی تھیں۔

انیلا سکتے کے سے عالم میں کھڑی وہ منظر دیکھ رہی تھی۔ جبار احمد اُس کے پاس پہنچا اور جھپٹ کر اُس کے ہاتھ سے ریوالور چھین لیا۔ پھر اُسے جھنجھوڑتے ہوئے بولا۔

"آج تمہیں مجھ سے ایک وعدہ کرنا ہو گا انیلا۔ بولو، کرو گی؟"

"ہاں، کروں گی۔" وہ سحر زدہ آواز میں بولی۔

"یہاں جو کچھ ہو چکا ہے اس کے بعد پولیس کی مداخلت لازمی بات ہے۔" جبار احمد نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ "میں پولیس کو جو بیان دوں گا، تم اس کی تصدیق کرو گی۔"

"آپ جو کہیں گے، میں وہی کروں گی۔"

"وارث علی پر تم نے نہیں، میں نے گولی چلائی ہے۔"

"لیکن اس طرح تو پولیس آپ کو گرفتار کر لے گی؟" وہ تشویش بھرے لہجے میں بولی۔

جبار احمد نے کہا۔ "دوسری صورت میں پولیس تمہیں اپنے ساتھ لے جائے گی اور یہ

مجھے کسی صورت گوارا نہ ہو گا۔"

"تو کیا میں آپ کی گرفتاری گوارا کر لوں گی؟"

"بس تھوڑے دنوں کی بات ہو گی۔" جبار احمد نے جذباتی لہجے میں کہا۔ "پھر میں واپس آ جاؤں گا اور سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

اس دوران میں وارث علی تکلیف کی شدت سے بے ہوش ہو گیا تھا۔ انیلا نے اپنے حملہ آور بھائی کے بے حس و حرکت جسم کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "اس کو زخمی کرنے کی گناہ گار میں ہوں، سزا بھی مجھے ہی ملنی چاہئے۔"

"انیلا! میری بات غور سے سنو۔" وہ اُس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔ "تم نے میری جان بچانے کے لئے اپنے بھائی پر گولی چلائی تھی۔ اب میں تمہاری جان بچانے کے لئے خود کو پولیس کے حوالے کروں گا۔ میں نے ریوالور پر سے تمہاری انگلیوں کے نشانات بھی صاف کر دیئے ہیں۔ لو دیکھو، اب یہ میرے ہاتھ میں ہے، اور میں نے اس ریوالور سے تمہارے بھائی پر فائرنگ کی ہے۔ یاد رکھنا۔"

وہ ہاتھوں میں منہ چھپا کر رونے لگی۔ اسی وقت باہر دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی۔ جبار نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ "لوگ فائرنگ کی آواز سن کر اس طرف آ رہے ہیں۔ تھوڑی دیر میں پولیس بھی آ جائے گی۔ تمہیں وہی بیان دینا ہو گا جو میں نے بتایا ہے۔ وارث علی پر تم نے نہیں، میں نے گولی چلائی تھی۔ سمجھ گئیں؟"

انیلا نے کہا۔ "یہ بیان بھی تو دیا جا سکتا ہے کہ آپ دونوں کی چھینا جھپٹی میں ریوالور خود بخود چل گیا تھا اور وارث علی اتفاقاً یا حادثاتی طور پر زخمی ہو گیا تھا، اس طرح آپ قانون کی گرفت میں بھی نہیں آئیں گے۔"

"ہاں، میں نے اس بارے میں بھی غور کیا تھا۔" جبار احمد نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "مگر اس میں کچھ پیچیدگیاں ہیں۔ ہم ایسا بیان دے کر خود پھنس جائیں گے۔ ابھی تمہیں تفصیلاً بتانے کا وقت ہے اور نہ ہی موقع۔ فی الحال تم وہی کرو گی جو میں کہہ رہا ہوں۔ تمہارا بھائی میری فائرنگ سے شدید زخمی ہوا ہے۔ تم نے ریوالور کو ہاتھ تک نہیں لگایا۔"

وہ متامل نظر سے جبار احمد کو دیکھنے لگی۔

جبار احمد نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "تمہیں میری قسم انیلا!"

اسی وقت بیرونی دروازے پر دستک سنائی دی۔ جبار احمد نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ بہت سے لوگ سوالیہ نظروں سے گھر کے اندر جھانکنے لگے۔ جبار احمد نے انہیں مختصراً بتایا

کہ وہاں کیا واقعات پیش آ چکے ہیں۔ کسی مستعد پڑوسی نے فائرنگ کی آواز سنتے ہی پولیس کو فون کر دیا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد زخمی وارث علی کو ہسپتال پہنچا دیا گیا۔ جبار احمد اور انیلا کو پولیس اپنے ساتھ تھانے لے گئی۔

ایک روز بعد انیلا کو اُس کے والدین کے حوالے کر دیا گیا اور جبار احمد تھانے سے کورٹ اور کورٹ سے سات سال کی سزا سن کر جیل چلا گیا۔ جبار احمد کے والد فضل کریم نے اس سزا کو ختم کروانے یا کم کروانے کے لئے تگ و دو کی لیکن جبار کے اقراری بیان نے اس کی تمام کوششوں کو خاک میں ملا دیا۔

میں نے جب جبار احمد سے پوچھا کہ اس نے ایک ناکردہ جرم کو خوامخواہ اپنے سر کیوں لے لیا تھا تو اُس نے بتایا کہ وہ اس وقت فوری طور پر انیلا کے لئے بہت پریشان ہو گیا تھا۔ وہ انیلا کو دل و جان سے چاہتا تھا اور اُسے کسی چھوٹی سے چھوٹی مصیبت میں بھی گرفتار نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اتفاقی طور پر گولی چلنے والی کہانی میں زیادہ جان نہیں تھی۔ مضروب وارث علی کا بیان اس کہانی کو باطل ثابت کر سکتا تھا۔ اسے وارث علی سے ذرا بھی توقع نہیں تھی کہ وہ اپنی بہن سے کسی ہمدردی کا اظہار کرے گا۔ وہ ان دونوں کی جان کا دشمن بنا ہوا تھا اور شدید زخمی ہونے کے بعد تو اس کی دشمنی دوچند ہو جانا تھی۔ فوری طور پر جبار احمد کی سمجھ میں یہی ترکیب آئی تھی کہ وہ سارا ملبہ اپنے اوپر لے لے۔ اس طرح انیلا صاف بچ جاتی۔ پھر اس نے وہی کیا جو سوچا تھا۔ انیلا کو وہ پہلے ہی اپنی قسم کا پابند بنا چکا تھا۔ اُس نے جاتے جاتے انیلا سے یہ وعدہ بھی لے لیا تھا کہ وہ خاموشی سے اس کی واپسی کا انتظار کرے گی اور شادی کا راز بھی اپنے سینے میں پوشیدہ رکھے گی۔

انیلا اور جبار احمد کی شادی سے صرف چار افراد واقف تھے۔ دو افراد تو وہ خود ہی تھے اور دوسرا حیدر آباد والا دوست منظور علی جس کے گھر میں وہ واقعہ پیش آیا تھا۔ اویس احمد کے بارے میں پولیس کچھ نہیں جانتی تھی البتہ انہوں نے منظور علی کو خاصا پریشان کیا۔ اس نے کچھ دے دلا کر جان چھڑا لی مگر دوست کے راز کو سینے ہی میں دفن رکھا۔ حتیٰ کہ اُس کے والدین کو بھی اس بارے میں کچھ نہیں بتایا۔

اس بات سے بحث نہیں ہے کہ جبار احمد نے جو کچھ بھی کیا وہ اس کی حماقت تھی یا عقل مندی۔ میرے نزدیک وہ خدشات میں گھرا ہوا ایک شکی اور وہمی شخص تھا۔ اگر وہ انیلا سے اپنی شادی کو چھپانے کی بجائے عام کر دیتا تو ان ناگفتہ بہ حالات کا شکار نہ ہوتا جو اُسے قتل کے ملزم کے طور پر گرفتار کروا چکے تھے۔ یہ انیلا سے اُس کی حد سے زیادہ بڑھی ہوئی محبت تھی

جس نے اُسے اندیشوں کا اسیر بنا لیا تھا۔

جبار احمد جیل سے باہر آیا تو اُس کی دنیا ہی بدل چکی تھی۔ انیلا کے زخمی بھائی وارث علی کا انتقال ہو چکا تھا اور انیلا اپنے والدین کے ساتھ حیدر آباد کو خیر باد کہہ چکی تھی۔ خود جبار احمد کی والدہ حدیقہ بانو بھی اپنے بیٹے کے غم میں چل بسی تھی۔

جبار احمد اپنے دیرینہ دوست منظور علی سے ملا اور انیلا کے بارے میں اُسے ٹٹولنے لگا۔ منظور علی نے اپنے وسائل سے معلوم کر کے اُسے بتایا کہ منظور احمد کے جیل جانے کے دو سال بعد انیلا کے والدین اُسے لے کر کراچی چلے گئے تھے۔ جبار کو یہ بات معلوم تھی کہ کراچی میں انیلا کا چچا سلیم الدین کورنگی کے علاقے میں رہتا تھا۔ جبار نے انیلا کی تلاش میں کراچی جانے کا فیصلہ کر لیا۔

جیل میں قیام کے دوران میں قتل کے ایک قیدی عمر جان سے اُس کی اچھی خاصی دوستی ہو گئی تھی۔ عمر جان اے کلاس پلمبر تھا اور ایک ایسے شخص کو قتل کر کے وہ جیل پہنچا تھا جس نے اُس کی بیٹی گل جان کی عزت خراب کی تھی۔ عمر جان سے جیل میں پلمبرنگ کا ہر قسم کا کام لیا جاتا تھا۔ اُس نے جبار احمد کو بھی اس کام میں طاق کر دیا تھا۔ جبار احمد جب رہا ہوا تو جیلر نے خاص طور پر اُسے تحفے میں ایک کٹ دی تھی جس میں پلمبرنگ میں استعمال ہونے والے تمام چھوٹے بڑے اوزار موجود تھے۔ اس کے ساتھ ہی جیلر نے اُس کے لئے نیک خواہشات کا اظہار بھی کیا تھا۔ جبار احمد نے بھی پلمبرنگ کے پیشے کو مستقلاً اپنانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اُسے اس کام سے کچھ اُنسیت سی ہو گئی تھی۔

جب جبار احمد انیلا کی تلاش میں کراچی آنے لگا تو اُس نے اپنے والد فضل کریم کو بھی بتایا تھا کہ وہ اب یہی کام کرے گا۔ حالانکہ اُس کے والد نے بہت زور مارا تھا کہ وہ کپڑے کی دُکان کو ہی سنبھالے مگر وہ نہیں مانا تھا۔

چند ہی روز میں جبار احمد نے انیلا کا سراغ لگا لیا۔ اُس کے والد امیر الدین نے حسب روایت کورنگی میں پان سگریٹ کی دُکان بنا لی تھی اور سب سے قیامت خیز اطلاع یہ تھی کہ تین سال قبل انیلا کی شادی ہو چکی تھی۔

جیل سے رہا ہونے کے بعد جبار احمد خاصا متحمل اور بردبار بن چکا تھا۔ اُس نے اس جاں سوز خبر کو مردانہ وار برداشت کیا اور انیلا سے مل کر اس عہد شکنی کی وجہ معلوم کرنے کا فیصلہ کیا۔ نرسری میں سلطان صدیقی کا بنگلا تلاش کرنے میں اُسے کوئی دقت پیش نہ آئی۔ اُس نے سب سے پہلے قریبی مارکیٹ میں ''حاجی سینیٹری ورکس'' پر اپنا تعارف کروایا اور کام کے

لئے درخواست کی جو دوسرے روز ہی منظور کر لی گئی۔ رہائش کے لئے اُس نے اعظم بستی میں ایک کوارٹر کرائے پر حاصل کرلیا تھا۔ فارغ اوقات میں وہ سلطان صدیقی کی آمد و شد پر نظر رکھنے لگا۔

ایک روز وہ موقع پا کر مذکورہ بنگلے پر پہنچ گیا۔ اُسے یقین تھا کہ اس وقت بنگلے کا مالک سلطان صدیقی گھر میں موجود نہیں تھا۔ اُس نے اطلاعی گھنٹی بجائی تو ایک ادھیڑ عمر ملازمہ گیٹ پر آئی۔ اُس نے ملازمہ کو بتایا کہ وہ اس بنگلے کی مالکن انیلا صدیقی سے ملنا چاہتا تھا۔

''مگر آپ کون ہیں؟'' ملازمہ نے سوال کیا۔ ''میں مالکن کو جا کر کیا بتاؤں؟''

''اُن سے کہیں کہ اُن کا ایک بچھڑا ہوا رشتے دار ملنے آیا ہے۔''

''بچھڑا ہوا رشتے دار؟'' ملازمہ متعجب ہوئی۔ ''آپ کہاں سے آئے ہیں؟''

جبار احمد نے بتایا۔ ''حیدر آباد سے۔''

''اور آپ کا نام کیا ہے؟''

''تم صرف بچھڑا ہوا رشتے دار بتاؤ۔ وہ سمجھ جائیں گی۔'' جبار احمد نے کہا۔ ''نام وغیرہ کی ضرورت نہیں ہے۔''

ملازمہ پہلے تو حیرت سے اُسے دیکھتی رہی پھر ''اچھا جی، بلاتی ہوں۔'' کہہ کر بنگلے کے اندر غائب ہوگئی۔ تھوڑی دیر کے بعد انیلا بہ نفس نفیس گیٹ پر موجود تھی اور جبار کو اپنے سامنے کھڑے دیکھ کر ششدر کھڑی تھی۔

جبار احمد نے نرم لہجے میں پوچھا۔ ''کیوں، مجھے زندہ دیکھ کر حیرت ہو رہی ہے؟''

''ہوں...'' وہ چونک گئی۔ ''آ...... آپ کو...... یہاں کا ایڈریس کس نے دیا؟''

''ڈھونڈنے والے کو تو خدا بھی مل جاتا ہے۔'' جبار نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

''میرا مطلب ہے، آپ کو یہاں نہیں آنا چاہئے تھا۔'' انیلا گیٹ سے باہر دائیں بائیں دیکھتے ہوئے بولی۔

''اس لئے نا کہ تم اب ایک شادی شدہ عورت ہو؟'' جبار کے لہجے میں ہلکا سا طنز پنہاں تھا۔

انیلا جلدی سے بولی۔ ''ٹھہریں، یہاں گیٹ پر کھڑے ہو کر بات کرنا مناسب نہیں ہے۔ آپ اندر آ جائیں۔''

پھر وہ جبار احمد کو بنگلے کے ڈرائنگ روم میں لے گئی۔ بنگلے کی اندرونی حالت اور سجاوٹ سے اندازہ ہوتا تھا کہ انیلا کا شوہر ایک صاحب حیثیت اور صاحب ذوق شخص تھا۔

انیلا نے جبار احمد کو ڈرائنگ رُوم میں بٹھایا اور کہا۔ ''آپ کو جو کچھ بھی کہنا ہے وہ جلدی سے کہہ دیں اور یہاں سے چلے جائیں۔''

''تم اچھی طرح جانتی ہو، میں تم سے کیا کہنے آیا ہوں۔''

''پلیز جبار! آپ ماضی کو فراموش کر دیں۔'' وہ التجا آمیز لہجے میں بولی۔ ''وقت بہت آگے بڑھ گیا ہے۔ آپ میری جمی جمائی زندگی کو تلپٹ نہ کریں۔''

''اور میری زندگی کا کیا ہوگا انیلا''

''بھول جائیں سب کچھ۔''

''کیا یہ بھی بھول جاؤں کہ تم نے مجھ سے شادی کی تھی؟''

وہ دل کاٹ ڈالنے والے لہجے میں بولی۔ ''ہاں، یہ بھی بھول جائیں۔''

''مگر کیوں...... انیلا، ایسا کیوں کر ہوا؟''

''بس اسے مجبوری سمجھ لیں۔'' وہ بے بسی سے بولی۔

''یہ کیسی مجبوری تھی انیلا؟'' جبار احمد کے لہجے میں دنیا جہان کا کرب سمایا ہوا تھا۔ ''میں نے تمہارے انتظار میں اپنی زندگی کے سات قیمتی سال جیل کے در و دیوار کی نذر کر دیئے۔ تمہیں پانے کے لئے میں نے ایک ایک لمحہ تمہاری آرزو کی اور تم یہاں اپنی نئی دنیا سجائے بیٹھی ہو۔ آخر میرا قصور تو بتا دو؟''

''آپ کا کوئی قصور نہیں ہے جبار۔'' انیلا روہانسی ہوگئی۔ ''میری ہی قسمت خراب تھی۔''

''تمہاری قسمت اتنی ہی خراب تھی کہ تم نے شادی پر شادی کر لی؟'' جبار کا لہجہ زہریلا نہیں محض شکایتی تھا۔

''ہاں اتنی ہی خراب تھی۔'' انیلا کی آنکھوں کے گوشے بھیگنے لگے۔

''تم جانتی ہو، تم کتنے بڑے گناہ کی مرتکب ہوئی ہو؟''

''ہاں، مجھے احساس ہے۔'' انیلا نے ٹھنڈی سانس خارج کرتے ہوئے جواب دیا۔ ''میری مجبوری بھی اتنی بڑی تھی کہ میں اس گناہ کے سامنے بے بس ہوگئی تھی۔''

''اپنی مجبوری مجھے نہیں بتاؤ گی؟''

''امی نے مرتے وقت مجھے اس شادی کے لئے قسم دی تھی۔'' وہ آنکھیں پونچھتے ہوئے بولی۔ ''اور میں نے اُن کے آخری وقت کو آسان بنانے کے لئے اُن سے وعدہ کرلیا تھا۔''

جبار احمد نے کہا۔ ''تم اپنی امی کو سمجھا سکتی تھیں۔ انہیں بتا سکتی تھیں کہ تم پہلے سے شادی شدہ ہو۔ تمہارا مجھ سے نکاح ہو چکا ہے۔ وہ یقیناً تمہاری پوزیشن کا احساس کرلیتیں اور تمہیں

اس رشتے کے لئے قسم نہ دیتیں۔“

”پھر آپ سے کیا ہوا وعدہ ٹوٹ جاتا۔“ وہ بے چارگی سے بولی۔

”کک...... کیا کہنا چاہتی ہو تم؟“

”آپ کو یاد ہے، جیل جانے سے پہلے آپ نے مجھ سے کیا وعدہ لیا تھا؟“ انیلا یاد دلانے والے انداز میں بولی۔ ”آپ نے کہا تھا کہ میں شادی والے راز کو ہمیشہ اپنے سینے میں پوشیدہ رکھوں۔ میں نے آپ سے کیا ہوا وعدہ نبھا دیا ہے جبار۔“

جبار حیرت اور بے یقینی سے انیلا کو دیکھنے لگا، پھر بولا۔ ”میں نے یہ بھی تو کہا تھا کہ تم خاموشی سے میری واپسی کا انتظار کرنا۔ بولو، تم نے میرا انتظار کیوں نہ کیا؟“

”میں نے آپ کا انتظار کیا جبار، بہت انتظار کیا۔“ وہ شکست خوردہ لہجے میں بولی۔ ”آپ نہیں جانتے، یہاں کراچی آ کر مجھے کن حالات سے گزرنا پڑا۔ ابو اپنے بھائی سلیم الدین کے بیٹے جمشید علی سے میری شادی کرنا چاہتے تھے۔ جمشید علی ایک نمبر کا اوباش، آوارہ اور لفنگا لڑکا ہے۔ پھر وہ خیر سے مجھ پر عاشق بھی ہو گیا تھا۔ وہ کہتا تھا، شادی کرے گا تو مجھ ہی سے کرے گا ورنہ جان دے دے گا۔ امی اس رشتے کے حق میں قطعی نہیں تھیں۔ روز رات کو امی اور ابو کی لڑائی ہوتی تھی۔ وارث علی کی وفات کے بعد ہی امی بستر سے جا لگی تھیں۔ ڈاکٹروں نے ٹی بی کا آخری اسٹیج بتایا تھا اور خاصی مایوسی ظاہر کی تھی۔ اسی دوران میں سلطان صدیقی صاحب کا میرے لئے رشتہ آ گیا۔

میں جس کمپنی میں کام کرتی تھی، سلطان صدیقی اس کے مالک تھے۔ کراچی آ کر میں نے پرائیویٹ گریجویشن کے ساتھ ساتھ ٹائپنگ اور شارٹ ہینڈ بھی سیکھ لی تھی۔ میں خود بھی سلطان صدیقی کی دلچسپی کو واضح محسوس کر رہی تھی مگر میں نے کبھی ان کی حوصلہ افزائی نہیں کی تھی۔ میری بے اعتنائی سے مایوس ہو کر انہوں نے براہِ راست امی سے بات کر لی۔ امی جمشید علی کی چھچھوری حرکتوں سے عاجز تھیں۔ وہ میرے لئے کسی محفوظ اور مضبوط سہارے کی تلاش میں تھیں۔ یہ تمام خصوصیات سلطان صدیقی میں موجود تھیں۔ ان کی عمر چالیس سال تھی اور ابھی تک انہوں نے شادی نہیں کی تھی۔ وہ امپورٹ ایکسپورٹ کا کام کرتے تھے۔ ابو بھی اس رشتے کے لئے نیم رضامند ہو گئے تھے۔ پھر انہی دنوں امی کا انتقال ہو گیا اور میں نے اُن کی اُکھڑتی ہوئی سانسوں میں اس شادی کی حامی بھر لی۔“

”اوہ!“ جبار پوری بات سننے کے بعد ہاتھوں کی ہتھیلیوں کو ایک دوسرے کے اوپر ملنے لگا۔

انیلا نے کہا۔ ”شادی کے بعد جمشید علی اپنی کمینی اور اوچھی حرکتوں سے باز نہ آیا اور اس نے میری ازدواجی زندگی کو تباہ کرنے کے لئے خاصا زور لگایا۔ ایک دو مراحل پر میرے اور سلطان صاحب کے درمیان غلط فہمیاں پیدا کرنے میں وہ کامیاب بھی ہو گیا مگر میں نے بڑی سمجھداری سے معاملے کو سنبھال لیا۔“ ایک لمحے کے توقف سے اُس نے اضافہ کیا۔ ”آپ سے بھی میں یہی التجا کروں گی کہ کہیں دُور چلے جائیں اور مجھے ہمیشہ کے لئے بھول جائیں۔“

”میرے پاس ایک اور تجویز ہے انیلا۔“ جبار نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

”کیسی تجویز؟“ انیلا نے چونک کر اُسے دیکھا۔

جبار احمد ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”انیلا! اب بھی کچھ نہیں بگڑا ہے۔ سلطان صدیقی سے تمہارے نکاح کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ تم اب بھی میری بیوی ہو۔ تم میرا ساتھ دو، ہم کسی اور شہر میں جا کر نئے سرے سے اپنی زندگی کا آغاز کریں گے۔“

”خدارا جبار، ایسا سوچیں بھی نہیں۔“ وہ احتجاجی لہجے میں بولی۔ ”میں آپ کے ساتھ کہیں نہیں جا سکتی۔ بہتر یہی ہے کہ ہم ایک دوسرے کو ہمیشہ کے لئے بھول جائیں۔ آپ چلے جائیں یہاں سے۔“

”انیلا! میں اتنی آسانی سے تمہیں نہیں بھول سکتا۔“

وہ ہاتھ جوڑتے ہوئے بولی۔ ”جبار! میں نے آج تک آپ سے کچھ نہیں مانگا ہے۔ آج مانگ رہی ہوں۔ میری بات کو ٹالیے گا نہیں۔“

جبار سوالیہ نظر سے اُسے دیکھنے لگا۔ وہ سراپا عجز و انکسار بنی بیٹھی تھی۔ جبار کا کلیجہ دولخت ہو گیا۔ اُس نے اضطراری لہجے میں کہا۔

”کہو، کیا کہنا چاہتی ہو؟“

”پہلے وعدہ کریں، میری بات مانیں گے۔“

جبار احمد نے وعدہ کر لیا۔ انیلا نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”جبار، اگر آپ کو مجھ سے ذرہ برابر بھی محبت ہے تو انکار نہ کیجئے گا۔“

”تم میری محبت کو ذروں میں نہ تولو انیلا۔“ جبار نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ ”میرے دل میں تمہارے لئے محبت کا ایک لامحدود سمندر موجزن ہے۔“ بات ختم کرتے کرتے جذبات کی شدت سے الفاظ اُس کے منہ میں لرزنے لگے تھے۔

انیلا نے کہا۔ ”آپ کو میری محبت کی قسم، میری زندگی سے ہمیشہ کے لئے نکل جائیں۔“

’’تمہاری محبت کی قسم!‘‘ جبار سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔ ’’آج سے آٹھویں روز کے بعد تم میری شکل بھی نہیں دیکھو گی۔ میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے تمہاری نظر سے دُور چلا جاؤں گا۔ دُور...... بہت دُور۔‘‘

انیلا کے سینے سے اطمینان کی سانس خارج ہوئی۔ اُس نے سوال کیا۔ ’’آٹھویں روز والی بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔‘‘

’’بہت آسان سی بات ہے۔‘‘ جبار کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ ’’میں سات روز تک تمہاری نظر کے سامنے رہوں گا۔‘‘

’’یہ بھلا کیسے ممکن ہے؟‘‘ وہ بوکھلا گئی۔

’’ممکن بنانا میرا کام ہے۔‘‘ جبار نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ’’اگر کبھی تمہیں مجھ سے محبت تھی تو مجھے یقین ہے، تم انکار نہیں کرو گی۔‘‘

وہ تذبذب میں پڑ گئی۔ ’’میری سمجھ میں نہیں آ رہا، آپ کہنا کیا چاہ رہے ہیں؟‘‘

’’میں سب کچھ سمجھا دوں گا۔‘‘ جبار نے اُسے یقین دلایا۔ ’’پہلے تم وعدہ کرو۔‘‘

’’اگر میرے لئے ممکن ہو سکا تو میں آپ کی بات مان لوں گی۔‘‘

’’شکریہ انیلا۔‘‘ جبار نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ’’ایک روز کے بعد سے میں پورا ہفتہ تمہارے بنگلے میں دن گزارا کروں گا۔‘‘

’’آپ ایک ان ہونی بات کر رہے ہیں۔‘‘

’’یہ ان ہونی ہو کر رہے گی۔‘‘ جبار اٹھ کر کھڑا ہو گیا پھر جذبات سے عاری لہجے میں بولا۔ ’’کل تمہاری لائن میں پانی نہیں آئے گا۔ باقی سب کے یہاں پانی موجود ہو گا لیکن صرف تمہاری لائن خشک ہو گی۔ تمہیں صرف اتنا کرنا ہو گا کہ مارکیٹ سے کسی پلمبر کو بلا کر اپنی لائن چیک کروانا ہو گی۔ اس بات کا خیال رہے کہ پلمبر کے لئے ’’حاجی سینیٹری ورکس‘‘ ہی سے رابطہ کیا جائے۔ باقی معاملات میں خود سنبھال لوں گا۔‘‘

’’میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔‘‘ وہ اُلجھن آمیز لہجے میں بولی۔

’’انیلا! تم ذہن کو زیادہ نہ اُلجھاؤ۔‘‘ جبار نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ’’میں نے تمہاری بات مان کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے تمہاری دنیا سے نکل جانے کا فیصلہ کیا ہے، تم بھی میری ہدایات پر عمل کرو۔ میں سمجھوں گا تم نے میری محبت کا قرض اتار دیا۔‘‘

انیلا خاموش ہو گئی۔ اُس کی خاموشی میں رضامندی کی آمیزش تھی۔ جبار احمد اُس کے بنگلے سے باہر نکل آیا۔

پھر اُسی رات نہایت ہی خفیہ طریقے سے جبار نے انیلا والے بنگلے کی مین لائن میں کوئی ایسی رُکاوٹ پیدا کر دی کہ لائن میں پانی موجود ہونے کے باوجود بھی اُن کے بنگلے میں نہ پہنچ سکے۔ حسب پروگرام حاجی سینیٹری ورکس سے رجوع کیا گیا۔ جبار احمد اپنے ساز و سامان کے ساتھ پلمبروں کے روایتی حلیے میں بنگلے پر پہنچ گیا۔ پھر اُس نے سلطان صدیقی کی موجودگی ہی میں کام کا آغاز کر دیا جو شام تک جاری رہا۔ اُس روز بنگلے سے رُخصت ہوتے وقت اس نے دوسرے دن کے لئے بھی کام نکال لیا تھا۔ سلطان صدیقی کو اُس کے مشورے بہت پسند آئے۔ بنگلے میں پلمبرنگ کے چھوٹے موٹے کئی کام التوا میں پڑے ہوئے تھے چنانچہ جبار احمد کی وہاں آمد و رفت کا راستہ کھل گیا۔ انیلا اُس کے ’’طریقہ واردات‘‘ پر حیران تھی۔ وہ دن بھر اُسے مختلف کاموں کے سلسلے میں ہدایات دیتی رہتی اور اُسے کام کرتے ہوئے دیکھتی رہتی۔

جبار احمد نے میرے ایک سوال کے جواب میں بتایا کہ اُس نے یہ سارا بندوبست محض اس لئے کیا تھا کہ وہ زیادہ سے زیادہ وقت انیلا کے سامنے رہ کر اُسے سمجھا سکے کہ وہ سلطان صدیقی کو چھوڑ کر اُس کے ساتھ چلنے کو تیار ہو جائے لیکن اُسے اپنے مقصد میں کامیابی نہ ہوئی۔ انیلا اپنے فیصلے پر ڈٹی رہی۔ بالآخر اُسے ہی ایک انتہائی فیصلہ کرنا پڑا۔ ایک ایسا فیصلہ جو سنگین بھی تھا اور اپنی نوعیت کا انوکھا فیصلہ بھی۔

چودہ اکتوبر کو جبار احمد نے حسب معمول اپنے اوزار سمیٹے۔ انیلا کو آخری مرتبہ الوداعی نظر سے دیکھا اور اُس کے بنگلے سے ہمیشہ کے لئے نکل آیا۔ وہ شکستہ دل اور بوجھل قدموں سے چلتے ہوئے حاجی سینیٹری ورکس پر پہنچا، اوزاروں والا تھیلا دُکان پر چھوڑا اور اپنے کوارٹر واقع اعظم بستی کی جانب روانہ ہو گیا۔ اس نے انیلا کی طرف سے قطعی مایوس ہو جانے کے بعد خودکشی کا فیصلہ کر لیا تھا۔

پھر اس سے پہلے کہ وہ پھانسی کا پھندا اپنی گردن میں فٹ کر کے کرسی کو لات مارتا، پولیس دندناتی ہوئی اُس کے کوارٹر میں پہنچ گئی اور آن واحد میں اُسے انیلا کے قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا۔

اس ڈرامائی، جذبات سے بھرپور اور سنسنی خیز کہانی کے علاوہ بھی جبار نے مجھے بہت سی باتیں بتائیں جن کا ذکر سردست مناسب نہیں ہو گا۔ آپ کو عدالتی کارروائی تک انتظار کرنا پڑے گا۔

یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ میں نے وہ کیس لینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ مجھے واضح طور

پر یقین آ گیا تھا کہ جبار احمد سراسر بے گناہ تھا اور اُسے انیلا کے قتل کے معاملے میں ملوث کرنے کی سازش کی گئی تھی۔

دوسرے روز حسب وعدہ جبار کا والد فضل کریم مجھ سے ملنے آیا تو میں نے اُسے کیس کی پیروی کی خوشخبری سنا دی۔ اُس نے میری مطلوبہ فیس ایڈوانس ادا کی اور میں نے ادائیگی کی رسید بنا کر اُسے تھما دی۔ اُس نے پوچھا۔

''بیگ صاحب! میرا بیٹا رہا ہو جائے گا نا؟''

میں نے کہا۔ ''جو میرے اختیار میں ہے وہ میں ضرور کروں گا۔ اگر جبار واقعی بے گناہ ہے تو وہ چھوٹ جائے گا۔''

''یعنی ابھی تک آپ کو اُس کی بے گناہی کا یقین نہیں آیا۔''

''یہ بات نہیں ہے فضل صاحب۔'' میں نے جلدی سے کہا۔ ''دراصل ابھی تک بہت سی باتیں وضاحت طلب ہیں۔ میں کچھ باتوں کی تصدیق کرنا چاہتا ہوں اور اس کے لئے مجھے آپ کے بھرپور تعاون کی ضرورت ہے۔''

''میں ہر قسم کے تعاون کے لئے تیار ہوں۔'' وہ بولا۔ ''آپ حکم کریں۔''

میں نے کہا۔ ''آپ دو چار روز میں میرے بتائے ہوئے تین افراد کو کسی طرح اس دفتر میں لے آئیں۔ ممکن ہے عدالت میں ان کی گواہی کی ضرورت پیش آ جائے۔''

پھر میں نے حاجی سینیٹری ورکس کے مالک حاجی جواد حسین، جبار کے نواب شاہ والے دوست ادریس احمد اور حیدر آباد میں موجود منظور علی کا نام فضل کریم کو بتا دیا۔ اُس نے مجھ سے وعدہ کیا کہ وہ جلد از جلد ان تینوں افراد کو میرے پاس لے آئے گا۔

دو چار رسمی باتوں کے بعد وہ رخصت ہو گیا۔

✿......✿
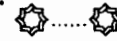
ریمانڈ کی مدت پوری ہونے کے بعد پولیس نے چالان عدالت میں پیش کر دیا۔ پولیس کی طرح عدالت کی ابتدائی کارروائی بھی خاصی خشک اور بور ہوتی ہے۔ فائلیں ضابطے کی کارروائیوں سے بھر جاتی ہیں۔ گواہوں کے بیانات، حلف نامے، مشیر نامے، واقعاتی شہادتیں، انکوائری افسر کی رپورٹ، میڈیکل رپورٹ اور کیمیکل ٹیسٹ کی رپورٹ وغیرہ۔ میں یہاں پر نہایت ہی اہم باتوں کا ذکر کر کے گواہوں کے بیانات کی طرف آ جاؤں گا۔

پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق مقتولہ انیلا کی موت چودہ اکتوبر کی شام پانچ اور چھ بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی۔ موت کا سبب اُس کے سر کے عین وسط میں لگنے والی وہ

شدید ترین چوٹ تھی جس نے اُس کی کھوپڑی کو پاش پاش کر دیا تھا۔ جائے وقوعہ پر پائے جانے والے رینچ پانے کے کیمیائی تجزیئے سے بھی یہ بات ثابت ہو گئی تھی کہ وہ رینچ پانا ہی آلۂ قتل کے طور پر استعمال کیا گیا تھا۔ مذکورہ رینچ پانا ملزم جبار احمد کی ملکیت تھا اور اس کے دستے پر ملزم کی اُنگلیوں کے نشانات بھی پائے گئے تھے۔ میڈیکل ایگزامنر کی رپورٹ کے مطابق مقتولہ کے سر کو اچانک ہی نشانہ بنایا گیا تھا یعنی چوٹ اس کی توقع کے خلاف لگائی گئی تھی۔

عدالت کی باقاعدہ کارروائی کا آغاز ہوا۔ جج نے فردِ جرم پڑھ کر سنائی۔ ملزم نے صحت جرم سے انکار کر دیا۔ پولیس کسٹڈی میں جبار احمد اقرارِ جرم کر چکا تھا تا کہ پولیس کے مشہور زمانہ تشدد سے محفوظ رہ سکے۔ ریمانڈ کی مدت کے دوران میں پولیس کی تحویل میں دیئے گئے بیان کو عدالت میں زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی۔

میں اپنے وکالت نامے کے ساتھ ساتھ ملزم جبار احمد کی ضمانت کے کاغذات بھی عدالت میں دائر کر چکا تھا۔ میں نے اپنے مؤکل کی ضمانت کروانے کی پوری کوشش کی لیکن مجھے اس میں کامیابی نہ ہو سکی اور جبار احمد کو جوڈیشنل ریمانڈ پر جیل بھیج دیا گیا۔

اگلی پیشی پر گواہوں کے بیانات کا سلسلہ شروع ہوا۔ طوالت سے بچنے کے لئے میں یہاں صرف اہم گواہوں کا ذکر ہی کروں گا۔ استغاثہ کی جانب سے سب سے پہلے مقتولہ کا شوہر سلطان صدیقی گواہی کے لئے پیش ہوا۔ وہ استغاثہ کا سب سے اہم گواہ بھی تھا۔

سلطان صدیقی کی عمر لگ بھگ تینتالیس سال تھی۔ وہ صحت مند اور توانا جسم کا مالک تھا۔ اُس کا قد چھ فٹ سے نکلتا ہوا تھا۔ وہ کلین شیو تھا اور اس وقت گرے کلر کے سفاری سوٹ میں ملبوس تھا۔

سلطان صدیقی نے سچ بولنے کا حلف اٹھانے کے بعد اپنا بیان ریکارڈ کروایا۔ اُس کے بیان کے مطابق وقوعہ کے روز وہ اپنی بیوی مقتولہ انیلا کے ساتھ فلم دیکھنے جانے والا تھا اسی وجہ سے وہ جلدی گھر آ گیا تھا۔ ان دونوں نے ایک ساتھ شام کی چائے پی۔ اسی دوران میں ملزم جبار احمد اُن کے پاس آیا اور بتایا کہ اُس کا کام ختم ہو گیا ہے۔ سلطان صدیقی اور انیلا اس وقت کرسیوں سے اُٹھ چکے تھے۔ سلطان صدیقی نے اپنی بیوی سے کہا کہ وہ ملزم کو فارغ کرے تب تک وہ لباس تبدیل کر لے گا۔ انیلا پہلے ہی تیار ہو چکی تھی۔ انیلا اپنا پرس لینے کے لئے اندرونی حصے کی جانب بڑھی جبکہ سلطان صدیقی باتھ رُوم میں گھس گیا۔ جب وہ لباس تبدیل کر رہا تھا تو اُس نے انیلا کو جبار کے ساتھ تیز لہجے میں بات کرتے ہوئے

سنا۔ شاید دونوں کے درمیان معاوضے کے معاملے میں تکرار ہو رہی تھی۔ انیلا غصے میں چیخ رہی تھی۔ جبار احمد بھی جواباً کچھ کہہ رہا تھا۔ اگلے ہی لمحے ''ٹھک'' کی آواز سنائی دی۔ اس کے ساتھ ہی انیلا کی گھٹی گھٹی چیخ اُبھری اور دوڑتے ہوئے قدموں کی چاپ سنائی دینے لگی۔
سلطان صدیقی نے جھٹ سے باتھ رُوم کا دروازہ کھولا اور باہر برآمدے میں آ کر دیکھا۔ انیلا برآمدے کے فرش پر بے سدھ پڑی تھی۔ اُس کا سر پھٹا ہوا تھا اور خون بڑی تیزی سے بہہ رہا تھا۔ قریب ہی پلمبرنگ کے کام میں استعمال ہونے والا رینچ پانا پڑا ہوا تھا۔ سلطان نے متلاشی نگاہ چاروں طرف دوڑائی لیکن جبار احمد کہیں نظر نہ آیا۔ سلطان نے چیخ کر اپنے ملازم خادم حسین کو آواز دی۔ پھر کچھ ہی دیر کے بعد وہ پولیس اسٹیشن کے نمبر ڈائل کر رہا تھا۔ کم وبیش یہی بیان اُس نے پولیس کو بھی دیا تھا۔

سلطان صدیقی کا بیان ختم ہوا تو وکیل استغاثہ نے اُس کے بیان کو مزید مستحکم اور پائیدار بنانے کے لئے چند ضمنی سوالات کئے۔ اس کے بعد عدالت کی اجازت سے میں نے اپنی جرح کا آغاز کیا۔

''سلطان صدیقی صاحب!'' میں نے سوال کیا۔ ''آپ کا ذریعہ معاش کیا ہے؟''

اُس نے جواب دیا۔ ''طارق روڈ پر میری ایک چھوٹی سی ٹریڈنگ کمپنی ہے۔ میں امپورٹ ایکسپورٹ کا کام کرتا ہوں۔''

''آپ کی کمپنی کا نام کیا ہے؟''

''صدیقی ٹریڈنگ کمپنی۔''

میں نے پوچھا۔ ''آپ کی شادی کو کتنا عرصہ ہوا ہے؟''

وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ ''تقریباً تین سال۔''

''کیا یہ سچ ہے کہ مقتولہ آپ کی بیوی بننے سے قبل آپ کی کمپنی ہی میں کام کرتی تھی؟''

وکیل استغاثہ نے فوراً مداخلت کی۔ ''آبجیکشن یور آنر۔ میرے فاضل دوست غیر متعلق سوال کر رہے ہیں۔''

میں نے جلدی سے کہا۔ ''جناب عالی! سردست غیر متعلق نظر آنے والا یہ سوال آگے چل کر انتہائی متعلق ہو جائے گا۔ ویسے اگر گواہ میرے سوال کا جواب نہ دینا چاہے تو میں اصرار نہیں کروں گا۔''

جج نے سوالیہ نظر سے وٹنس باکس میں کھڑے ہوئے استغاثہ کے گواہ اور مقتولہ کے شوہر سلطان صدیقی کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ''آپ کو وکیل صفائی کے سوال کا جواب دینے پر

کوئی اعتراض تو نہیں ہے؟''

وہ بیزاری سے بولا۔ ''مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔''

پھر میری جانب دیکھتے ہوئے بتایا۔ ''ہاں، یہ سچ ہے کہ انیلا شادی سے پہلے میرے دفتر میں ملازمت کرتی تھی۔''

''مقتولہ نے آپ کے پاس کتنا عرصہ ملازمت کی تھی؟''

''کم وبیش ایک سال۔''

میں نے سوالات کے زاویئے کو تبدیل کرتے ہوئے پوچھا۔ ''آپ عموماً دفتر سے کتنے بجے تک گھر پہنچ جاتے ہیں؟''

اُس نے بتایا۔ ''میں عام طور پر آٹھ بجے تک گھر آتا ہوں۔''

''سلطان صدیقی صاحب!'' میں نے اُس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ''وقوعہ کے روز خلاف معمول آپ لگ بھگ پانچ بجے گھر پہنچ چکے تھے......''

''میں اس کی وجہ بھی بتا چکا ہوں۔'' وہ میری بات کاٹتے ہوئے بولا۔

''یاد دہانی کا شکریہ۔'' میں نے زیرلب مسکراتے ہوئے کہا۔ ''آپ کا اُس روز فلم دیکھنے کا پروگرام تھا۔ ہے نا؟''

''جی ہاں، یہی بات تھی۔''

''غالباً آپ دونوں چھ سے نو والا شو دیکھنا چاہتے تھے؟''

''ظاہر ہے۔'' اُس نے منہ ٹیڑھا کر کے کہا۔ ''ورنہ مجھے اتنی جلدی دفتر سے اٹھنے کی کیا ضرورت تھی۔''

میں نے پوچھا۔ ''آپ کون سے سینما میں فلم دیکھنے کا ارادہ رکھتے تھے؟''

''اسٹار سینما میں۔'' اُس نے جواب دیا۔

''صدیقی صاحب!'' میں نے سوالات کے سلسلے کو دراز کرتے ہوئے کہا۔ ''ملزم جبار کو آپ کب سے جانتے ہیں؟''

اُس نے جواب دینے سے پہلے نفرت آمیز نظر سے ملزموں کے کٹہرے میں کھڑے میرے مؤکل جبار احمد کو دیکھا پھر بولا۔ ''چند روز سے۔''

''آپ کی اس سے کوئی دشمنی تھی؟''

اُس نے نفی میں جواب دیا۔ میں نے پوچھا۔ ''آپ کی مقتولہ بیوی سے کوئی چپقلش یا دشمنی؟''

"میرے علم میں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔"

"صدیقی صاحب! آپ میرے مؤکل اور اس مقدمے کے ملزم پلمبر جبار احمد کو روزانہ اس کی مزدوری دیتے تھے یا......"

وہ قطع کلامی کرتے ہوئے بولا۔ "میں نے یہی سوچا تھا کہ اسے روز کی روز مزدوری دے دی جائے لیکن اس نے خود ہی انکار کر دیا تھا۔ اس کی درخواست تھی کہ وہ کام کی تکمیل کے بعد ایک ساتھ حساب کرلے گا۔" ایک لمحے کے توقف سے اُس نے اضافہ کیا۔ "کام بھی اس نے خود ہی بڑھا لیا تھا۔ میں نے تو اسے مین لائن کی چیکنگ کے لئے بلایا تھا مگر اس نے گھر میں ایسا ڈیرا ڈالا کہ نکالنا مشکل ہو گیا۔ خدا خدا کر کے ایک ہفتے میں اس نے ہماری جان چھوڑنے کا اعلان کیا...... اور جاتے ہوئے یہ بدبخت......" اُس کی آواز بھرا گئی اور آنکھوں سے جبار احمد کے لئے نفرت کی چنگاریاں سی چھوٹنے لگیں۔

میں نے پوچھا۔ "صدیقی صاحب! آپ نے پہلے پولیس کو اور پھر عدالت میں بیان دیا ہے کہ وقوعہ کے روز آپ اپنے بنگلے کے برآمدے میں بیٹھے چائے پی رہے تھے جب ملزم آپ کے پاس آیا۔ اس نے آپ کو کام کی تکمیل کے بارے میں بتایا اور اپنا حساب کرنے کو کہا۔ پھر......"

"مجھے سخت اعتراض ہے جناب عالی۔" وکیل استغاثہ نے فوراً مداخلت ضروری سمجھی اور کہا۔ "میرے فاضل دوست گواہ کو اُلجھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ جبکہ میرا گواہ واضح الفاظ میں بیان دے چکا ہے کہ جب ملزم ان کے پاس پہنچا تو وہ چائے ختم کر کے اپنی کرسیوں سے اٹھ چکے تھے۔ اب وکیل صفائی فرما رہے ہیں کہ ملزم کی آمد پر معزز گواہ اور مقتولہ برآمدے میں کرسیوں پر بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ اس سے وہ کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں؟"

میں نے کہا۔ "میں جو ثابت کرنا چاہتا ہوں وہ بہت جلد سب کے سامنے آ جائے گا۔ فی الحال میں معزز عدالت سے استدعا کرتا ہوں کہ گواہ پر جرح کے دوران میں وکیل استغاثہ کو غیر ضروری مداخلت سے باز رکھا جائے تاکہ عدالتی کارروائی کو آگے بڑھایا جا سکے۔"

جج نے گواہ کے ریکارڈ شدہ بیان اور پولیس کے پیش کردہ چالان پر سرسری نگاہ دوڑانے کے بعد مجھے ہدایت کی کہ میں اپنے سوال میں سے گواہ اور مقتولہ کے برآمدے میں بیٹھنے کو حذف کر کے اس طرح پوچھوں کہ جب ملزم ان کے پاس پہنچا تو وہ چائے ختم کر کے کرسیوں سے اٹھ چکے تھے۔

میں نے جج کی ہدایت پر عمل کیا اور روئے سخن گواہ سلطان صدیقی کی طرف موڑتے

ہوئے سوال کیا۔ "صدیقی صاحب! کیا یہ درست ہے کہ وقوعہ کے روز جب ملزم اپنا حساب لینے کے لئے آپ کے پاس پہنچا تو آپ دونوں میاں بیوی چائے پینے کے بعد اپنی کرسیوں سے اٹھ کر کھڑے ہو چکے تھے مگر ابھی وہیں، برآمدے میں تھے۔"

"جی ہاں، یہ درست ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "اس کے بعد کیا ہوا تھا؟"

"اس کے بعد میں لباس تبدیل کرنے اندر باتھ روم میں چلا گیا تھا۔"

"جاتے ہوئے آپ مقتولہ سے کہہ گئے تھے کہ وہ ملزم کو فارغ کر دے؟"

اُس نے اثبات میں جواب دیا۔ "جی ہاں، اور انیلا اپنا پرس لینے کے لئے گھر کے اندرونی حصے میں چلی گئی تھی۔"

"معاف کیجئے گا صدیقی صاحب!" میں نے تیز لہجے میں کہا۔ "اس موقع پر آپ کا رویہ کچھ غیر منطقی سا نہیں لگتا۔"

"آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟" صدیقی نے پوچھا۔

میں نے کہا۔ "ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ جب میرے مؤکل نے آپ کو اطلاع دی تھی کہ کام ختم ہو چکا ہے تو اصولی طور پر ادائیگی کرنے سے پہلے آپ کو اس کام کا تنقیدی جائزہ لینا چاہئے تھا جس کے لئے آپ نے ایک ہفتے تک میرے مؤکل کو اپنے بنگلے میں کام پر لگائے رکھا تھا۔ لیکن اس کے بالعکس آپ نے کام کا معائنہ کرنے کے بجائے ملزم کو اس کی اُجرت دینے کا فیصلہ کیا۔ کیا اس کی کوئی خاص وجہ تھی؟"

وہ اُکتاہٹ آمیز لہجے میں بولا۔ "مجھے اس کام سے اور کام کرنے والے سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ انیلا اس تمام عرصے میں ملزم سے اپنی نگرانی میں کام کرواتی رہی تھی۔ میں تو رات کو واپسی پر بس پورے دن کی کارکردگی کی رپورٹ سن لیتا تھا جو کہ اطمینان بخش ہوا کرتی تھی اسی لئے میں نے وقوعہ کے روز انیلا سے کہا تھا کہ وہ خود ہی اس پلمبر کا حساب کر کے اسے فارغ کر دے۔"

میں نے پوچھا۔ "صدیقی صاحب! آپ نے معزز عدالت کو بیان دیا ہے کہ وقوعہ کے روز آپ بیوی مقتولہ انیلا کے ساتھ فلم دیکھنے کا ارادہ رکھتے تھے اسی وجہ سے آپ خلاف معمول مذکورہ روز جلدی گھر آ گئے تھے۔ آپ نے یہ ذکر بھی کیا ہے کہ جب آپ لباس تبدیل کرنے باتھ روم جا رہے تھے تو اس وقت آپ کی بیوی تیار ہو چکی تھی۔ کیا آپ کی بیوی آپ کی موجودگی میں تیار ہوئی تھی؟"

"میں جب گھر پہنچا تو انیلا پہلے سے تیار بیٹھی تھی۔" سلطان صدیقی نے جواب دیا۔ "اور اس کی ہدایت میں اسے دن ہی میں ٹیلی فون پر کر چکا تھا۔"

میں نے سوال کیا۔ "آپ کی بیوی نے اس روز کیسا لباس پہن رکھا تھا؟"

"انیلا نے ساڑھی پہن رکھی تھی۔"

"ساڑھی کا رنگ کیا تھا؟"

"فیروزی۔" اُس نے جواب دیا۔ "اور وہ ایک بنارسی ساڑھی تھی۔"

میں نے پوچھا۔ "صدیقی صاحب! وقوعہ کے روز جب ملزم اپنا کام ختم کر کے حساب وغیرہ لینے آیا تھا تو اس وقت کتنے بجے ہوں گے؟"

"میں نے گھڑی تو نہیں دیکھی تھی لیکن میرا خیال ہے کہ اس وقت سوا پانچ بجے ہوں گے۔" اس نے متذبذب انداز میں جواب دیا۔

میں نے سوال کیا۔ "کیا ملزم روزانہ اسی وقت چھٹی کر کے جاتا تھا؟"

"میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔" وہ کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔ "میں رات کو آٹھ بجے تک گھر آتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے اچانک سوال کیا۔ "ملزم نے وقوعہ کے روز کس قسم کے کپڑے پہن رکھے تھے؟"

"میں نے اُس کے لباس پر غور نہیں کیا تھا۔"

"آپ کو اپنی بیوی کا لباس تو بخوبی یاد ہے؟"

"اس میں آپ کو کیا اعتراض ہے؟" اُس نے اُلٹا مجھ سے سوال کر ڈالا۔

"مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔" میں نے زیرلب مسکراتے ہوئے کہا۔ "اب آپ یہ بھی بتا دیں کہ آپ کی بیوی نے وقوعہ کے روز کس قسم کا جوتا پہن رکھا تھا؟"

اُس نے جواب دیا۔ "انیلا نے سینڈل پہن رکھی تھی۔"

"اُونچی ایڑی کی سینڈل؟"

"جی ہاں۔" اُس نے بیزاری سے کہا۔ "اگر چار انچ کی ایڑی والی سینڈل کا شمار اونچی ایڑی کی سینڈل میں ہوتا ہے تو بلاشبہ ایک اونچی ایڑی کی سینڈل ہی تھی۔"

"سینڈل کا رنگ بتائیں گے؟"

"آبجیکشن یور آنر۔" وکیل استغاثہ کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تھا۔ اُس نے احتجاجی لہجے میں کہا۔ "جناب عالی! وکیل صفائی یہ کس قسم کے سوالات کر رہے ہیں۔ انہیں عدالت کے

قیمتی وقت کا ذرا احساس نہیں ہے۔"

میں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ "مائی ڈیئر کونسلر! میں اس قسم کے سوالات اسی لئے کر رہا ہوں کہ مجھے عدالت کے قیمتی وقت کا شدت سے احساس ہے اور میں اس کیس کو لٹکانے کے بجائے جلد از جلد کسی نتیجے پر پہنچانا چاہتا ہوں۔ ویسے میں نے آپ کے معزز گواہ سے کوئی ایسا مشکل اور پیچیدہ سوال بھی نہیں کیا جو آپ کی سمجھ سے بالاتر ہو۔"

"آپ کے سوالات غیر متعلق ہیں۔"

"یہ محض آپ کا خیال ہے یا آپ انہیں غیر متعلق ثابت بھی کر سکتے ہیں؟"

"آپ ہی ان کا موجودہ کیس سے کوئی تعلق بتا دیں؟"

"میں وہی تو بتانے جا رہا ہوں۔" میں نے زیرلب مسکراتے ہوئے کہا۔

"گویا آپ کوئی نئی کہانی شروع کرنے والے ہیں۔ بہت خوب!" وہ طنزیہ انداز میں بولا۔

"آرڈر پلیز!" جج نے ہمیں مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "آپ حضرات آپس میں اُلجھنے کے بجائے عدالتی کارروائی کو آگے بڑھائیں۔ اور پھر میری جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"بیگ صاحب! آپ گواہ سے کچھ اور پوچھنا چاہتے ہیں؟"

"آف کورس یور آنر۔" میں نے گردن کو خم دیتے ہوئے کہا اور کٹہرے میں کھڑے ہوئے استغاثہ کے گواہ سلطان صدیقی کی جانب متوجہ ہو گیا۔

"سلطان صدیقی صاحب!" میں نے اُسے مخاطب کرتے ہوئے سوال کیا۔ "آپ جمشید علی نامی کسی شخص سے واقف ہیں؟"

"کون جمشید علی؟"

"شادی سے پہلے جو آپ سے خیر خواہی کا دعوے دار تھا۔"

"میں سمجھا نہیں، آپ کس کا ذکر کر رہے ہیں۔"

"وہ جو آپ سے ملنے دفتر بھی آیا تھا۔" میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ "اور شادی کے بعد وہ بذریعہ فون آپ سے رابطہ کرتا رہتا تھا۔ لیکن آپ نے اُس کے "خلوص" کی قدر نہیں کی تھی بلکہ اُسے بری طرح ڈانٹ بھی پلائی تھی۔"

"اچھا اچھا، وہ۔" سلطان صدیقی نے پیشانی کو مسلتے ہوئے کہا۔ "وہ تو انیلا کا کزن تھا۔ انتہائی بے ہودہ، آوارہ اور بدچلن۔ اگر انیلا سے رشتے داری کا خیال نہ ہوتا تو اُس سالے کو میں تھانے میں بند کروا دیتا۔"

میں نے ٹٹولنے والے انداز میں پوچھا۔ ''میں نے سنا ہے، جمشید علی نے آپ کو دھمکیاں وغیرہ بھی دی تھیں؟''

''ہاں، ایسا ہوا تھا۔'' وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''انیلا نے مجھے بتایا تھا کہ جمشید علی اس سے شادی کا خواہاں تھا لیکن اس کے انکار پر وہ چراغ پا ہو گیا تھا اور اسی لئے وہ انیلا کے بارے میں الٹی سیدھی بکواس کرتا پھرتا تھا۔''

''صدیقی صاحب! کیا یہ سچ ہے کہ جمشید علی نے آپ کو انیلا کے خلاف ورغلانے کی پوری کوشش کی تھی؟''

''ہاں یہ سچ ہے۔'' اُس نے اثبات میں جواب دیا۔ ''لیکن اسے منہ کی کھانا پڑی تھی۔''

میں نے پوچھا۔ ''کیا یہ بھی سچ ہے کہ وہ آپ دونوں کے درمیان کچھ غلط فہمیاں پیدا کرنے میں کامیاب بھی ہو گیا تھا؟''

''وہ سب کچھ وقتی تھا۔'' وہ جلدی سے بولا۔ ''انیلا نے صفائی پیش کر کے وہ غلط فہمیاں دُور کر دی تھیں۔''

''کیا انیلا کی طرف سے آپ کا دل واقعی صاف ہو گیا تھا؟''

''جی ہاں، میرا دل صاف ہو گیا تھا۔''

''اس کے بعد جمشید علی نے کبھی آپ سے رابطہ کیا؟''

''نہیں۔'' اُس نے نفی میں جواب دیا۔ ''میں نے اس کے بعد سے نہ تو اس منحوس کی شکل دیکھی اور نہ ہی آواز سنی۔''

میں نے پوچھا۔ ''کیا آپ کو یقین ہے کہ بعد ازاں جمشید علی نے کبھی آپ کی بیوی سے بھی رابطہ نہیں کیا تھا اور نہ ہی کبھی ملنے کی کوشش کی تھی۔''

''ہاں، اس بات کا مجھے پورا یقین ہے۔''

''اس یقین کی کوئی وجہ؟''

وہ بولا۔ ''اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو انیلا ضرور مجھ سے اس کا ذکر کرتی۔''

''کیا انیلا ہر چھوٹی بڑی بات آپ کو بتاتی تھی؟''

''ہاں، وہ مجھ سے کچھ نہیں چھپاتی تھی۔''

''پھر تو اس نے یہ بھی نہیں چھپایا ہو گا کہ وہ کراچی آنے سے پہلے حیدر آباد میں رہتی تھی؟'' میں نے پوچھا۔

''بالکل، اس نے مجھے سب کچھ بتا دیا تھا۔''

میں نے اُس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔ ''کیا انیلا نے آپ کو یہ بھی بتا دیا تھا کہ حیدر آباد میں اس کے بھائی کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا تھا؟''

سلطان صدیقی نے جواب دیا۔ ''وارث علی کو کسی شخص نے فائرنگ کر کے شدید زخمی کر دیا تھا۔ بعد ازاں وہ گھٹنے کی چوٹ کے ناسور بن جانے کے سبب جان سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔''

''پھر تو آپ کو یہ بھی معلوم ہو گا کہ اس شخص نے وارث علی پر فائرنگ کیوں کی تھی؟'' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

وہ بولا۔ ''انیلا نے مجھے بتایا تھا کہ ان دونوں کے درمیان رقم کے لین دین پر جھگڑا ہو گیا تھا اور اس شخص نے طیش میں آ کر وارث علی پر فائرنگ کر دی تھی۔''

''فائرنگ کرنے والے اس شخص کا نام کیا تھا؟''

''مجھے نہیں معلوم۔''

''آپ نے انیلا سے پوچھا نہیں تھا؟''

''نہ میں نے پوچھا اور نہ ہی اُس نے از خود بتایا۔'' سلطان صدیقی نے جواب دیا۔ ''ہاں البتہ انیلا نے مجھے یہ ضرور بتایا تھا کہ وہ شخص سات سال کے لئے جیل چلا گیا تھا۔''

''اس کے علاوہ آپ اس شخص کے بارے میں کیا جانتے ہیں؟''

''کچھ بھی نہیں۔''

''آپ کے سسر نے کبھی اس شخص کا ذکر کیا؟''

''قطعی نہیں۔'' وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''اس سلسلے میں صرف انیلا ہی سے میری بات ہوئی تھی۔''

''سلطان صدیقی صاحب!'' میں نے اُس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ ''اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ آپ اس شخص کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے۔''

''کیا میرا اس شخص کے بارے میں جاننا بہت ضروری ہے؟''

''بہت ضروری۔'' میں نے پُر زور لہجے میں کہا۔

اُس نے پوچھا۔ ''ایسا کیوں ضروری ہے؟''

میں نے بتایا۔ ''ایسا اس لئے ضروری ہے کہ مذکورہ شخص آپ کی بیوی کے قتل کے الزام میں گرفتار ہو چکا ہے اور اس وقت یہاں ملزموں والے کٹہرے میں موجود ہے۔''

اُس نے چونک کر میرے مؤکل جبار احمد کو دیکھا۔

اس کے ساتھ ہی عدالت کا وقت ختم ہو گیا۔

میں نے جج کی طرف دیکھتے ہوئے استدعا کی۔ ''جناب عالی! استغاثہ کے گواہ سلطان صدیقی پر میری جرح مکمل نہیں ہوئی لہٰذا آئندہ پیشی پر گواہ کو عدالت میں حاضر ہونے کی تاکید کی جائے۔''

میری جرح کے انکشاف انگیز عارضی اختتام نے جج کو بھی چونکنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اُس نے وکیل استغاثہ کو ہدایت کر دی کہ آئندہ پیشی پر سلطان صدیقی کی حاضری کا خاص خیال رکھا جائے۔ وکیل استغاثہ نے جج کی ہدایت پر عمل کرنے کا یقین دلایا۔

''کوٹ اِز ایڈ جارنڈ!'' جج نے عدالت کی برخاستی کا اعلان کر دیا۔

اگلی پیش دس روز بعد تھی۔

ہم عدالت سے باہر آئے تو فضل کریم نے اندرونی جوش کو دباتے ہوئے کہا۔ ''بیگ صاحب، آپ کی جرح کے انداز نے مجھے بہت متاثر کیا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''آگے آگے دیکھئے، ہوتا ہے کیا۔''

وہ تشویش ناک لہجے میں بولا۔ ''بیگ صاحب! آپ نے بہت نازک معاملہ اٹھایا ہے۔ کہیں جبار پر اس کا برا اثر تو نہیں پڑے گا؟''

''کیسا برا اثر؟'' میں نے پوچھا۔

وہ بولا۔ ''میرا مطلب ہے، اگر عدالت میں یہ بات کھل گئی کہ جبار احمد اور انیلا ماضی میں گھر سے بھاگ گئے تھے اور وارث علی کے زخمی ہونے کی حقیقت کیا تھی تو اس طرح جبار کی پوزیشن کہیں کمزور تو نہیں ہو جائے گی؟''

''دیکھئے فضل کریم صاحب!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں جو کچھ بھی کر رہا ہوں، وہ اپنے مؤکل کی پوزیشن کو مضبوط کرنے کے لئے کر رہا ہوں۔ آپ اس سلسلے میں بالکل مطمئن رہیں۔ آئندہ آپ کو کچھ ایسی باتیں بھی سننا پڑیں گی، جن سے آج تک آپ لاعلم ہیں۔''

''آپ اپنے کام کو زیادہ بہتر سمجھتے ہیں جناب۔'' وہ سادگی سے بولا۔ ''میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ میرا بیٹا اس مصیبت سے نکل آئے۔''

میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ''فکر نہ کریں۔ میں اپنی سی پوری کوشش کر رہا ہوں۔ انشاء اللہ جبار احمد باعزت رہا ہو جائے گا۔''

''خدا آپ کی زبان مبارک کرے وکیل صاحب!'' اُس نے آسمان کی طرف دیکھتے

ہوئے کہا پھر مجھے دُعائیں دیتے ہوئے رخصت ہو گیا۔

میں اپنی گاڑی کی جانب بڑھ گیا۔

✿......✿
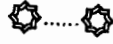
آئندہ پیشی پر استغاثہ کا نہایت ہی اہم گواہ سلطان صدیقی عدالت کے کمرے میں موجود نہیں تھا۔ وکیل استغاثہ نے اُس کی طرف سے بیماری کا سرٹیفکیٹ عدالت میں پیش کر دیا۔ جج نے ناگواری سے سرٹیفکیٹ کا جائزہ لیا اور عدالتی کارروائی کا آغاز کر دیا۔

استغاثہ کی جانب سے سلطان صدیقی کا گھریلو ملازم خادم حسین گواہی دینے کے لئے آیا۔ خادم حسین کی عمر لگ بھگ ستائیس سال تھی۔ وہ کھانا پکانے کے علاوہ چھوٹے موٹے گھریلو کام بھی کرتا تھا۔ وقوعہ کے روز وہ کچن میں رات کے کھانے کی تیاری میں مصروف تھا کہ اس نے سلطان صدیقی کی چیختی ہوئی آواز سنی۔ وہ لپک کر کچن سے باہر نکلا اور بنگلے کے برآمدے کی جانب بڑھا کیونکہ آواز اُدھر ہی سے آئی تھی۔ وہاں پہنچ کر اُس نے دیکھا کہ اُس کی مالکن انیلا فرش پر گری پڑی تھی اور اُس کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔

خادم حسین کا بیان ختم ہوا تو وکیل استغاثہ جرح کے لئے آگے بڑھا۔ اس نے سوالات کا سلسلہ شروع کرتے ہوئے پوچھا۔ ''خادم حسین! تم جب اپنے مالک سلطان صدیقی کی چیخ سے مشابہ آواز سن کر برآمدے میں پہنچے تھے تو تم نے وہاں کیا دیکھا تھا؟''

وہ بولا۔ ''مالکن فرش پر ڈھیر پڑی تھیں اور ان کے سر سے خون بڑی تیزی سے خارج ہو رہا تھا۔''

''مقتولہ انیلا کے قریب تم نے کوئی خاص چیز بھی دیکھی تھی؟''

''جی ہاں۔'' اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''ان کے نزدیک ہی ایک بڑے سائز کا رینچ پانا بھی پڑا ہوا تھا۔''

وکیل استغاثہ نے سیلوفین کی تھیلی میں ملفوف آلہ قتل جج کی میز سے اٹھایا اور خادم حسین کی آنکھوں کے سامنے جھلاتے ہوئے کہا۔ ''خادم حسین! کیا وہ رینچ پانا یہی تھا؟''

خادم حسین نے اثبات میں جواب دیا۔ ''جی ہاں، یہی تھا۔''

وکیل استغاثہ نے پوچھا۔ ''کیا تمہیں معلوم ہے یہ رینچ پانا کس کا ہے؟''

''یہ جبار پلمبر کے سوا اور کس کا ہو سکتا ہے؟'' خادم حسین نے جواب دیا۔ ''ہمارے بنگلے میں وہ ایک ہفتے سے پلمبرنگ کا کام کر رہا تھا۔ اُس کی آمد سے پہلے ایسا کوئی اوزار بنگلے کے اندر موجود نہیں تھا۔''

وکیل استغاثہ نے پوچھا۔ ''جبار احمد تمہیں کیسا آدمی لگا تھا؟''

''یہ تو مجھے شروع ہی سے مشکوک بندہ لگا تھا جناب۔'' خادم حسین نے جبار احمد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

وکیل استغاثہ نے اسی نوعیت کے دو چار مزید سوالات پوچھے پھر وہ اپنے لئے مخصوص نشست پر جا کر بیٹھ گیا۔

اپنی باری پر میں نے جرح کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔ ''خادم حسین! تمہیں سلطان صدیقی کے بنگلے پر کام کرتے ہوئے کتنا عرصہ ہوا ہے؟''

''کافی عرصہ ہو گیا ہے جناب۔''

''کافی عرصے کی کوئی مدت بھی تو ہوگی؟''

وہ سوچتے ہوئے بولا۔ ''لگ بھگ آٹھ سال تو ہو ہی گئے ہیں۔''

''خادم حسین۔'' میں نے سوالات کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''اس کا مطلب یہ ہے کہ سلطان صدیقی کی شادی تمہاری موجودگی ہی میں ہوئی تھی؟''

''بالکل میرے سامنے ہی ہوئی تھی جناب۔''

''تمہاری مالکن مقتولہ انیلا کا اپنے شوہر کے ساتھ کیسا رویہ تھا؟'' میں نے پوچھا۔

اُس نے جواب دیا۔ ''دونوں میں بہت اچھا سلوک تھا جناب۔ ویسے کبھی کبھی تلخ کلامی بھی ہو جاتی تھی۔''

''اس تلخ کلامی کی کوئی وجہ بھی تو ہوگی؟''

''ہوتی ہو گی جناب۔'' وہ بے پروائی سے بولا۔ ''مگر میں نے کبھی ان کے ذاتی معاملات میں دلچسپی لینے کی کوشش نہیں کی۔''

''خادم حسین! مقتولہ انیلا کا تمہارے ساتھ کیسا رویہ تھا؟''

''بہت اچھا رویہ تھا جناب۔'' اُس نے جواب دیا۔ ''وہ میرا بہت خیال رکھتی تھی۔''

''تمہارا قد کتنا ہے خادم حسین؟''

وہ اس اچانک اور غیر متعلق سوال پر بوکھلا گیا، پھر بولا۔ ''میں نے کبھی ناپا نہیں جناب۔''

میں نے کہا۔ ''خادم حسین، تم زیادہ وقت کچن میں گزارتے ہو۔ کھانا پکانے کے دوران میں انیلا بھی کچن میں آتی جاتی ہوگی؟''

''جی ہاں، وہ اکثر کھانا پکانے میں میرا ہاتھ بٹاتی رہتی تھیں۔'' اُس نے اُلجھن آمیز

نظروں سے مجھے دیکھا۔ ''میں سمجھ نہیں سکا، آپ کہنا کیا چاہتے ہیں۔''

''میں یہ کہنا چاہتا ہوں خادم حسین۔'' میں نے اُس کی آنکھوں میں تکتے ہوئے کہا۔ ''مقتولہ بقول تمہارے، اکثر کام میں تمہارا ہاتھ بٹاتی رہتی تھی۔ تمہیں تو یہ اندازہ ہوگا کہ وہ قد میں تم سے چھوٹی تھی یا بڑی؟''

''مجھے سخت اعتراض ہے جناب عالی۔'' وکیل استغاثہ نے فوراً اعتراض جڑ دیا۔ ''وکیل صفائی نے پھر فضول قسم کے سوالات شروع کر دیئے ہیں۔ اس سے ان کا مقصد محض عدالت کا قیمتی وقت برباد کرنا ہے۔ میں معزز عدالت سے پُرزور اپیل کرتا ہوں کہ میرے فاضل دوست کو ایسا کرنے سے باز رکھا جائے۔''

میں نے اپنی فائلوں پر ہاتھ مارتے ہوئے تیز لہجے میں کہا۔ ''آئی آلسو آبجیکٹ یور آنر۔ میری جرح سے نہیں بلکہ وکیل استغاثہ کی بے جا مداخلت سے عدالت کا قیمتی وقت ضائع ہونے کا احتمال ہے۔ اگر میرے فاضل دوست چاہتے ہیں کہ اس کیس کا جلد از جلد کوئی فیصلہ ہو جائے تو میں ان سے درخواست کروں گا کہ وہ میری جرح کے دوران میں خوامخواہ رُکاوٹ پیدا کرنے کی کوشش نہ کریں۔''

جج نے وکیل استغاثہ کے اعتراض کو رد کرتے ہوئے مجھے جرح جاری رکھنے کا اشارہ کیا۔

میں نے گواہ خادم حسین کی طرف دیکھتے ہوئے اپنا سوال دہرایا۔ اس نے جواب دیا۔

''جناب، مالکن مجھ سے عمر میں کم اور قد میں زیادہ تھیں۔''

میں نے پوچھا۔ ''خادم حسین! تم نے ابھی اس معزز عدالت میں آلہ قتل کی شناخت کرتے ہوئے وکیل استغاثہ کے ایک سوال کے جواب میں بتایا ہے کہ مذکورہ آلہ قتل یعنی رنچ پانا ملزم جبار احمد کی ملکیت تھا؟''

''جی ہاں، میں نے یہی جواب دیا ہے۔''

''کیا اس رنچ پانے کی کوئی مخصوص پہچان تھی؟''

''یہ تو میں نہیں جانتا۔''

''پھر تم نے تصدیق کس بناء پر کی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

اُس نے جواب دیا۔ ''میں نے ایسا ہی رنچ پانا مالکن انیلا کی لاش کے پاس پڑا دیکھا تھا۔ پھر اس پر ملزم کی انگلیوں کے نشانات بھی تو پائے گئے ہیں۔ ہمارے بنگلے میں پلمبرنگ سے متعلق تمام سامان جبار ہی لے کر آیا تھا۔ یہ پانا جبار کے سوا کسی اور کا ہو ہی نہیں سکتا تھا۔''

میں نے پوچھا۔ ''خادم حسین، تم نے ابھی تھوڑی دیر پہلے وکیل استغاثہ کے ایک سوال کے جواب میں بتایا ہے کہ میرا مؤکل تمہیں شروع ہی سے ایک مشکوک شخص لگا تھا۔ شروع ہی سے تمہاری کیا مراد تھی؟''

ایک لمحے کے تامل کے بعد اُس نے جواب دیا۔ ''شروع سے میری مراد وہ دن تھا جب سے وہ اس بنگلے میں آیا تھا۔''

''کیوں، کیا اس دن کوئی خاص بات ہوگئی تھی؟''

''کوئی خاص بات تو نہیں ہوئی تھی۔'' وہ گڑبڑا گیا۔

''پھر؟'' میں نے اُس کی آنکھوں میں جھانکا۔ ''جب کوئی ایسی ویسی بات نہیں ہوئی تھی تو پھر تمہیں میرا مؤکل مشکوک کیوں لگا تھا؟''

وہ جز بز ہو کر بولا۔ ''بس جی مجھے یوں محسوس ہوا تھا جیسے یہ جتنا زمین کے اوپر ہے اتنا ہی زمین کے اندر بھی ہے۔''

''گویا میرا مؤکل محض اپنی پستہ قامتی کی وجہ سے تمہیں مشکوک شخص دکھائی دیا تھا؟'' میں نے کڑے تیوروں سے اُسے گھورا۔

وہ بوکھلاہٹ آمیز لہجے میں بولا۔ ''یہ بات بھی تھی اور اس کے علاوہ بھی ایک بات تھی۔'' وہ وکیل استغاثہ کی طرف دیکھنے لگا۔

''دوسری بات کیا تھی؟'' میں نے فوراً سوال کر دیا۔ ''درحقیقت میں وکیل استغاثہ کو بولنے کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔

خادم حسین نے جواب دیا۔ ''دوسری بات یہ تھی کہ وہ جب تک بنگلے میں کام کرتا رہا، مالکن انیلا کو بڑی گہری نظروں سے گھورتا رہتا تھا۔ مجھے اس کا اس انداز میں مالکن کو دیکھنا بہت برا لگتا تھا۔''

''کیا مقتولہ کو یہ بات محسوس نہیں ہوئی تھی؟''

''میرا خیال ہے، ضرور محسوس ہوئی ہوگی۔''

میں نے پوچھا۔ ''کیا مقتولہ نے کبھی اس حرکت پر میرے مؤکل کو ٹوکا بھی تھا؟''

اُس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''نہیں جناب، انیلا صاحبہ نے کبھی اسے نہیں ٹوکا تھا اور مجھے اس بات پر حیرت بھی تھی۔''

''خادم حسین!'' میں نے سوالات کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''تمہارا کہنا ہے کہ وقوعہ کے روز تم باورچی خانے میں رات کا کھانا تیار کر رہے تھے جب سلطان صدیقی

نے تمہیں چیختی آواز میں پکارا تھا۔ کیا سلطان صدیقی کی آواز سے پہلے بھی تم نے کوئی آواز سنی تھی؟''

''کس قسم کی آواز جناب؟''

''مثلاً کوئی گھٹی ہوئی، چیخ سے مشابہ آواز؟''

اُس نے نفی میں جواب دیا۔ میں نے پوچھا۔ ''کوئی ٹھک کی آواز...... یا دھم کی آواز...... یا دھب کی آواز......؟''

''نہیں جناب! میں نے ایسی کوئی آواز نہیں سنی تھی۔'' اُس نے جواب دیا۔ ''میں اپنے کام میں بہت مصروف تھا۔''

''لیکن اس مصروفیت میں تم نے سلطان صدیقی کی پکار تو سن لی تھی خادم حسین؟'' میں نے اُس کے چہرے پر نظر جماتے ہوئے کہا۔

وہ بولا۔ صدیقی صاحب زور سے چلائے تھے۔''

میں نے کہا۔ ''صدیقی صاحب کے زور سے چلانے سے چند لمحات پیشتر مقتولہ ملزم جبار احمد کے ساتھ خوب چیخ چلا کر باتیں کر رہی تھی۔ دونوں میں کام کے معاوضے پر تلخ کلامی ہو رہی تھی۔ یہ آوازیں تو تم نے یقیناً سنی ہوں گی؟''

''میں معذرت چاہوں گا جناب۔ وہ سادہ سے لہجے میں بولا۔ ''میں نے ایسی آوازیں نہیں سنی تھیں۔''

وکیل استغاثہ نے کہا۔ ''خادم حسین، اس وقت تمہارا دھیان باورچی خانے کے کام میں لگا ہوا تھا۔''

''شاید یہی بات ہوگی۔'' خادم حسین نے مختصراً کہا۔

میں نے جج کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ''دیٹس آل یور آنر۔ مجھے اور کچھ نہیں پوچھنا۔''

خادم حسین کے بعد سلطان صدیقی کی گھریلو ملازمہ جنت بی بی نے اپنا بیان ریکارڈ کروایا۔ وہ ایک اُدھیڑ عمر عورت تھی۔ بنگلے میں صفائی ستھرائی اور جھاڑ پونچھے کا تمام کام اس کے ذمے تھا۔ وکیل استغاثہ نے چند سوالات کے بعد اُس کی جان چھوڑ دی۔ وہ تمام سوالات عام اور سرسری نوعیت کے تھے۔

میں جرح کے لئے جنت بی بی والے کٹہرے کے پاس آیا اور کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے سوال کیا۔

''جنت بی بی! تم جبار احمد کو کب سے جانتی ہو؟''

''جب سے وہ اس بنگلے پر آیا تھا۔''

میں نے پوچھا۔''تم نے اُسے پہلی مرتبہ کب دیکھا تھا؟''

''ایک ہفتہ پہلے۔'' اُس نے جواب دیا۔''وہ انیلا بی بی کو پوچھتا ہوا اس بنگلے تک پہنچا تھا۔''

''کیا وہ انیلا سے ملنے کے لئے آیا تھا؟''

''ہاں......آں...... مجھے کیا معلوم جی......'' وہ گڑبڑا گئی۔

میں نے تیز لہجے میں پوچھا۔''گھنٹی کی آواز سن کر گیٹ تم نے ہی کھولا تھا؟''

''گیٹ تو میں نے ہی کھولا تھا جی۔'' اُس کے لہجے سے گھبراہٹ عیاں تھی۔ اُس کی گھبراہٹ میں خوف کی آمیزش بھی تھی۔

''ملزم جبار احمد نے تمہیں کیا بتایا تھا؟''

''اُس نے کہا تھا، وہ انیلا بی بی کا کوئی رشتے دار ہے۔'' جنت بی بی نے جواب دیا۔

''اور کہ وہ حیدر آباد سے آیا ہے۔''

''ابھی تھوڑی دیر پہلے تم نے کہا ہے، تمہیں نہیں معلوم تھا کہ وہ انیلا سے ملنے آیا تھا؟'' میں نے اُسے کڑے تیوروں سے گھورا۔

وہ گھبراہٹ آمیز لہجے میں بولی۔''میں اتنی پیچیدہ اور مشکل باتیں نہیں سمجھ سکتی جناب۔ بس جبار نے کہا کہ وہ انیلا بی بی سے ملنا چاہتا ہے اور میں نے بنگلے کے اندر جا کر انیلا بی بی کو بتا دیا۔ بس جی میں اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتی۔''

میں نے پوچھا۔''کیا تمہاری انیلا بی بی نے میرے مؤکل کو بنگلے کے اندر بلایا تھا؟''

''جی ہاں، وہ کچھ دیر تک ڈرائنگ رُوم میں بیٹھا تھا۔''

''مقتولہ بھی اس کے ساتھ ہی ڈرائنگ رُوم میں بیٹھی تھی؟''

''جی، وہ بھی تھوڑی دیر وہاں بیٹھی تھیں۔''

میں نے پوچھا۔''ان کے درمیان کیا گفتگو ہوئی تھی؟''

''مجھے کیا پتہ جناب۔'' وہ بے پروائی سے بولی۔''میں کوئی چھپ کر ان کی باتیں سن رہی تھی؟''

''جنت بی بی!'' میں نے اُس کے کٹہرے کی ریلنگ کو تھامتے ہوئے سوال کیا۔''جب دوسرے دن میرا مؤکل پلمبر کے روپ میں بنگلے میں وارد ہوا تو تمہیں کوئی حیرت نہیں ہوئی تھی؟''

وہ ہاتھ ہوا میں لہراتے ہوئے بولی۔''اس میں بھلا حیرت کی کون سی بات ہے؟''

''اس میں حیرت کا پہلو یہ ہے جنت بی بی۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔''کہ خود کو تمہاری انیلا بی بی کا رشتے دار بتانے والا شخص اس کے بنگلے میں مزدوری کر رہا تھا۔ یہ سب کچھ دیکھ کر تمہارے اندر تجسس نہیں جاگا؟''

وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔''میں تو یہی سمجھی تھی جناب کہ یہ کوئی انیلا بی بی کا غریب رشتے دار ہوگا۔ حیدر آباد سے کام کے سلسلے میں کراچی آیا ہوگا اور انیلا بی بی نے اسے اپنے بنگلے میں کام دے دیا ہوگا۔ یہی وجہ تھی کہ میں اس سلسلے میں زیادہ متجسس بھی نہیں ہوئی تھی۔''

''تم نے انیلا بی بی سے تو اس سلسلے میں بات کی ہوگی؟''

''میں نے ان سے کچھ نہیں پوچھا تھا۔''

جنت بی بی ایک غیر منطقی جواب دے رہی تھی۔ ایسا ممکن نہیں ہوسکتا تھا کہ اس نے جبار احمد کے حوالے سے انیلا کو کریدا نہ ہو۔ بہر حال میں نے اس سے پوچھا۔

''جنت بی بی! تم نے گھر میں کسی اور شخص سے تو اس کا تذکرہ کیا ہوگا۔''

''کس کا تذکرہ جی؟'' اُس نے جواباً سوال کر ڈالا۔

''یہی کہ انیلا بی بی نے اپنے ایک غریب رشتے دار کو گھر میں کام پر لگا دیا ہے۔''

وہ جلدی سے بولی۔''نہیں جی، میں تو اس بات کو بھول ہی گئی تھی۔''

میں نے اچانک سوال کیا۔''جنت بی بی، وقوعہ کے وقت تم کہاں تھیں؟''

''یہ وقوعہ کیا ہوتا ہے جی؟'' اُس کے سوال میں حیرت تھی۔

میں نے پہلے اُسے وقوعہ کا مفہوم اور مطلب سمجھایا پھر اپنے سوال کو دہرایا۔ پوری بات سننے کے بعد اُس نے جواب دیا۔''میں اس وقت بنگلے کی چھت پر تھی۔''

اس کے بعد میرے ہر سوال کا جواب اس نے یہی دیا۔''میں کچھ نہیں جانتی...... میں نے کچھ نہیں سنا...... میں نے کچھ نہیں دیکھا۔ میں اس وقت بنگلے کی چھت پر تھی وغیرہ وغیرہ۔''

پھر عدالت کا وقت ختم ہوگیا۔ جج نے ایک ماہ بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کر دی۔

✡......✡
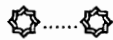
منظر اسی عدالت کا تھا اور گواہوں کے کٹہرے میں مقتولہ کا شوہر سلطان صدیقی میری

جرح کا سامنا کرنے کے لئے تیار کھڑا تھا۔ تاہم وہ چہرے سے خاصا نروس نظر آ رہا تھا۔
میں نے جج کی اجازت کے بعد سوالات کا سلسلہ شروع کرتے ہوئے پوچھا۔ ''صدیقی صاحب! اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟''
''اللہ کا شکر ہے۔'' وہ سرسری سے لہجے میں بولا۔
میں نے اُس کی بیماری کی تفصیل میں جانے کے بجائے اگلا سوال کیا۔ ''سلطان صدیقی صاحب! کیا آپ واقعی یہ بات نہیں جانتے تھے کہ آپ کے گھر میں کام کرنے والا پلمبر ماضی میں آپ کے مرحوم سالا صاحب، وارث علی پر قاتلانہ حملے کے الزام میں سات سال کی سزا پا کر جیل جا چکا تھا؟''
''آپ یقین کریں، میں واقعی اس بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔''
''میں نے یقین کر لیا۔'' میں نے دوستانہ لہجے میں کہا پھر سلسلہ سوالات کو دراز کرتے ہوئے پوچھا۔ ''اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ آپ اس حقیقت سے بھی بے خبر ہیں کہ آپ کے مرحوم سالا صاحب پر فائرنگ جبار احمد نے نہیں بلکہ آپ کی مقتولہ بیوی انیلا نے کی تھی؟''
''کیا؟''
''جی؟''
''اوہ!''
بہ یک وقت کئی زبانوں نے یہ الفاظ ادا کئے۔ جن افراد کے منہ حیرت سے کھلے ہوئے تھے اور آنکھوں میں مجسم سوال واضح نظر آ رہے تھے، ان میں استغاثہ کے گواہ سلطان صدیقی کے علاوہ وکیل استغاثہ اور میرے مؤکل کا باپ فضل کریم بھی شامل تھے۔ فضل کریم اور بہت سی حقیقتوں کی طرح اس راز سے بھی ناواقف تھا۔
جج نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔ ''بیگ صاحب! آپ اپنی بات کی سچائی کے لئے کوئی ثبوت پیش کر سکتے ہیں؟''
''جی ہاں جناب۔'' میں نے جواباً کہا۔ ''میں مناسب وقت آنے پر ایسا گواہ پیش کروں گا جو میری بات کی تصدیق کرے گا۔''
وکیل استغاثہ کچھ کہنے کے لئے منہ کھولنا ہی چاہتا تھا کہ جج نے مجھے جرح جاری رکھنے کا اشارہ کر دیا۔ میں نے کٹہرے میں کھڑے ہوئے سلطان صدیقی کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔ ''آپ نے ابھی تک میرے سوال کا جواب نہیں دیا؟''
اُس نے جواب دیا۔ ''میں واقعی اس حقیقت سے بے خبر تھا۔''

میں نے سوال کیا۔ ''کیا آپ یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ آپ کی بیوی آپ سے شادی سے پہلے اس کیس کے ملزم اور میرے مؤکل جبار احمد سے محبت کرتی تھی؟''
''یہ میرے لئے بالکل نئی اطلاع ہے۔'' اُس کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات ابھر آئے۔
میں نے کہا۔ ''پھر تو یہ بھی نئی اطلاع ہی ہوگی کہ ماضی میں ایک مرتبہ آپ کی بیوی جب کہ اُس کی آپ سے شادی نہیں ہوئی تھی، میرے مؤکل کے ساتھ گھر سے بھی بھاگ گئی تھی۔''
وہ برہمی سے بولا۔ ''یہ کیا بکواس ہے؟''
''یہ بکواس نہیں، حقیقت ہے صدیقی صاحب!'' میں نے کہا۔
''مجھے اعتراض ہے جناب عالی!'' وکیل استغاثہ نے فوراً مداخلت کی۔ ''میرے فاضل دوست مقتولہ کی کردار کشی کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔''
میں نے دونوں ہاتھ ہوا میں لہراتے ہوئے کہا۔ ''جناب عالی! میں نے ایسی کوئی مذموم کوشش نہیں کی۔ اگر حقائق کو عدالت میں پیش کرنے سے کسی کے کردار کا تذکرہ سامنے آتا ہے تو مجبوری ہے۔ میں نے تو عدالت کو صورتِ حال سے آگاہ کرنے کی سعی کی ہے۔ اور میرے اس بیان کی تصدیق مقتولہ کا باپ امیر الدین اور میرے مؤکل کا باپ فضل کریم بھی کریں گے۔''
مذکورہ دونوں افراد اس وقت عدالت کے کمرے میں موجود تھے۔ جج نے باری باری ان دونوں سے میرے مؤقف کے بارے میں سوالات کئے۔ فضل کریم نے جلد اور امیر الدین نے بدیر اس حقیقت کی توثیق کر دی۔ اس موقع پر وکیل استغاثہ نے اپنا ''فرض'' پورا کرنا ضروری سمجھا۔
''جناب عالی!'' اُس نے جج کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''میرا خیال ہے، ہم اصل موضوع سے ہٹ رہے ہیں۔''
''وہ کس طرح وکیل صاحب؟'' جج نے استفسار کیا۔
وکیل استغاثہ نے کہا۔ ''جناب عالی! اس عدالت میں انیلا مرڈر کیس کی سماعت ہو رہی ہے اور میرے فاضل دوست کہیں بہت دُور، ماضی کے غاروں میں بھٹک رہے ہیں۔ وہ گڑے مُردے اُکھاڑ کر کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں؟''
جج نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا اور بولا۔ ''آپ اس سلسلے میں کیا کہتے ہیں بیگ

صاحب؟"

میں نے کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔"جناب عالی! پہلی بات تو یہ ہے کہ میں انیلا مرڈر کیس ہی کو حل کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ چونکہ اس کیس کی جڑیں ماضی کے قبرستان میں دفن ہیں اس لئے مجھے بہت دُور تک کھدائی کرنا پڑ رہی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ میں آگے چل کر جن حقائق کو آشکار کرنا چاہتا ہوں، ان کو صحیح طور پر سمجھنے کے لئے مقتولہ اور ملزم کے ماضی کو کھنگالنا بہت ضروری ہے۔ تیسری اور آخری بات یہ ہے کہ میرے فاضل دوست خاطر جمع رکھیں۔ میں اصل موضوع کے ساتھ ساتھ چل رہا ہوں۔ ابھی معزز عدالت میں مقتولہ اور ملزم کے باپ نے اس بات کی تصدیق کی ہے کہ مقتولہ اور ملزم ماضی میں ایک مرتبہ گھر سے فرار ہو گئے تھے۔"

"آخر آپ اس بات سے ثابت کیا کرنا چاہتے ہیں؟" وکیل استغاثہ نے زِچ ہو کر کہا۔

میں نے متحمل لہجے میں جواب دیا۔"میرے فاضل دوست! میں اس تمام گفت وشنید سے یہ باور کرانا چاہتا ہوں کہ میرا مؤکل بے گناہ ہے۔ مقتولہ انیلا کے قتل میں اس کا کوئی ہاتھ نہیں ہے اور یہ کہ اسے ایک گہری سازش کے تحت اس معاملے میں پھانسا گیا ہے۔"

"ملزم کے خلاف ایسی سازش کون کر سکتا ہے؟" وکیل استغاثہ نے براہِ راست مجھ سے سوال کیا۔

میں نے جواب دیا۔"میں اسی شخص کو تلاش کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔"

"آپ اپنی کوشش میں معزز عدالت کا قیمتی وقت برباد کرنے کے سوا کچھ نہیں کر رہے میرے فاضل دوست۔" وکیل استغاثہ نے تمسخرانہ لہجے میں کہا۔"قاتل گرفتار ہو چکا ہے۔ پولیس کسٹڈی میں وہ اپنے جرم کا اقبال بھی کر چکا ہے۔"

"آئی آبجیکٹ، آئی آبجیکٹ۔" میں نے جج کی طرف دیکھتے ہوئے احتجاجی لہجے میں کہا۔"یور آنر، وکیل استغاثہ میرے مؤکل کے لئے قاتل کا لفظ استعمال کر رہے ہیں۔ مجھے اس پر سخت اعتراض ہے۔ جب تک میرے مؤکل پر جرم ثابت نہیں ہو جاتا، وہ صرف ملزم کہلائے گا۔" پھر میں نے اپنا روئے سخن وکیل استغاثہ کی جانب موڑا اور سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔"میرے فاضل دوست، پولیس کسٹڈی میں دیئے گئے بیان کی حقیقت سے آپ بخوبی آگاہ ہیں۔ ملزم کے اقبالی بیان کے ساتھ اگر واقعاتی شہادتیں نہ ہوں تو اس کی کوئی اہمیت نہیں رہتی۔"

جج نے اپنی کرسی پر پہلو بدلا اور دیوار گیر کلاک کی جانب دیکھتے ہوئے مجھ سے استفسار

کیا۔"بیگ صاحب! آپ گواہ سے کوئی اور سوال پوچھنا چاہتے ہیں؟"

"آف کورس یور آنر۔" میں نے سر کو تعظیمی انداز میں ہلکا سا خم دیتے ہوئے کہا پھر روئے سخن سلطان صدیقی کی جانب موڑتے ہوئے سوال کیا۔

"سلطان صدیقی صاحب! آپ کی مقتولہ بیوی کی عمر کیا تھی؟"

اُس نے جواب دیا۔"لگ بھگ پچیس سال۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ شادی کے وقت مقتولہ کی عمر بائیس سال تھی؟" میں نے پوچھا۔

وہ بولا۔"آپ کا اندازہ درست ہے۔ ہماری شادی کم وبیش تین سال قبل ہوئی تھی۔"

میں نے پوچھا۔"آپ کی مقتولہ بیوی کا وزن کتنا تھا؟"

یہ سوال پوچھتے ہوئے میں نے کن انکھیوں سے وکیل استغاثہ کو بھی دیکھا۔ اُس کے چہرے پر مجھے برہمی، ناگواری اور بیزاری کے تاثرات دکھائی دیئے تھے۔ میں نے اُس کی حالت سے اندازہ لگایا کہ وہ پھٹ پڑنے کے قریب تھا۔

سلطان صدیقی نے میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے بتایا۔"انیلا کا وزن تقریباً پچاس کلوگرام تھا۔"

"اور قد...... آئی مین ہائیٹ؟"

"چھیاسٹھ اِنچ۔"

"یعنی پانچ فٹ چھ اِنچ؟"

"جی ہاں، یہ اتنے ہی ہوتے ہیں۔" اُس نے جواب دیا۔

میں نے پوچھا۔"صدیقی صاحب! کیا آپ کو معلوم ہے کہ تین سال قبل انیلا نامی اپنی جس دفتری ملازمہ سے آپ نے شادی رچائی تھی، وہ پہلے سے شادی شدہ تھی؟"

عدالت میں ایک دم سناٹا چھا گیا، پھر حاضرین عدالت آپس میں سرگوشیانہ انداز میں چہ میگوئیاں کرنے لگے۔ اس بھنبھناہٹ میں سلطان صدیقی کی چیخ نما آواز ابھری۔

"اِٹ اِز ٹو مچ مسٹر ڈیفنس کونسلر!"

میں نے کہا۔"آنکھیں بند کر لینے سے حقیقت نہیں بدل جاتی صدیقی صاحب۔ حقیقت یہی ہے کہ جب مقتولہ انیلا ملزم جبار احمد کے ساتھ حیدرآباد سے فرار ہوئی تھی تو ان دونوں نے نواب شاہ جا کر باقاعدہ شادی کر لی تھی۔ میں شادی کے گواہ اور نکاح نامہ بطور ثبوت معزز عدالت میں پیش کر سکتا ہوں۔"

"یہ بات تو میرے علم میں بھی نہیں تھی۔" فضل کریم کی حیرت میں ڈوبی ہوئی آواز اُبھری۔ "جبار نے اس سلسلے میں کچھ بھی نہیں بتایا تھا۔"

امیر الدین نے سٹپٹائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میں بھی ابھی سن رہا ہوں۔ کاش مجھے پہلے پتہ چل جاتا۔"

سلطان صدیقی ریلنگ کا سہارا لینے پر مجبور ہو گیا تھا۔ واضح طور پر اُس کا پورا وجود ہولے ہولے لرز رہا تھا۔ جج گہری دلچسپی سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے موقع کی اہمیت کا اندازہ لگاتے ہوئے سلطان صدیقی پر سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ اس دوران میں وکیل استغاثہ کو سانپ سونگھ گیا تھا۔

"صدیقی صاحب!" میں نے تیز لہجے میں پوچھا۔ "جب آپ انیلا کی گھٹی ہوئی چیخ سن کر باتھ روم سے نکلے تھے تو اس وقت کیا بجا تھا؟"

"میرا خیال ہے وہ سوا پانچ کا وقت تھا۔"

"آپ نے برآمدے میں آ کر دیکھا تو انیلا بے سدھ فرش پر پڑی تھی اور اُس کے سر سے خون بہہ رہا تھا؟"

"جی...... جی......" وہ ہکلایا۔

"بقول آپ کے، اسی وقت آپ نے اپنے ملازم خادم حسین کو آواز دی۔" میں نے کہا۔ "اس کے فوراً بعد آپ نے پولیس کو اس واردات کی اطلاع دینے کے لئے فون کیا تھا؟"

"میں نے بالکل...... بالکل ایسا ہی کیا تھا۔"

میں نے کہا۔ "پولیس کے روزنامچے اور اس کے پیش کردہ چالان میں درج ہے کہ متعلقہ پولیس اسٹیشن پر آپ کی اطلاع ٹھیک شام چھ بجے مورخہ چودہ اکتوبر کو موصول کی گئی تھی۔ آپ معزز عدالت کو بتائیں گے کہ آپ نے فوراً ہی پولیس کو فون کر دیا تھا پھر وہاں تک اطلاع پہنچنے میں لگ بھگ پینتالیس منٹ کیوں لگ گئے؟"

"پولیس والوں نے ٹائم نوٹ کرنے میں یقیناً غلطی کی ہو گی۔"

"گویا آپ نے کوئی غلطی نہیں کی تھی؟"

اُس نے اُلجھن آمیز انداز میں مجھے دیکھا۔ میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "میرا مطلب ہے، آپ نے تو بروقت پولیس والوں کو اس سانحے کی اطلاع دی تھی نا؟"

"جی ہاں۔" اُس کے لہجے میں اُلجھن کی آمیزش ابھی موجود تھی۔

میں نے کہا۔ "اگر آپ نے ٹھیک سوا پانچ بجے پولیس کو اس واردات کے بارے میں

مطلع کر دیا تھا تو پھر اپنی مضروب بیوی کو ہسپتال پہنچانے میں اتنی تاخیر سے کام کیوں لیا؟ جبکہ آپ بہ خوبی جانتے تھے کہ انیلا کی کھوپڑی بری طرح چٹخ چکی تھی۔ وہ بے ہوش تھی اور خون اُس کے پھٹے ہوئے سر سے بڑی تیزی سے نکل رہا تھا۔ فار یور کائنڈ انفارمیشن، انیلا کو جب ہسپتال پہنچایا گیا، اس وقت سات بج چکے تھے یعنی اُسے زخمی اور بے ہوش ہوئے پورے دو گھنٹے گزر چکے تھے۔ جبکہ اس نازک ترین صورت حال میں اُسے فوری طبی امداد کی ضرورت تھی۔ کیوں...... اتنی تاخیر کیوں ہوئی؟"

وہ منمنایا۔ "میں پولیس کی آمد کا انتظار کر رہا تھا۔"

"پولیس کی آمد کا انتظار کر رہے تھے یا انیلا کی موت کا انتظار؟" میرے لہجے میں پوشیدہ سنگینی کو محسوس کر کے سلطان صدیقی سہم گیا پھر سراسیمہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے لکنت آمیز انداز میں بولا۔

"کک...... کیا...... آپ مجھے شک کی نظر سے دیکھ رہے ہیں۔ آپ میری نیت پر شک کر رہے ہیں کیا؟ مم...... میں اُس وقت حواس باختہ ہو گیا تھا۔"

"جیسے اب ہو رہے ہیں؟"

وکیل استغاثہ نے اپنی موجودگی کا احساس دلاتے ہوئے احتجاج کیا۔ "مجھے اعتراض ہے جناب عالی! میرے فاضل دوست معزز گواہ کو ہراساں کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

"میں تو صرف اپنے مؤکل کو بے گناہ و بےقصور ثابت کرنے کی سعی کر رہا ہوں میرے محترم دوست۔" میں نے نہایت سادگی سے کہا۔

وہ تلخی سے بولا۔ "اور اس سعی میں آپ معزز گواہ کو قاتل کے خانے میں فٹ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں؟"

"میرا ارادہ آپ نے کیسے بھانپ لیا؟"

"آپ کے طریقہ کار سے۔" وہ جلدی سے بولا۔ "بہ الفاظ دیگر آپ کے طریقہ واردات سے۔"

میں نے زیرلب مسکراتے ہوئے کہا۔ "میرے فاضل دوست! میں آپ کے الفاظ کا برا نہیں مناؤں گا اور نہ ہی معزز عدالت میں اپنا کوئی احتجاج ریکارڈ کراؤں گا۔" ایک لمحے کے توقف سے میں نے اضافہ کیا۔ "اس وقت میرا بے گناہ مؤکل قاتل کے خانے میں بند ہے۔ اس بے گناہ کو اس خانے سے نکالنے کے لئے ایک قاتل کی ضرورت ہے۔ میں جن دلائل کی بنا پر اپنے مؤکل کو بے گناہ ثابت کروں گا، وہی دلائل کسی دوسرے شخص کو قاتل

کے خانے میں فٹ کر دیں گے اور...... اس کا فیصلہ معزز عدالت کا کام ہے۔ ہم دونوں تو اپنی سی کوشش ہی کر سکتے ہیں۔''

وکیل استغاثہ ایسی نظر سے مجھے دیکھنے لگا جیسے پوری بات اُس کے پلے نہ پڑی ہو۔ میں نے بھی وضاحت ضروری نہ سمجھی اور گواہ سلطان صدیقی کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''صدیقی صاحب!'' میں نے اُس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے معنی خیز لہجے میں سوال کیا۔ ''جنت بی بی، آپ کے پاس کب سے کام کر رہی ہیں؟''

''دس بارہ سال سے۔'' اُس نے جواب دیا۔

میں نے کہا۔ ''اس کا مطلب ہے، وہ آپ کی قابل اعتماد ملازمہ ہے۔''

''ظاہر ہے، جو عرصے سے میرے پاس کام کر رہی ہے، وہ قابل اعتماد ہی ہو گی۔'' اُس نے کپکپاتی ہوئی آواز میں کہا۔

میں نے پوچھا۔ ''جنت بی بی نے آپ کو ملزم کے بارے میں کیا بتایا تھا؟''

''جی...... مم...... مجھے تو کچھ نہیں بتایا تھا۔'' وہ ہکلاتے ہوئے بولا۔

''اچھی طرح سوچ لیں صدیقی صاحب۔'' میں نے اُس کی آنکھوں میں ڈوبتے ہوئے سنسنی خیز لہجے میں کہا۔ ''بعد میں کہیں آپ کو اپنا بیان بدلنا نہ پڑے۔''

''میں نے جو کچھ کہا ہے، سچ کہا ہے۔''

''کیا یہ سچ ہے کہ جنت بی بی نے آپ کو ملزم کے بارے میں ایک خصوصی رپورٹ دی تھی؟'' میں نے جارحانہ انداز میں سوال کیا۔

''میں کسی کی باتوں میں آنے والا نہیں ہوں۔ میں نے خود اپنے کانوں سے......'' بولتے بولتے وہ اچانک رُک گیا۔ پھر سراسیمہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے نحیف و نزار آواز میں اضافہ کیا۔ ''مم...... میرا مطلب ہے، میں جب تک اپنے کانوں سے نہ سن لوں، اس وقت تک یقین نہیں کرتا۔''

''اس کا مطلب میں بخوبی سمجھ رہا ہوں۔'' میں نے ذو معنی لہجے میں کہا اور اُس کے چہرے پر نظر جما دی۔

وہ نظر چرا کر دائیں بائیں دیکھنے لگا۔

میں نے کہا۔ ''صدیقی صاحب! آپ اپنا ادھورا جملہ تو پورا کر دیں۔ آپ نے خود اپنے کانوں سے کیا سنا تھا؟''

اُس نے امداد طلب نظر سے وکیل استغاثہ کو دیکھا پھر لرزیدہ آواز میں بولا۔ ''میں نے

کچھ نہیں سنا...... میں نے کچھ نہیں دیکھا...... میں نے کچھ نہیں کیا۔''

''پھر اتنے نروس کیوں ہو رہے ہیں؟''

''میری طبیعت...... پانی......'' سلطان صدیقی کٹہرے ہی میں بیٹھ گیا۔

اس کے ساتھ ہی عدالت کا وقت ختم ہو گیا۔

جج میری جرح کے انداز اور سوالات کے مقصد کو بخوبی سمجھ رہا تھا۔ تمام کارروائی کے دوران میں وہ پوری دلچسپی اور توجہ سے ہر بات کا جائزہ لیتا رہا تھا۔ اُس نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

''بیگ صاحب! آپ آئندہ پیشی پر مقتولہ اور ملزم کی شادی کے گواہ اور نکاح نامے کو بطور ثبوت عدالت میں پیش کر سکتے ہیں۔''

میں نے اثبات میں جواب دیا۔

وکیل استغاثہ نے کہا۔ ''یور آنر، میں اگلی پیشی پر ملزم پر جرح کا ارادہ رکھتا ہوں۔ صفائی کے گواہوں کی باری بعد میں آنا چاہیے۔''

جج نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا، میں نے کہا۔ ''ٹھیک ہے جناب عالی! آئندہ پیشی پر میرے مؤکل کا تفصیلی بیان اور جرح ہو جائے تو زیادہ بہتر بات ہے۔ اس کے ساتھ ہی میں معزز عدالت سے درخواست کروں گا کہ آئندہ پیشی پر میڈیکل افسر کو بھی عدالت میں حاضری کی زحمت دی جائے۔ میں انکوائری افسر اور میڈیکل افسر سے چند نہایت ہی اہم سوالات کرنا چاہتا ہوں۔''

جج نے متعلقہ عدالتی عملے کو میری درخواست کے بہ موجب ہدایات جاری کر دیں اور ساتھ ہی مجھے بھی تاکید کی کہ میں جبار احمد اور انیلا کی نواب شاہ میں ہونے والی شادی کا ثبوت فراہم کروں۔ میں نے ایسا کرنے کی جج کو یقین دہانی کرا دی۔

جج نے پندرہ روز بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کر دی۔

۞...... ۞
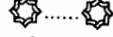
آئندہ پیشی پر میں نے پیش کار سے مل کر اپنا کیس شروع میں لگوا لیا تھا تاکہ ہمیں زیادہ سے زیادہ وقت مل سکے۔ اس کیس سے متعلق تمام افراد عدالت میں موجود تھے۔ جج کی آمد کے بعد عدالتی کارروائی کا آغاز ہوا۔ میرے مؤکل ملزم جبار احمد نے اپنا حلفیہ بیان ریکارڈ کروایا۔ میں نے جستہ جستہ چند سوالات کیے پھر وکیل استغاثہ نے جرح شروع کر دی۔

جبار احمد کا تفصیلی بیان مبنی بر سچ تھا۔ وکیل استغاثہ خاصی دیر تک گھما پھرا کر مختلف

زاویوں سے سوالات کرتا رہا لیکن جبار ذرا بھی نروس یا ہراساں نہیں ہوا۔ آخر بے بس ہو کر وکیل استغاثہ نے اپنی جرح ختم کر دی۔

اس کے بعد انکوائری افسر گواہوں والے کٹہرے میں آیا۔ اُس کا نام سرفراز شاہ تھا اور وہ ایک انسپکٹر تھا۔ جج کی اجازت حاصل کرنے کے بعد میں نے اپنی جرح کا آغاز کیا۔

''انسپکٹر سرفراز شاہ صاحب! کیا میں آپ کو اپنی سہولت اور آسانی کے لئے ''آئی۔ او' صاحب کہہ سکتا ہوں؟''

وہ خوش دلی سے بولا۔ ''میں ''آئی او' تو اس کیس میں ہوں ہی۔ ویسے آپ چاہیں تو مجھے انسپکٹر یا سرفراز شاہ یا انکوائری افسر کسی بھی نام سے پکار سکتے ہیں۔''

''بہت بہت شکریہ۔'' میں نے زیرلب مسکراتے ہوئے کہا پھر سوال کیا۔ ''انکوائری افسر صاحب! آپ نے جائے وقوعہ کا بڑا تفصیلی نقشہ تیار کیا ہے۔ کیا اس میں کسی رد و بدل یا کمی بیشی کی گنجائش ہے؟''

وہ فخریہ لہجے میں بولا۔ ''میں موقع کا نقشہ ہمیشہ تفصیلی ہی بناتا ہوں اس کے لئے مجھے خاصی محنت کرنا پڑتی ہے۔ آپ کے سوال کا جواب یہ ہے کہ اس نقشے میں کسی ترمیم و اضافے کی گنجائش نہیں ہے۔''

میں نے پوچھا۔ ''شاہ صاحب! آپ کے پیش کردہ چالان کی تفصیلات کے مطابق مقتولہ کا قد پانچ فٹ چھ انچ تھا اور وقوعہ کے وقت اُس نے فیروزی رنگ کی ساڑھی زیب تن کر رکھی تھی۔ پاؤں میں چار انچ ایڑی والی سینڈل تھی۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

''آپ بالکل درست کہہ رہے ہیں۔''

میں نے سوال کیا۔ ''آئی او صاحب! مذکورہ سینڈل کے ساتھ کھڑا ہونے کی حالت میں مقتولہ کا قد کتنا ہو جائے گا؟''

وہ عام سے لہجے میں بولا۔ ''ظاہر ہے، پانچ فٹ دس انچ۔''

''کیا یہ صحیح ہے کہ آپ کو اس واردات کی اطلاع چودہ اکتوبر کی شام چھ بجے دی گئی تھی؟''

''جی ہاں، اس وقت چھ بج کر پانچ منٹ ہوئے تھے۔''

''آپ جائے وقوعہ پر کتنے بجے پہنچے تھے؟''

''کم و بیش ساڑھے چھ بجے۔''

''شاہ صاحب! ہسپتال کے اندراجات کے مطابق مقتولہ کو سات بجے وہاں پہنچایا گیا

تھا۔'' میں نے سلسلہ سوالات کو آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔ ''اس تاخیر کا سبب کیا تھا؟''

''ہم ضروری کارروائی میں مصروف تھے۔'' وہ جزبز ہو کر بولا۔

''کیا وہ کارروائی ایک انسانی زندگی سے زیادہ ضروری تھی؟''

''جناب آپ ہماری مجبوریوں کو نہیں سمجھتے۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ''آپ واقعی بہت ''مجبور' ہو جاتے ہیں بعض معاملات میں۔''

وہ میرے جملے کی تہہ تک پہنچ گیا اس لئے کھسیانا نظر سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ میں نے جج کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''مجھے اور کچھ نہیں پوچھنا جناب عالی۔''

انکوائری افسر کے بعد میڈیکل افسر میرے سوالات کے جواب دینے آیا۔ وہ سچ بولنے کا حلف اٹھا چکا تو میں نے اس کے کٹہرے کے نزدیک آ کر سوالات کا آغاز کیا۔

''ڈاکٹر صاحب! پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق مقتولہ کی موت وقوعہ کے روز شام پانچ اور چھ بجے کے درمیان واقع ہوئی ہے۔ کیا موت کا بالکل درست وقت معلوم ہو سکتا ہے؟''

وہ کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے بولا۔ ''اس کیس میں بالکل درست وقت معلوم کرنا تو ممکن نہیں ہے۔ ہاں البتہ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ مذکورہ ایک گھنٹے کے وقت میں، پہلے نصف گھنٹے میں مقتولہ کی موت واقع ہونے کے امکانات زیادہ ہیں۔''

''یعنی اگر ہم نہایت باریک بینی سے دیکھنا چاہیں تو مقتولہ کی موت کا وقت سوا پانچ ہو سکتا ہے؟''

''جی ہاں، ایسا ہو سکتا ہے۔''

میں نے پوچھا۔ ''رپورٹ کے مطابق مقتولہ کے سر کے عین وسط میں رینچ پانے سے چوٹ لگائی گئی تھی۔ آپ اس چوٹ کی شدت کی وضاحت کریں گے؟''

''اس وضاحت کی ضرورت نہیں ہے۔'' میڈیکل افسر نے جواب دیا۔ ''مقتولہ کی چٹخی ہوئی کھوپڑی چوٹ کی شدت کی داستان سنانے کے لئے کافی ہے۔ ویسے وہ ایک جان لیوا چوٹ تھی۔''

''ڈاکٹر صاحب!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''آپ کی مرتب کردہ رپورٹ میں یہ بات بھی درج ہے کہ مقتولہ کے سر کو اچانک ہی نشانہ بنایا گیا تھا۔ یعنی چوٹ اُس کی توقع کے خلاف لگائی گئی تھی۔ اس بات کی تھوڑی وضاحت کر دیں۔''

"اس کی وضاحت آپ یہ سمجھیں کہ مقتولہ کی بے خبری میں اس کے سر کو نشانہ بنایا گیا تھا۔"

میں نے فخریہ انداز میں وکیل استغاثہ کو دیکھا۔ وہ ہونقوں کی طرح کبھی مجھے اور کبھی میڈیکل افسر کو دیکھ رہا تھا۔ جج نے اپنے سامنے پھیلے ہوئے کاغذات پر کچھ نوٹ کیا پھر دلچسپی سے میری طرف دیکھنے لگا۔

"ڈاکٹر صاحب!" میں نے میڈیکل افسر کو مخاطب کرتے ہوئے کٹہرے میں کھڑے جبار احمد کی طرف اشارہ کیا۔ میرے اشارے پر میڈیکل افسر نے ملزم کی جانب دیکھا۔ میں نے پوچھا۔ "آپ کے خیال میں میرے مؤکل کا قد کتنا ہوگا؟"

"میرا اندازہ ہے، زیادہ سے زیادہ پانچ فٹ دو انچ۔" اُس نے جواب دیا۔

"آپ کا اندازہ درست ہے۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "آپ کا بہت بہت شکریہ ڈاکٹر صاحب۔"

میڈیکل افسر جج سے اجازت لے کر عدالت کے کمرے سے رخصت ہوگیا۔ میں نے اس کے بعد انیلا اور جبار کا نکاح نامہ جج کو پیش کر دیا۔ یہ نکاح نامہ مجھے منظور علی ہوٹل والے نے فراہم کیا تھا۔ جبار احمد نے اپنے تمام ضروری کاغذات منظور علی کے پاس رکھوائے ہوئے تھے۔ منظور علی اُس کا رازدار دوست تھا۔ منظور علی کے علاوہ اس وقت عدالت میں جبار احمد کا نواب شاہ والا دوست ادریس احمد بھی موجود تھا۔

جج کافی دیر تک نکاح نامے کا معائنہ کرتا رہا پھر اُس کی ہدایت پر ادریس احمد اور منظور علی نے اپنا مختصر بیان ریکارڈ کروایا۔ اس کے بعد جج ان دونوں سے باری باری مختلف سوالات کرتا رہا۔ وہ اس کے سوالات کے تسلی بخش جواب دیتے رہے۔ جج ان جوابات سے خاصا مطمئن نظر آ رہا تھا۔

منظور علی کے بیان کا آخری حصہ خاص اہمیت کا حامل تھا۔ اُس نے معزز عدالت کے روبرو بتایا۔ "جناب عالی! جبار احمد کراچی آنے سے پہلے مجھ سے ملا تھا۔ جیل سے آنے کے بعد وہ خاصا بدل گیا تھا۔ تحمل اور بردباری اس کی ذات کا خاصہ بن چکا تھا۔ میں نے اس سے کہا، چھوڑو۔ کراچی جا کر کیا کرو گے۔ ماضی کی تلخ یادوں کو بھلانے کی کوشش کرو۔ اس پر جبار نے گمبھیر لہجے میں جواب دیا، میں ماضی کی تلخ یادوں کو کس طرح بھول سکتا ہوں؟ انیلا میرا بیوی ہے۔ میں اسے تلاش کروں گا...... اسے ضرور حاصل کروں گا۔ میں نے پوچھا، بالفرض وہ تمہیں نہ مل سکی تو؟ اس نے ٹھوس لہجے میں جواب دیا تھا، پھر میں زندہ رہ کر کیا

کروں گا۔ ایک روز وہ رات کے وقت میرے ہوٹل پر آیا تھا اور مجھے بتایا کہ انیلا کا سراغ لگ گیا ہے لیکن اس نے شادی کر لی ہے۔ میں نے کہا، اب تم صبر کر کے بیٹھ جاؤ۔ انیلا تمہاری قسمت میں ہی نہیں تھی۔ وہ خیالوں میں ڈوب گیا پھر بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ میں ایک مرتبہ اس سے ضرور ملوں گا۔ میں نے پوچھا، اب مل کر کیا کرو گے۔ وہ تو پرائی ہو چکی۔ اُس نے کہا، انیلا نے شادی پر شادی کر لی ہے۔ میں اس سے مل کر اسے سمجھانے کی کوشش کروں گا کہ وہ اپنے شوہر کو چھوڑ کر میرے پاس آ جائے۔ اس کی دوسری شادی جائز نہیں ہے۔ میں نے سوال کیا، اگر اس نے تمہاری تجویز ماننے سے انکار کر دیا تو؟ جبار احمد ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے بولا، تو پھر میں کوئی زور زبردستی نہیں کروں گا۔ خاموشی کے ساتھ اس کی زندگی سے نکل جاؤں گا، ہمیشہ ہمیشہ کے لئے۔ پھر وہ مجھے یہ تاکید کرنے کے بعد واپس کراچی چلا آیا تھا کہ میں اس کے والد فضل کریم سے اس کے آنے اور جانے کے بارے میں کوئی بات نہ کروں۔"

منظور علی اور ادریس احمد کے مختصر بیان نے میرے مؤکل کے تفصیلی بیان کی تصدیق کر دی تھی۔ جج تھوڑی دیر کے لئے اٹھ کر اپنے چیمبر میں چلا گیا۔ پندرہ منٹ کے بعد وہ دوبارہ اپنی کرسی پر براجمان ہوا اور عدالتی کارروائی کو آگے بڑھانے کا اشارہ کیا۔

گواہوں کے بیانات چونکہ مکمل ہو چکے تھے اس لئے وکیل استغاثہ نے میرے مؤکل کے خلاف اپنے دلائل دینا شروع کیے۔ وہ کافی دیر تک گھما پھرا کر ایک جیسی باتیں کرتا رہا۔ اس کے بعد میرے دلائل کی باری آئی۔ میں استغاثہ کے گواہوں پر جرح کے دوران میں مختلف مواقع پر نہایت ہی اہم نکات جج کو نوٹ کرواتا رہا تھا۔ خاص طور پر میڈیکل افسر سے کیے گئے سوالات کو جج نے پوری دلچسپی اور توجہ سے سنا تھا اور کئی بار میں نے اُسے چونکتے ہوئے بھی دیکھا تھا۔

میں نے اپنے مؤکل کے حق میں دلائل دیتے ہوئے کہا۔ "جناب عالی! استغاثہ کی جانب سے قتل کا جو محرک پیش کیا گیا ہے، وہ استغاثہ کے گواہ اور مقتولہ کے شوہر سلطان صدیقی کے بیان کا پرتو ہے اور انتہائی بچکانا بھی۔" ایک لمحے کو توقف کر کے میں نے جج کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

"جناب عالی! کوئی مزدور معاوضے کی کمی بیشی پر مشتعل ہو کر اپنے آجر پر اتنی بے دردی سے حملہ آور نہیں ہو سکتا۔ ملزم کے اشتعال کو پورے کیس کی بنیاد بنا دیا گیا ہے مگر اس اشتعال کا کوئی ثبوت کہیں نظر نہیں آتا۔ اب یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ مقتولہ میرے

مؤکل کی قانونی بیوی تھی۔ وہ اسے سمجھانے بجھانے کے لئے اُس کے بنگلے پر وقت گزار رہا تھا اور اُس کی واپسی کا متمنی تھا۔ بصورت دیگر اُس نے اپنی جان لینے کا فیصلہ کر رکھا تھا...... اور اگر پولیس بروقت اُس کے کوارٹر پر نہ پہنچ جاتی تو وہ پھانسی کا پھندا اپنی گردن میں ڈالنے میں کامیاب ہو چکا ہوتا۔

''جناب عالی! میرا مؤکل بے وقوفی کی حد تک ایک سادہ انسان ہے۔ اس کے سات سال کی سزا کاٹنے کا واقعہ معزز عدالت کے علم میں لایا جا چکا ہے۔ جو شخص اپنی پیاری بیوی کی زیادہ سے زیادہ حفاظت کے پیش نظر ایک ناکردہ جرم میں جیل جانے کا فیصلہ کر سکتا ہے وہ اپنی اس بیوی کی جان لینے کے بارے میں کیسے سوچ سکتا ہے؟

''جناب عالی! حقیقت یہ ہے کہ میرا مؤکل معصوم اور بے گناہ ہے۔ اس نے کوئی قتل نہیں کیا بلکہ ایک گہری سازش کے تحت اسے اس معاملے میں پھنسانے کی کوشش کی گئی ہے۔ لیکن یہ کوشش اس اناڑی پن سے کی گئی ہے کہ ''استغاثہ کی کارکردگی'' کو داد دینے کو جی چاہتا ہے۔''

میں نے طنزیہ نظر سے وکیل استغاثہ اور انکوائری افسر کو باری باری دیکھا اور اپنے دلائل کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''جناب عالی! میرے مؤکل کا قد پانچ فٹ دو انچ ہے۔ مقتولہ انیلا مصدقہ طور پر پانچ فٹ چھ انچ قد کی حامل تھی۔ پھر چار انچ کی ایڑی کے ساتھ لامحالہ اس کا قد پانچ فٹ دس انچ ہو گیا تھا یعنی اُونچی ایڑی کی سینڈل کے ساتھ مقتولہ میرے مؤکل سے آٹھ انچ دراز قد تھی۔ ایسی صورت میں یہ ممکن نہیں ہے کہ میرا مؤکل اگر رنج پانے سے مقتولہ پر حملہ آور ہوتا تو وہ مقتولہ کے سر کے عین درمیان چوٹ لگانے میں کامیاب ہو جاتا اور چوٹ بھی ایسی کہ...... بقول میڈیکل افسر، وہ ایک جان لیوا چوٹ تھی جس نے مقتولہ کی کھوپڑی کو کھول کر رکھ دیا تھا۔''

عدالت میں موت کا سکوت طاری تھا۔ جج سمیت تمام حاضرین عدالت کی نظریں مجھ پر لگی ہوئی تھیں۔ میں نے دلائل کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''جناب عالی! جب دو افراد رو بہ رو، دو بہ دو ہوتے ہیں، ایک دوسرے سے بحث و تکرار کرتے ہیں تو وہ دونوں ہی ایک دوسرے پر گہری نگاہ رکھے ہوئے ہوتے ہیں اور نظر ہی نظر میں ایک دوسرے کو تولتے بھی رہتے ہیں۔ بقول استغاثہ کے گواہ سلطان صدیقی، اُس نے باتھ روم کے اندر مقتولہ اور ملزم کو تیز لہجے میں باتیں کرتے ہوئے سنا تھا۔ وہ دونوں معاوضے کے معاملے میں بحث کر رہے تھے۔ مقتولہ غصے کے عالم میں چلا بھی رہی تھی۔ اسی دوران میں گواہ نے ''ٹھک'' کی

ایک آواز سنی پھر مقتولہ کی گھٹی ہوئی چیخ اُسے سنائی دی۔ وہ جب باتھ رُوم سے نکل کر برآمدے میں آیا تو مقتولہ برآمدے کے فرش پر ڈھیر ہو چکی تھی۔'' میں نے تھوک نگل کر حلق کو تر کیا پھر اضافہ کیا۔ ''جناب عالی! گواہ کا بیان اور استغاثہ کا موقف مبنی بر دروغ ہے۔ دو افراد جو رو بہ رو بحث و تکرار میں مصروف ہوں، وہ ایک دوسرے سے اتنے بے پرواہ و بے خبر نہیں ہوتے کہ ان میں سے ایک دوسرے کے کاسۂ سر کو ضربِ شدید پہنچانے میں کامیاب ہو جائے اور پھر ضربِ شدید لگانے والا مضروب سے قد و قامت میں آٹھ انچ چھوٹا بھی ہو۔ ایک لمحے کے لئے اگر ہم فرض بھی کر لیں کہ میرا مؤکل واقعی مقتولہ پر حملہ آور ہوا بھی تھا تو پھر اس صورت میں مقتولہ کا ردِ عمل بھی سامنے آنا چاہئے تھا۔ وہ اپنے بچاؤ میں ہاتھ پاؤں کو ضرور زحمت دیتی۔ ایسی صورت میں اس کا سر نشانہ نہیں بن سکتا تھا بلکہ رنج پانے کا وار اُس کے بازو یا کندھے یا کسی بھی زیریں حصے پر لگتا لیکن رنج پانے کے وار نے جس خوف ناک انداز میں مقتولہ کی کھوپڑی کو چٹخایا ہے، وہ کوئی اور ہی کہانی سنا رہا ہے۔ پھر اس کے علاوہ بھی ایک نہایت ہی اہم نکتہ روزِ روشن کی طرح عیاں ہے۔''

میں نے رُک کر ڈرامائی انداز میں حاضرین عدالت پر ایک اچٹتی سی نگاہ ڈالی پھر روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے اپنے دلائل کا سلسلہ جاری رکھا۔

''جناب عالی! پوسٹ مارٹم کی رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ مقتولہ کے سر کو اچانک ہی نشانہ بنایا گیا تھا یعنی چوٹ اُس کی توقع کے خلاف لگائی گئی تھی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے معزز عدالت کے سامنے میڈیکل افسر میرے ایک سوال کے جواب میں وضاحت کر چکے ہیں کہ مقتولہ کی بے خبری میں اس کے کاسۂ سر کو نشانۂ ستم بنایا گیا ہے۔ یہ ایک ایسا اہم نکتہ ہے جو استغاثہ کی دھجیاں اُڑانے کے لئے کافی ہے۔''

ایک لمحے کے توقف سے میں نے کہنا شروع کیا۔ ''جناب عالی! اگر ہم استغاثہ کی جانب سے عائد کردہ الزامات کو تھوڑی دیر کے لئے سچ بھی مان لیں تو پھر بھی میرے مؤکل کی بے گناہی اپنی پوری آب و تاب سے ظاہر ہوتی ہے۔ میں ان نکات کو ترتیب وار پیش کرتا ہوں۔ اگر ہم فرض کر لیں کہ میرے مؤکل نے اپنے رنج پانے سے مقتولہ پر حملہ کیا تھا تو عملی طور پر یہ کارگر ہونا ممکن نظر نہیں آتا۔ ایک پانچ فٹ دو انچ قد کا مالک شخص کسی پانچ فٹ چھ انچ کی حامل عورت کے سر کے عین وسط میں اتنی شدید چوٹ نہیں لگا سکتا جس سے مذکورہ عورت کی کھوپڑی چٹخ جائے اور فوراً اس کی موت بھی واقع ہو جائے جبکہ اس عورت نے اپنے قد میں مزید اضافہ کرنے کے لئے چار انچ اُونچی ایڑی والی سینڈل بھی پہن رکھی

ہو۔ اگر میرا مؤکل مقتولہ پر حملہ آور ہوتا تو وہ اس کے سر تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا تھا بلکہ رنچ پانے کی ضرب جسم کے کسی نسبتاً زیریں حصے پر لگتی۔ عین ممکن تو یہی تھا کہ مقتولہ اس وار کی زد ہی سے بچ نکلتی، جب کہ ایسا نہیں ہوا۔

''جناب عالی! استغاثہ کے مؤقف اور گواہ سلطان صدیقی کے مطابق جب مقتولہ پر ملزم نے رنچ پانے سے حملہ کیا اس وقت وہ دونوں آپس میں معاوضے کے معاملے پر بحث وتکرار میں مصروف تھے۔ کیا اس صورت حال میں مقتولہ کی بے خبری ممکن ہے؟ ہرگز نہیں.....'' میں نے جملہ ادھورا چھوڑ کر ذرا توقف کیا پھر کہا۔ ''جب کہ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق مقتولہ کی بے خبری میں اس کے سر پر وار کیا گیا تھا۔ اس سے ایک بات یہ بھی ثابت ہوتی ہے کہ مذکورہ بحث وتکرار کے درمیان مقتولہ پر قاتلانہ حملہ نہیں کیا گیا بلکہ میرے مؤکل کے وہاں سے رخصت ہونے کے بعد کسی سوچی سمجھی اسکیم کے تحت مقتولہ کو موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا اور اس کی مکمل بے خبری میں اس کی کھوپڑی پر رنچ پانے سے ضرب لگائی گئی تھی۔

''ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ اگر میرے مؤکل نے واقعی مقتولہ پر قاتلانہ حملہ کیا ہوتا تو وہ آلہ قتل کو یونہی جائے واردات پر چھوڑ کر پولیس کو اپنے پیچھے لگانے کا سامان نہ کرتا۔ پھر ایسی صورت میں اُسے حسب معمول ''حاجی سینٹری ورکس'' کا رُخ کرنے کی بجائے فرار کی کوشش کرنی چاہئے تھی۔ وہ سادہ لوح اور دل برداشتہ شخص تو پہلے حاجی سینٹری ورکس پہنچا پھر اپنی جان پر کھیلنے کے لئے اپنے کوارٹر واقع اعظم بستی کی طرف چل دیا تھا۔

''جناب عالی! اب تک جو حقائق اور نکات معزز عدالت میں پیش کئے گئے ہیں ان کی روشنی میں میرا مؤکل بے قصور و بے گناہ نظر آتا ہے۔ اگر اس سے جرم ہوا ہے تو صرف اتنا کہ اس نے محبت کی تھی۔ اگر محبت کرنا کسی اعتبار سے قانون کی نظر میں جرم ٹھہرتا ہے تو میرے مؤکل کو ضرور سزا سنائی جائے۔ بصورت دیگر میں فاضل عدالت سے پُرزور استدعا کرتا ہوں کہ میرے مؤکل کو باعزت بری کیا جائے۔''

وکیل استغاثہ نے برہمی آمیز لہجے میں کہا۔ ''اگر آپ کے مؤکل نے قتل نہیں کیا تو پھر انیلا کا قاتل کون ہے؟''

''یہ پتہ چلانا تو استغاثہ کا کام ہے میرے فاضل دوست۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''میں تو صرف اپنے مؤکل کو بری کرانے کا ذمہ دار ہوں۔ شاید وکیل صفائی کا مفہوم آپ کو معلوم نہیں ہے۔''

وہ خجالت سے بغلیں جھانکنے لگا۔ میں نے جج کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''جناب عالی!

میں اپنے مؤکل کی بریت کے ساتھ ساتھ عدالت سے درخواست کروں گا کہ وہ پولیس کو جلد از جلد نیا چالان پیش کرنے کی ہدایت کرے۔ وقوعہ کے وقت بنگلے میں صرف چار افراد موجود تھے۔ نمبر ایک مقتولہ، نمبر دو مقتولہ کا شوہر سلطان صدیقی، نمبر تین گھریلو ملازم خادم حسین اور نمبر چار گھریلو ملازمہ جنت بی بی۔ مقتولہ تو اپنی جان سے گئی، اُس کی جان لینے میں بقیہ تینوں میں سے کسی ایک کا ہاتھ ہو سکتا ہے۔''

میں نے یہ نکتہ بیان کر کے گویا تفتیش کا رُخ پھیر دیا تھا۔ جج کے چہرے کے تاثرات سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ میری بات کی تہ تک پہنچ چکا تھا اور یہی میرا مقصد بھی تھا۔ میں اپنی کارکردگی سے مطمئن تھا۔

جج نے سردست جبار احمد کو ضمانت پر رہا کرنے کا فیصلہ سنا دیا تاہم اس کا نام ایک گواہ کی حیثیت سے مقدمے میں شامل کر لیا۔ نیز اس کیس کے انکوائری افسر کو ہدایت کی کہ وہ خادم حسین، جنت بی بی اور سلطان صدیقی کو شامل تفتیش کر کے عرصہ سات یوم کے اندر اندر نیا چالان عدالت میں پیش کرئے۔

اس کے ساتھ ہی عدالت برخاست ہو گئی۔
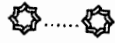
آئندہ پیشی پر عدالت نے جبار احمد کو باعزت بری کر دیا۔

پولیس نے جو نیا چالان پیش کیا تھا اس کی رو سے جبار احمد کی بطور گواہ بھی اس کیس میں موجودگی ضروری نہیں رہی تھی۔ سلطان صدیقی نے اپنی بیوی کے قتل کا اقرار کر لیا تھا۔ انکوائری افسر تمام عدالتی کارروائی کے دوران میں موجود رہا تھا اور حالات کی بدلتی ہر نئی کروٹ اُس کے ذہن میں تازہ تھی۔ اُس نے تفتیش کا ایسا انداز اختیار کیا کہ سلطان صدیقی سے سچ اُگلوانا بہت آسان ہو گیا۔ سلطان صدیقی کے بیان کا خلاصہ کچھ یوں تھا۔

ماضی میں جب انیلا کے کزن جمشید علی نے سلطان صدیقی کو انیلا کے خلاف بھڑکانے کی کوشش کی تھی تو دونوں میاں بیوی کے درمیان خاصی تلخیاں پیدا ہو گئی تھیں جو بعد ازاں انیلا کی کوششوں سے جاتی رہیں تاہم ازدواجی زندگی کے نازک آبگینے میں جو بال آ چکا تھا وہ پوری طرح نہ نکل سکا۔ پھر جبار احمد کی آمد نے اس بات کو دراڑ میں بدل دیا۔ لیکن سلطان صدیقی نے اپنے دلی جذبات کا اظہار نہ ہونے دیا۔ جنت بی بی نے اُسے جو رپورٹ پیش کی تھی، وہ اس کی تفتیش وتصدیق میں لگ گیا۔ پھر اُس نے ایک موقع پر اپنے کانوں سے انیلا اور جبار کو کچھ ''محرمانہ'' باتیں کرتے ہوئے سن لیا تو اُس کا پارا ساتویں آسمان کو چھونے

لگا۔ اُس نے اپنی بے وفا بیوی...... بلکہ جبار احمد کی بیوی کو عبرت ناک سزا دینے کا فیصلہ کر لیا...... اس طرح کہ اُس کے کئے کرائے کا سارا الزام جبار احمد پر آئے۔

اپنے منصوبے کی تکمیل کے لئے سلطان صدیقی نے وقوعہ سے ایک روز پہلے جبار احمد کے اوزاروں والے تھیلے سے اُس کا رنچ پانا چرا لیا۔ اُس نے دستانوں کا استعمال کرتے ہوئے اس بات کا خاص خیال رکھا تھا کہ پانے کے دستے پر جبار احمد کی اُنگلیوں کے نشانات موجود رہیں۔

وقوعہ کے روز جب جبار احمد اپنا حساب کتاب ختم کر کے، بنگلے سے رخصت ہو گیا تو اس وقت دونوں میاں بیوی برآمدے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ جبار کے جانے کے بعد سلطان کپڑے تبدیل کرنے بنگلے کے اندرونی حصے میں چلا گیا جبکہ انیلا وہیں برآمدے میں موجود رہی۔ وہ دیوار کے ساتھ رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھی تھی۔ اُس کی پشت پر ایک اندرونی کمرے کی کھلی ہوئی کھڑکی تھی۔ سلطان صدیقی نے اندر پہنچ کر دستانے پہنے پھر پروگرام کے عین مطابق کھلی ہوئی کھڑکی میں سے انیلا کی عقبی سمت سے اُس کے سر کے عین سط میں وزنی رنچ پانے کی زوردار ضرب لگائی۔ اس کے ساتھ ہی پشت سے دھکا دے کر اُسے برآمدے کے فرش پر گرا دیا۔ پھر باہر برآمدے میں آ کر مذکورہ رنچ پانا بے ہوش انیلا کے قریب ہی ڈال دیا۔

ہر کام حسب خواہش مکمل کرنے کے بعد اُس نے اپنے ملازم خادم حسین کو آواز دی۔ اس وقت تک انیلا کے سر سے اس قدر خون بہہ چکا تھا کہ اُس کے بچنے کے امکانات صفر کے برابر رہ گئے تھے۔ جب سلطان صدیقی ہر پہلو سے مطمئن ہو گیا تو اُس نے پولیس کو فون کر دیا۔

یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ عدالت نے سلطان صدیقی کو قید حیات کی سزا دی تھی۔

جبار احمد اپنے بڑھاپے کی منزل میں داخل ہو چکا ہے۔ اب وہ خود اپنے ہاتھ سے پلمبرنگ کا کام نہیں کرتا بلکہ اس کام کا بہت بڑا ٹھیکے دار بن چکا ہے۔ وہ اب کراچی کا باسی ہے۔ اللہ نے اُسے عزت، دولت اور پیشہ ورانہ شہرت سے نواز رکھا ہے۔ بظاہر وہ ایک مست حال انسان ہے مگر اس کے دل کا حال کوئی نہیں جانتا۔ وہ دل جہاں آج بھی انیلا کی خوشگوار یادیں قیام پذیر ہیں۔ ماضی کا عذاب اتنا کیف آگیں اور سحر آفریں بھی ہو سکتا ہے اس بات کا اندازہ صرف وہی لوگ لگا سکتے ہیں جن کے سینے میں محبت آشنا دل ہو۔

✡......✡

نصف بدتر

اس روز میرا کوئی کیس زیر سماعت نہیں تھا اس لئے عدالت جانے کے بجائے میں سیدھا اپنے دفتر چلا گیا۔ انتظار گاہ خالی پڑی تھی۔ صبح کے وقت عام طور پر میں عدالت میں مصروف ہوتا ہوں اس لئے بہت کم مؤکل دفتر کا رُخ کرتے ہیں۔ البتہ دوپہر دو بجے کے بعد ملنے والوں کا جو سلسلہ شروع ہوتا ہے تو پھر شام چھ سات بجے تک مجھے سر کھجانے کی فرصت نہیں ملتی۔ بعض اوقات تو رات کے آٹھ نو بھی بج جاتے ہیں۔

مجھے اپنے کمرے میں بیٹھے ہوئے ابھی تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ میری سیکرٹری نے انٹرکام پر کسی ملاقاتی کی آمد کی اطلاع دی۔ میں نے آنے والے کو فوری طور پر اپنے کمرے میں بلا لیا۔

چند لمحات کے بعد جو شخص میرے کمرے میں داخل ہوا اُس نے عمدہ تراش کا سوٹ زیب تن کر رکھا تھا اور دلکش شخصیت کا مالک ایک خوش شکل اور مہذب انسان دکھائی دیتا تھا۔ اُس کی عمر کا اندازہ میں نے پہلی نظر میں پچاس کے لگ بھگ لگایا جو بعد ازاں درست ثابت ہوا۔ وہ زندگی کی پچاس ویں سیڑھی پر قدم رکھ چکا تھا۔

میں نے پیشہ ورانہ مسکراہٹ سے اُس کا استقبال کیا اور میز کے سامنے رکھی ہوئی کرسیوں کی جانب اشارہ کیا۔ اُس نے بڑی گرم جوشی سے مجھ سے مصافحہ کیا اور رسمی کلمات کے بعد ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

''بیگ صاحب! ہم بالمشافہ آج پہلی بار مل رہے ہیں لیکن میں ایک عرصہ سے غائبانہ طور پر آپ سے متعارف ہوں۔''

ملاقاتیوں کے ایسے جملے مجھے ابتداء میں چونکا دیا کرتے تھے لیکن رفتہ رفتہ میں ایسے کلمات کا عادی ہو گیا تھا اور حیرت کا اظہار کرنے کے بجائے میں صرف مسکرانے پر اکتفا کرتا تھا۔ لہٰذا اپنے سامنے بیٹھے ہوئے اُس شائستہ لہجے والے شخص کے انکشاف پر بھی میں نے اُس کی جانب مسکراتی ہوئی سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

وہ بولا۔ ''بیگ صاحب! آپ نے پوچھا نہیں، میں آپ سے کیوں کر غائبانہ واقفیت

رکھتا ہوں؟''

''آپ خود ہی بتا دیجئے۔'' میں نے بہ دستور مسکراتے ہوئے کہا۔

اُس نے بتایا۔ ''اگر چہ کاروباری مصروفیات میں سے وقت نکالنا خاصا دقت طلب کام ہے لیکن میں پھر بھی آپ کی کہانی پڑھنے کے لئے کچھ لمحات پس انداز کر ہی لیتا ہوں۔''

''اوہ!'' میرے سینے سے ایک گہری سانس خارج ہوئی۔

آئے روز کے تجربات سے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ وکیل کی بہ نسبت ایک لکھاری کی حیثیت سے مجھے زیادہ لوگ جانتے ہیں۔ گاہے بہ گاہے کوئی نہ کوئی اجنبی مداح مل ہی جاتا ہے اور جب وہ میری کہانیوں کی تعریف کرنے لگتا ہے تو میں ایک عجیب سی اُلجھن کا شکار ہو جاتا ہوں۔ کیونکہ عملی طور پر میری سرگرمیاں اپنے پیشے تک محدود ہیں۔ سسپنس کے ان صفحات میں میری حیثیت ایک راوی کی سی ہوتی ہے، قلم کاری میرے بس کی بات نہیں ہے۔

''میرا نام جمشید علی ہے۔'' میرے سامنے بیٹھے ہوئے شخص نے اپنا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔ ''بیگ صاحب، آپ کمال کے رائٹر ہیں، بہت عمدہ کہانیاں لکھتے ہیں، آپ کے قلم میں جادو ہے۔''

میں نے اُس کی غلط فہمی کو دُور کرنا ضروری سمجھا اور معتدل لہجے میں کہا۔ ''جمشید صاحب! میں ایک وکیل ہوں اور صرف وکالت کرتا ہوں۔ قلم کا جادو جگانا میرے بس کا روگ نہیں ہے۔ میں تو عام طور پر اپنا قلم دستخط وغیرہ کرنے کے لئے استعمال کرتا ہوں۔'' ایک لمحے کے توقف سے میں نے استفسار کیا۔ ''فرمایئے جمشید صاحب! میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟''

وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا، پھر بولا۔ ''بیگ صاحب! میں فی الحال ایک چھوٹے سے معاملے میں آپ سے قانونی مشورہ لینے آیا ہوں۔''

''چھوٹے سے معاملے کی تفصیل کیا ہے؟''

وہ تامل کرتے ہوئے بولا۔ ''میں دوسری شادی کرنا چاہتا ہوں۔''

''میں اس سلسلے میں آپ کے لئے کیا کر سکتا ہوں؟''

''بیگ صاحب۔'' ایک مختصر سے وقفے کے بعد اُس نے کہنا شروع کیا۔ ''بات دراصل یہ ہے کہ میں حتیٰ الوسع کوشش کرتا ہوں کہ ہر کام قانون کے دائرے میں رہتے ہوئے قاعدے قرینے سے کیا جائے۔ ایک طویل سوچ بچار کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ میرے مسائل کا حل صرف اور صرف دوسری شادی ہے لیکن میں یہ کام آپ کے مشورے

سے کرنا چاہتا ہوں۔ میں اسی لئے آپ کے پاس حاضر ہوا ہوں۔ آپ میری راہ نمائی کریں۔''

میں نے رف پیڈ اور قلم سنبھال لیا پھر پوچھا۔ ''کیا آپ کی پہلی بیوی حیات ہے؟''

''جی ہاں، وہ حیات ہے۔'' اُس نے اس طرح منہ بنایا جیسے پہلی بیوی کے ذکر سے اُس کے منہ میں کسی کڑوی چیز کا ذائقہ گھل گیا ہو۔ وہ ناگواری سے بولا۔ ''صادقہ نہ صرف حیات ہے بلکہ اس نے مجھ پر عرصۂ حیات تنگ کر رکھا ہے۔''

صادقہ اُس کی بیوی کا نام تھا۔ میرے استفسار پر اُس نے بتایا کہ ان کی شادی کو اُنیس بیس سال گزر چکے ہیں۔ ان کے دو بچے تھے۔ بڑی بیٹی نازیہ کی عمر کم و بیش سولہ سال تھی اس سے چھوٹے بیٹے کا نام آصف تھا۔ آصف اپنی بہن نازیہ سے تین سال چھوٹا تھا۔ ان کی رہائش پی ای سی ایچ ایس کے ایک عالی شان بنگلے میں تھی۔ جمشید علی ایک معروف صنعت کار تھا۔ سائٹ کے علاقے میں اُس کی ایک ٹیکسٹائل مل تھی۔ اللہ نے جمشید کو ہر نعمت سے نواز رکھا تھا، سوائے گھریلو سکون کے...... اور وہ اس سکون کے حصول کے لئے دوسری شادی کرنا چاہتا تھا۔

میں نے پوری بات سننے کے بعد پوچھا۔ ''جمشید صاحب! آپ کو اپنی پہلی بیوی صادقہ سے کیا شکایت ہے؟''

''کوئی ایک شکایت ہو تو بتاؤں۔'' وہ بیزاری سے بولا۔ ''اُس نے تو میرا جینا دوبھر کر دیا ہے۔ گھر کو میرے لئے جہنم بنا دیا ہے۔''

''کمال ہے!'' میں نے کہا۔ ''آپ ایک طویل عرصے سے اپنی بیوی کے ساتھ رہ رہے ہیں اور دوسری شادی کا خیال آپ کو اب آیا ہے۔ کیا پہلے آپ کو اپنی بیوی سے شکایت نہیں تھی؟''

وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولا۔ ''شکایات تو شادی کے بعد جلد ہی پیدا ہو گئی تھیں لیکن میں نے سوچا، شاید آگے چل کر معاملات ٹھیک ہو جائیں۔ میرا خیال خام ثابت ہوا اور ہر گزرتے دن کے ساتھ ہمارے درمیان رنجشوں کی خلیج وسیع ہوتی چلی گئی۔ وہ تو نہ جانے کس مزاج کی عورت ہے کہ اُس پر کسی بات کا اثر ہی نہیں ہوتا۔ میرا خیال تھا کہ بچوں کے بعد اُس میں تبدیلی آ جائے گی لیکن اُس نے دونوں بچوں کو بھی اپنا طرف دار بنا لیا ہے۔ نازیہ اور آصف کا خیال ہے کہ میں ایک بہت ظالم شخص ہوں۔ ان کی ماں کے ساتھ میں نے بہت زیادتیاں کی ہیں اور روز و شب کرتا رہتا ہوں۔ یہاں تک تو میں کسی نہ کسی طور برداشت کر ہی رہا تھا لیکن گزشتہ کچھ عرصہ سے صادقہ نے میری ماں کی بے عزتی بھی کرنا شروع کر دی ہے

اور بچوں کے معصوم ذہنوں میں بھی اس نے دادی کے خلاف بہت زہر بھر دیا ہے۔ وہ دادی کی صورت دیکھنے کو تیار نہیں ہیں۔ وہ دونوں اپنی ماں کی انگلیوں پر ناچتے ہیں۔“

میں نے افسوس ناک انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”بہت دیر کی مہرباں آتے آتے۔“

”دیر آید، درست آید۔“ وہ آہستہ سے بولا۔

میں نے پوچھا۔ ”آپ کا کیا خیال ہے، آپ کی بیوی دوسری شادی کی اجازت دے دے گی؟“

”قطعی نہیں۔“ وہ دوٹوک لہجے میں بولا۔ ”وہ تو ایسے کسی ذکر پر ہی ہنگامہ کھڑا کر دے گی۔“

”پھر تو بہت مشکل ہے۔“ میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

”کیا کوئی ایسا طریقہ ہوسکتا ہے کہ میں صادقہ کی اجازت کے بغیر دوسری شادی کر سکوں؟“ جمشید نے پوچھا۔ ”میرے لئے یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے لیکن اس کے بعد رونما ہونے والے حالات سے خائف ہوں۔ صادقہ بچوں کے ساتھ مل کر میرے خلاف بہت مضبوط محاذ بنا لے گی۔ میں ان کا مقابلہ نہیں کر سکوں گا۔“

میں نے کہا۔ ”جمشید صاحب! ازروئے قانون، آپ اپنی پہلی بیوی کی اجازت لئے بغیر دوسری شادی نہیں کر سکتے۔ اپنی بیوی کے علاوہ آپ کو اپنے علاقے کی یونین کونسل سے بھی اجازت لینا ہوگی۔“

”یہ قانون تو مجھے بھی معلوم ہے۔“ جمشید نے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔ ”میں آپ کے پاس اس لئے آیا ہوں کہ آپ اس قانون سے بچتے ہوئے میرے لئے کوئی راہ نکالیں۔ آپ کے لئے یہ مشکل کام تو نہیں ہوگا۔“

”بہت مشکل ہے۔“ میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”قانون کو توڑنا مروڑنا میرے بس کی بات نہیں۔ آپ کے حالات کے پیش نظر میں آپ کو یہی مشورہ دے سکتا ہوں کہ بچوں کی خاطر جیسے تیسے ممکن ہو، گزارہ کریں۔ اپنے موجودہ حالات سے سمجھوتہ کرنے ہی میں آپ کی بھلائی ہے۔“

”یہ مشورہ تو مجھے ایک دو دوسرے وکیلوں نے بھی دیا تھا۔“ وہ مایوسی سے بولا۔ ”میں تو آپ کے پاس اس لئے آیا تھا کہ آپ چٹکی بجاتے میں میرا مسئلہ حل کر دیں گے۔“

”میں قانون سے متصادم کسی معاملے میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکوں گا۔“ میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ”مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کی توقعات پر پورا نہیں اترا۔“

وہ قدرے برہمی سے بولا۔ ”آپ کا کیا خیال ہے، سابق صدر مملکت نے دوسری شادی کے لئے پہلی بیوی اور یونین کونسل کی اجازت کا ٹنٹنا کھڑا کر کے پہلی بیوی کے حقوق کو نقصان نہیں پہنچایا ہے؟“

”آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟“

وہ بولا۔ ”یہ تو طے ہے کہ کوئی عورت اپنے شوہر کو دوسری شادی کی اجازت نہیں دے گی۔ بہ حالت مجبوری شوہر کوئی ایسی راہ نکالے گا کہ پہلی بیوی کے حقوق پر کاری ضرب لگے گی۔ اگر وہ بخوشی اجازت نہیں دے گی اور شوہر دوسری شادی کا پختہ ارادہ کئے بیٹھا ہوگا تو پھر اس کے پاس پہلی بیوی کو طلاق دینے کے سوا کوئی راستہ نہیں رہے گا۔ اسلام نے ایک مرد کو بہ یک وقت چار شادیوں کی اجازت دی ہے۔“

”آپ اس فکر میں نہ پڑیں۔“ میں نے کہا۔ ”یہ مسئلہ قانون دانوں کے سوچنے کا ہے۔“

وہ بولا۔ ”حالات میری برداشت سے باہر ہوتے جا رہے ہیں بیگ صاحب! ناچار مجھے بھی کوئی انتہائی قدم اٹھانا پڑے گا۔“

میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ”جذباتی کیفیت میں اٹھایا ہوا کوئی بھی قدم آپ کے لئے نقصان دہ ثابت ہوسکتا ہے۔“ ایک لمحے کے توقف سے میں نے پوچھا۔ ”کیا آپ نے اس مسئلے پر اپنی بیوی سے کبھی کوئی بات کی ہے؟“

اُس نے نفی میں جواب دیا۔ میں نے کہا۔ ”آپ ایک کوشش کر کے تو دیکھیں۔ ممکن ہے، بات بن جائے۔“

”مجھے تو ایک فیصد بھی امید نہیں ہے۔“

میں نے کہا۔ ”کوشش کرنے میں کیا حرج ہے؟“

وہ چند لمحے سوچتا رہا پھر جذبات سے عاری لہجے میں بولا۔ ”دراصل ایک طویل عرصے سے ہمارے درمیان بات چیت نہ ہونے کے برابر ہے۔ آپ ایسا کریں کہ مجھے دوسری شادی کا اجازت نامہ تیار کر دیں۔ میں صادقہ سے اس پر دستخط کروانے کی کوشش کرتا ہوں۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا۔ ”آپ اپنے کوائف مجھے لکھوا دیں۔ میں ایسا اجازت نامہ تیار کروا لوں گا۔ آپ کل دوپہر دو بجے کے بعد میرے پاس آ جائیں۔“

”آپ کی فیس بیگ صاحب......“

میں نے ہاتھ کے اشارے سے اُسے مزید بولنے سے روک دیا پھر خود کہا۔ ”کل آپ

آئیں گے تو اس مسئلے پر بھی بات کرلیں گے۔''

وہ میرا شکریہ ادا کر کے رخصت ہو گیا۔

میں نے اس سے متعلق ضروری کوائف اپنے پاس نوٹ کر لئے تھے۔ جمشید علی کے جانے کے بعد میں نے سیکرٹری کو بلا کر ''اجازت نامہ برائے عقد ثانی'' کا مضمون اُسے لکھوایا اور اسٹامپ پیپر پر ٹائپ کرنے کی ہدایت کر دی۔ اس اجازت نامے کا مضمون انگریزی میں کچھ یوں تھا۔

''من کہ مسماۃ صادقہ بیگم زوجہ جمشید علی بہ قائمی ہوش و حواس اس بات کا اقرار کرتی ہوں کہ میں نے اپنے شوہر جمشید علی ولد عبدالستار کو عقد ثانی کی اجازت بہ رضا و رغبت اور بلا جبرو کراہ دے دی ہے اور یہ تحریر لکھ دی ہے تا کہ سند رہے اور بہ وقت ضرورت کام آئے...... صادقہ بیگم زوجہ جمشید علی۔''

اس کے نیچے صادقہ بیگم کو دستخط کرنا تھے۔ اسٹامپ کے زیریں حصے میں کچھ جگہ قانونی کارروائی کے لئے خالی چھوڑ دی گئی تھی۔

دوسرے روز حسب وعدہ جمشید علی میرے دفتر میں آیا تو میں نے دراز میں سے تہہ شدہ اسٹامپ پیپر نکال کر اُس کے سامنے رکھ دیا۔ ''آپ اسے پڑھ لیں، کوئی کمی بیشی کرنی ہو تو بتائیں۔''

اُس نے دو تین مرتبہ اسٹامپ پیپر کے مضمون کو بغور پڑھا۔ اس دوران میں وہ بار بار اپنی پیشانی سے پسینہ پونچھتا رہا تھا حالانکہ وہ اس وقت ایئر کنڈیشنڈ کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ اسٹامپ پیپر کے مطالعے سے فارغ ہو کر اُس نے میری جانب دیکھا تو میں نے کہا۔ ''لگتا ہے، آپ اپنی بیوی سے بہت گھبراتے ہیں۔''

اُس کے چہرے پر ایسے تاثرات نمودار ہوئے جیسے میں نے اُس کے دل کا چور پکڑ لیا ہو۔ اضطراری انداز میں اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے بولا۔

''بیگ صاحب! میں صادقہ سے نہیں، اُس کی بدزبانی سے گھبراتا ہوں۔ آپ کو معلوم نہیں وہ کس قدر اذیت ناک اور ناقابل برداشت عورت ہے۔''

اپنی بات ختم کر کے اُس نے اسٹامپ پیپر کو تہہ کیا، پھر جیب میں رکھتے ہوئے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ''اب مجھے اجازت دیں۔ انشاء اللہ بہت جلد آپ سے ملاقات ہوگی۔''

میں نے اُس سے الوداعی مصافحہ کیا اور وہ رخصت ہو گیا۔ جمشید کے جانے کے بعد میں اُس کے کہے ہوئے الفاظ پر غور کرنے لگا۔ اُس نے چند الفاظ میں ایک بہت بڑی حقیقت

بیان کر دی تھی۔

مرد واقعی عورت سے نہیں بلکہ اُس کی بدکلامی سے دُور بھاگتا ہے۔ دنیا بھر میں خوش زبان اور خدمت گار بیویاں انتہائی خوش گوار اور پُرسکون ازدواجی زندگی گزارتی ہیں بلکہ اپنے شوہروں کے دلوں پر راج کرتی ہیں۔

☆.....☆
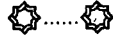
دو روز کے بعد ایک فربہ اندام عورت میرے دفتر میں داخل ہوئی۔ اُس نے جدید تراش خراش کا ایک ریشمی شلوار سوٹ پہن رکھا تھا۔ وہ تیکھے نقوش والی ایک سانولی سلونی عورت تھی۔ اُس کے بال شانوں تک کٹے ہوئے تھے اور عمر لگ بھگ اڑتیس اُنتالیس سال تھی۔ اگر اُس نے اپنی صحت کا خیال رکھا ہوتا تو یقینی طور پر وہ ایک پُرکشش عورت ہو سکتی تھی۔ اپنے حلیے اور وضع قطع سے وہ خاصی ماڈرن اور آسودہ حال نظر آتی تھی۔

وہ بے تکلفی سے ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے عام سے لہجے میں بولی۔ ''اور سنائیں بیگ صاحب! کیا حال چال ہیں؟''

اُس کے بات کرنے کا انداز ایسا تھا جیسے وہ میری دیرینہ شناسا ہو لیکن میں اُسے زندگی میں پہلی مرتبہ دیکھ رہا تھا یا اگر آج سے پہلے کبھی دیکھا تھا تو مجھے یاد نہیں تھا۔

''اللہ کا کرم ہے۔'' میں نے مسکراتے ہوئے اُس کے سوال کا جواب دیا۔

وہ بولی۔ ''کام کیسا چل رہا ہے؟''

''بس ٹھیک ٹھاک ہی ہے۔'' میں نے کہا پھر پوچھا۔ ''آپ کی تعریف، میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔''

''پہچاننے کا کیا سوال ہے۔'' اُس نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ''آج ہم پہلی مرتبہ مل رہے ہیں۔ ویسے میں اپنا تعارف کروا دوں۔ میرا نام صادقہ بیگم ہے۔''

''کون صادقہ بیگم؟''

میں سمجھ تو گیا تھا کہ موصوفہ جمشید علی کی بیگم ہیں لیکن میں دانستہ انجان بن گیا تھا۔ وہ قدرے ترش لہجے میں بولی۔ ''میں بیگم جمشید علی ہوں۔ وہی جمشید علی جو دو روز قبل آپ کے مفید مشوروں سے مستفید ہو کر گیا ہے۔''

''میرے پاس روزانہ جانے کتنے جمشید علی آتے ہیں۔'' میں نے اب بھی اپنی بے پروائی کو برقرار رکھا۔ ''اور میں سب کو مفید مشورے ہی دیتا ہوں۔''

اُس نے ایک نظر مجھے دیکھا پھر اپنے ہینڈ بیگ میں سے ایک تہہ شدہ کاغذ نکال کر

میرے سامنے میز پر پھینکتے ہوئے بولی۔ ''میں اس جمشید علی کی بات کر رہی ہوں۔ اس اسٹامپ پیپر کو پہچانتے ہیں آپ؟''

میں نے پہچاننے کے باوجود بھی تہہ شدہ اسٹامپ پیپر کھول کر ایک نظر دیکھا پھر سوالیہ نظروں سے صادقہ بیگم کی طرف دیکھنے لگا۔

''کچھ یاد آیا آپ کو؟'' اُس نے پوچھا۔

''ہاں، کچھ کچھ یاد تو آرہا ہے۔'' میں نے کہا اور اسٹامپ پیپر کو میز پر ڈال دیا۔

صادقہ بیگم نے کہا۔ ''آپ دیکھنے میں تو خاصے معقول شخص نظر آتے ہیں پھر اس اسٹامپ پیپر کا کیا مطلب ہے؟''

مجھے اُس کا انداز ناگوار گزرا لیکن میں نے حتیٰ الامکان برداشت کرتے ہوئے کہا۔ ''اس کا مطلب جمشید علی نے آپ کو بتا دیا ہوگا۔''

صادقہ بیگم نے غصیلی نظروں سے مجھے دیکھا اور بولی۔ ''آپ کیا چاہتے ہیں، میں اس پروانۂ خودکشی پر دستخط کر دوں؟''

''معاف کیجئے خاتون۔'' میں نے کہا۔ ''یہ میری نہیں بلکہ آپ کے شوہر کی خواہش ہے۔''

''وہ میرا جما جمایا گھر برباد کرنے پر تل گیا ہے۔'' وہ پھنکاری۔ ''لیکن میں اُسے ایسا ہرگز نہیں کرنے دوں گی۔ اُس کی جرأت کیسے ہوئی ایسا کاغذ تیار کروانے کی۔ میں طویل عرصے سے اُس کی غیر نصابی سرگرمیاں برداشت کر رہی ہوں۔ میری جگہ اگر کوئی دوسری عورت ہوتی تو اب تک خودکشی کر چکی ہوتی یا جمشید علی کو موت کے گھاٹ اتار چکی ہوتی۔ میں جمشید علی کو کسی بھی صورت دوسری شادی نہیں کرنے دوں گی۔''

میں نے کہا۔ ''ویسے تو مجھے آپ کے گھریلو معاملات میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں ہے لیکن جہاں تک آپ کے حالات میرے علم میں آئے ہیں ان کے پیش نظر میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ آپ کے شوہر دوسری شادی کا پختہ تہیہ کئے بیٹھے ہیں اور اگر آپ نے اس سلسلے میں رُکاوٹ ڈالنے کی کوشش کی تو ان کا کچھ نہیں بگڑے گا۔ آپ سراسر نقصان میں رہیں گی۔''

''آپ مرد ہیں اور پھر جمشید کے وکیل ہیں، اسی کی طرف داری کریں گے۔'' وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔ ''لیکن میں ابھی اتنی بھی بے دست و پا نہیں ہوئی کہ وہ من مانی کرتا پھرے۔ میں اُسے چھٹی کا دودھ یاد دلا دوں گی۔''

وہ جس انداز سے اپنے شوہر کا ذکر کر رہی تھی اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ جمشید علی واقعی مظلوم تھا اور اُسے صادقہ جیسی عورت کے ساتھ اتنا طویل عرصہ گزارنے پر ''تمغۂ برداشت'' ملنا چاہئے تھا۔

میں نے کہا۔ ''خاتون، آپ اپنے حالات کو زیادہ بہتر طور پر جانتی ہیں۔ میں تو آپ کو مشورہ ہی دے سکتا ہوں کہ شوہر کی مخالفت کی بجائے اس معاملے کو افہام و تفہیم سے سلجھانے کی کوشش کریں۔''

''افہام و تفہیم کا وقت گزر چکا ہے وکیل صاحب!'' وہ خوف ناک لہجے میں بولی۔ ''آپ کو ہمارے اندرونی حالات کا صحیح طور پر علم نہیں ہے۔ آپ نہیں جانتے میں کب سے جمشید علی کی بے وفائیاں برداشت کر رہی ہوں۔ مجھے اس کی ایک ایک حرکت کا علم ہے۔ کئی عورتوں سے اُس کے ناجائز تعلقات ہیں۔ آج کل وہ بیگم نجم الدین پر کچھ زیادہ ہی مہربان ہے۔ بے چاری حال ہی میں بیوہ ہوئی ہیں۔ جمشید کی ''ہمدردی'' کا وہ خصوصی نشانہ ہیں۔ آپ کو تو جمشید نے بتایا ہی ہوگا۔ کیا وہ بیگم نجم الدین سے شادی کا ارادہ رکھتا ہے؟''

''میرے علم میں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔

وہ بولی۔ ''میں تو مر کر بھی جمشید کو دوسری شادی کرنے کی اجازت نہیں دوں گی۔ اگر اس نے میرے علم میں لائے بغیر ایسی کوئی حرکت کی تو میں اسے عدالت میں گھسیٹ لوں گی۔ وکیل صاحب! آپ کا قانون اس سلسلے میں کیا کہتا ہے؟''

میں نے بیگم صادقہ جمشید علی کو بتایا۔ ''عائلی قوانین کے مطابق کوئی شخص اپنی پہلی بیوی اور ثالثی کونسل کی اجازت کے بغیر دوسری شادی نہیں کر سکتا۔ اگر کوئی ایسا کرتا ہے تو نہ صرف یہ کہ وہ شادی قانون کی نظر میں کالعدم تصور ہوگی بلکہ ایسا شخص سزا کا مستوجب بھی ٹھہرے گا۔ ایسی صورت میں اسے فوری طور پر پہلی بیوی کو مہر کی رقم ادا کرنا ہوگی اور سزا کے طور پر اُسے ایک سال قید محض یا جرمانہ..... جو پانچ ہزار روپے تک ہو سکتا ہے، ادا کرنا ہوگا یا دونوں سزاؤں کا بہ یک وقت مستوجب ہوگا۔''

وہ خوش ہوتے ہوئے بولی۔ ''حق مہر کی رقم کی میرے نزدیک اتنی اہمیت نہیں ہے البتہ جب وہ ایک سال کے لئے جیل جائے گا تو اس کے چودہ طبق بہ یک وقت گل ہو جائیں گے..... اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ دوسری شادی کی قانون کی نظر میں کوئی حیثیت نہیں ہو گی۔'' ایک لمحہ کو رُک کر اُس نے اضافہ کیا۔ ''کیا آپ نے جمشید علی کو یہ ساری قانونی باریکیاں سمجھا دی تھیں؟''

"ہاں۔" میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ "بہت کچھ وہ پہلے سے جانتا تھا، باقی میں نے بتا دیا تھا۔"

وہ تیوری چڑھا کر بولی۔ "اس کے باوجود بھی وہ اسٹامپ پیپر تیار کرواکے میرے پاس لے آیا تھا۔ احمق کہیں کا۔"

"میرے خیال میں اس کا یہ عمل اس کی عقل مندی پر دلالت کرتا ہے۔" میں نے کہا۔ "اس نے سیدھا طریقہ اختیار کرتے ہوئے آپ سے دوسری شادی کی اجازت مانگی تھی۔"

وہ بولی۔ "یہ جانتے ہوئے بھی کہ میں اسے ایسی اجازت ہرگز نہیں دوں گی۔"

"اس نے میرے مشورے پر عمل کیا تھا۔" میں نے کہا۔ "ورنہ وہ تو بڑا خطرناک ارادہ لے کر آیا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ بات اس کی سمجھ میں آ گئی ورنہ آپ کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچ جاتا۔"

"کیسا نقصان؟" اُس نے مجھے گھور کر دیکھا۔

میں نے بتایا۔ "آپ کو یہ بات تو معلوم ہی ہو گی کہ مرد کو طلاق دینے کا پورا اختیار حاصل ہوتا ہے۔ وہ زبانی یا تحریری طور پر کسی بھی صورت اپنی بیوی کو طلاق دینے کا حق رکھتا ہے اور عورت اس کے اس حق کو چیلنج نہیں کر سکتی۔ عورت کے پاس صرف یہ راہ رہ جاتی ہے کہ وہ ثالثی کونسل کے چیئر مین کے توسط سے مصالحت کی کوشش کر سکتی ہے اور وہ بھی نوے دن کے اندر۔ بصورت دیگر طلاق مؤثر ہو جاتی ہے۔"

"واقعی، ہمارے عائلی قوانین میں یہ سب کچھ لکھا ہوا ہے؟" اُس نے بے یقینی سے مجھے دیکھا۔

میں نے اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

وہ جھنجھلاہٹ آمیز لہجے میں بولی۔ "میں ایسے کسی قانون کو نہیں مانتی۔ یہ تو سراسر ناانصافی پر مبنی ہے۔"

"آپ کے نہ ماننے سے قانون بدل نہیں جائے گا خاتون۔" میں نے معتدل لہجے میں کہا۔

وہ تیز لہجے میں بولی۔ "میں ایسے ظالمانہ قانون کے خلاف احتجاج کروں گی۔ اگر مرد کو طلاق کا حق حاصل ہے تو یہ حق عورت کو بھی ملنا چاہئے۔"

"آپ اس ضمن میں پٹیشن داخل کر سکتی ہے۔" میں نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔ "ممکن ہے، ایسا کوئی قانون پاس ہو جائے۔ اگر ایسا ہو گیا تو ہم مغرب والوں کو بہت پیچھے

چھوڑ دیں گے۔"

اس کے بعد وہ جتنی دیر بیٹھی، اپنے شوہر کی بیرونِ خانہ سرگرمیوں کا رونا روتی رہی۔ اس کا خیال تھا کہ جمشید علی مسلسل بے وفائی کا مرتکب ہو رہا تھا۔ کئی عورتوں کے اس کے تعلقات تھے۔ وغیرہ وغیرہ۔ اُس نے یہ بھی دعویٰ کیا کہ وہ قیامت تک جمشید کا دوسری شادی کا خواب پورا نہیں ہونے دے گی۔ جانے سے پہلے اُس نے میری نظروں کے سامنے مذکورہ اسٹامپ پیپر کے ٹکڑے کیے اور میری جانب بڑھاتے ہوئے بولی۔

"اسے ڈسٹ بن میں ڈال دیں بیگ صاحب۔"

میں نے اسٹامپ پیپر کے پُرزے لے کر اپنے سامنے میز پر رکھ دیے۔ وہ اٹھتے ہوئے بولی۔ "میرا خیال ہے، آپ یہ ٹکڑے جمشید علی کو واپس کرنا چاہتے ہیں۔ شوق سے کیجئے لیکن ایک بات اسے یہ بھی بتا دیجئے کہ میں آسانی سے اس کا پیچھا نہیں چھوڑوں گی۔ اگر اُس نے مجھے طلاق دینے کے بارے میں سوچا بھی تو میں اس کا جینا دوبھر کر دوں گی۔ اسے میری طاقت کا اندازہ نہیں ہے۔"

پھر وہ تیز قدموں سے چلتی ہوئی میرے دفتر سے نکل گئی۔

اگلے روز جمشید علی اسی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا جہاں سے گزشتہ روز صادقہ بیگم غصے میں طنطناتے ہوئے اٹھ کر گئی تھی۔ جمشید علی کے چہرے سے پریشانی ہویدا تھی اور وہ خاصا نروس نظر آ رہا تھا۔

میں نے پوچھا۔ "خیریت تو ہے جمشید صاحب۔ آپ کی حالت اتنی غیر کیوں ہو رہی ہے؟"

"کیا صادقہ کل آپ سے ملنے آئی تھی؟" اُس نے میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے اُلٹا مجھ سے سوال کر دیا۔

میں نے اثبات میں جواب دیا۔ وہ بولا۔ "اُسے معلوم ہو گیا تھا کہ میں آپ کے دفتر سے ہو کر گیا ہوں۔ میرے کچھ بتانے سے پہلے ہی اُس نے مجھے مطلع کیا تھا کہ میں وکیل سے مل کر آ رہا ہوں۔ پھر اُس نے پوچھا کہ میں کس سلسلے میں آپ سے ملنے آیا تھا تو جواب میں، میں نے ٹائپ شدہ اسٹامپ پیپر نکال کر اُس کے سامنے کر دیا۔ اُس نے اسٹامپ پیپر کا مضمون پڑھا اور غصے سے لال پیلی ہو گئی۔ میں نے اُسے تاکید کی کہ وہ شرافت اور خاموشی سے اسٹامپ پیپر پر دستخط کر دے۔ وہ تھوڑی دیر خاموش کھڑی کچھ سوچتی رہی پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ "ٹھیک ہے، مجھے کچھ سوچنے کی مہلت دو۔ میں اس سلسلے میں تمہارے

وکیل سے بھی ملوں گی۔ میں نے اُسے مہلت دے دی، مہلت نہ بھی دیتا تو میں اُس کا کیا بگاڑ سکتا تھا۔ اُس نے تو اپنی بے ہودگیوں سے پورا گھر بگاڑ رکھا ہے۔ کل وہ آپ سے مل کر گئی ہے تو اُس نے گھر میں ایک قیامت برپا کر رکھی ہے۔ اُس نے نازیہ اور آصف کو بھی بتا دیا ہے کہ میں اُن کی سوتیلی ماں لانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ وہ تو پہلے ہی مجھ سے بہت کم بات کرتے تھے، اب تو کل سے جب بھی سامنا ہوتا ہے، وہ نفرت آمیز نگاہوں سے مجھے گھورنے لگتے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا، کیا کروں۔ میں تو ایک عجیب مصیبت میں گرفتار ہو گیا ہوں۔''

اُس کا طویل بیان ختم ہوا تو میں نے سوال کیا۔ ''جمشید صاحب! آپ کی بیوی کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ آپ میرے پاس کوئی مشورہ کرنے آئے تھے۔ کیا آپ نے اُسے یہ بات بتائی تھی؟''

''نہیں، میرے کچھ بتانے سے قبل ہی اُس نے میری چوری پکڑ لی تھی۔'' جمشید علی نے جواب دیا۔ ''اس میں اچنبھے کی کوئی بات نہیں ہے۔ میں جانتا ہوں، وہ میری نگرانی کرواتی ہے۔ اس کا کوئی وفادار سائے کی طرح میرے پیچھے لگا رہتا ہے۔ میرے دفتر میں بھی اُس کا ایک خبر رساں موجود ہے جو دفتری معاملات کی اطلاعات اُس تک پہنچاتا رہتا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''کمال ہے، آپ اپنی بیوی کے جاسوس سے واقف بھی ہیں اور اُسے اپنے دفتر میں برداشت بھی کر رہے ہیں۔ یہ کوئی عقل مندی کی بات تو نہیں ہے۔''

''آپ بالکل ٹھیک کہتے ہیں۔'' وہ سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میں اپنے اکاؤنٹنٹ کو واقعی برداشت کر رہا ہوں جبکہ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ وہ صادقہ کا وفادار ہے۔ دراصل میں عبدالرحمٰن (اکاؤنٹنٹ) کو فی الفور نوکری سے برخاست نہیں کر سکتا۔ ایک تو وہ بہت کام کا بندہ ہے اُس نے بہ یک وقت اکاؤنٹنٹ اور کیشئر کا کام سنبھال رکھا ہے دوسرے میں کسی مناسب موقع کی تلاش میں ہوں۔ میں پہلے کسی معقول آدمی کا انتظام کرنا چاہتا ہوں اور پھر عبدالرحمٰن کو رنگے ہاتھوں بھی پکڑنا چاہتا ہوں۔''

''آپ تو ہر طرف سے مسائل میں گھرے ہوئے ہیں۔''

''میں دفتری مسائل سے بالکل نہیں گھبراتا۔'' وہ پُراعتماد لہجے میں بولا۔ ''سب سے بڑا مسئلہ تو صادقہ کا ہے۔ میں فوری طور پر کسی نہ کسی طرح اس مسئلے سے نجات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔''

''آپ کی بیوی بتا رہی تھی کہ آپ کسی بیگم نجم الدین میں آج کل بہت دلچسپی لے رہے

ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

وہ بیزاری سے بولا۔ ''احمق ہے وہ۔ جب میں نے اُسے اسٹامپ پیپر دستخط کرنے کے لئے دیا تھا تو اس وقت بھی اُس کا مؤقف یہ ہی تھا کہ میں بیگم نجم الدین سے دوسری شادی کا خواہاں ہوں جبکہ حقیقت سے اس کا دُور کا واسطہ بھی نہیں ہے۔''

میں نے پوچھا۔ ''اور حقیقت کیا ہے؟''

وہ تامل کرتے ہوئے بولا۔ ''بیگم نجم الدین درحقیقت میرے مرحوم دوست نجم الدین کی بیوہ ہیں۔ چھ ماہ قبل نجم الدین ایک حادثے کا شکار ہو کر چل بسے تھے۔ مرحوم بڑی خوبیوں کے مالک تھے۔ دنیا میں اکیلے تھے اور مجھ سے گہری دوستی تھی۔ اللہ کی مرضی ہے، وہ آٹھ سالہ ازدواجی رفاقت کے باوجود بھی اولاد جیسی نعمت سے محروم تھے۔ ان کی وفات کے بعد بیگم نجم الدین تنہا رہ گئی ہیں۔ میں نہ صرف اُن کی دل جوئی کے لئے باقاعدہ اُن کے گھر جاتا ہوں بلکہ اُن کے کاروبار کی نگرانی بھی کر رہا ہوں۔ مرحوم نجم الدین فروٹ کے ایکسپورٹ کا بزنس کرتے تھے۔ اُن کا منیجر اب بھی بخوبی یہ کام چلا رہا ہے لیکن پھر بھی میں بہ طورِ احتیاط، بھابھی کی درخواست پر حسابات چیک کرتا رہتا ہوں۔ میری ان ہی مصروفیات کی بناء پر صادقہ کو شک ہو گیا ہے کہ میں نجم الدین کی بیوہ سے شادی کا ارادہ رکھتا ہوں۔''

میں نے پوچھا۔ ''کیا آپ مجھے بتانا پسند کریں گے کہ دوسری شادی کے لئے آپ نے کس لڑکی کا انتخاب کیا ہے؟''

''میں آپ کو ضرور بتا دوں گا بیگ صاحب۔'' وہ جزبز ہوتے ہوئے بولا۔ ''لیکن آپ سے میری چھوٹی سی درخواست ہے کہ سردست اس موضوع کو نہ چھیڑیں۔ میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ بہت جلد آپ کو نہ صرف اس لڑکی کا نام بتا دوں گا بلکہ آپ کو اس سے ملوا بھی دوں گا۔''

میں نے کہا۔ ''آپ نے پہلی ملاقات میں اپنی بیگم کے مزاج اور عادات و اطوار کا جو نقشہ کھینچا تھا وہ اس پرصد فیصد پوری اترتی ہیں۔ میں نے کل آدھے گھنٹے کی بات چیت میں اندازہ لگایا ہے کہ وہ کسی بھی صورت آپ کو دوسری شادی کی اجازت نہیں دیں گی۔''

''آپ کا اندازہ بالکل درست ہے۔''

میں نے اپنی میز کی دراز میں سے اسٹامپ پیپر کے پُرزے نکال کر اُس کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ حشر کیا ہے آپ کی نصف بہتر نے اس اسٹامپ پیپر کا۔''

وہ بھونڈے انداز میں مسکرایا۔ ''اُس کا بس چلے تو وہ میرا بھی یہی حشر کر دے بیگ

صاحب۔''

میں نے کہا۔''آپ کو اپنی بیگم کی طرف سے محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ مجھے اُن کے ارادے خاصے خطرناک نظر آ رہے تھے۔''

''میں نے اس زہریلی ناگن کا زہر نکالنے کا فیصلہ کرلیا ہے بیگ صاحب۔'' وہ فیصلہ کن لہجے میں بولا۔''اس کی ساری خطرناکی دھری کی دھری رہ جائے گی۔''

میں نے سوالیہ نظروں سے جمشید کی طرف دیکھا، وہ میری نگاہوں کا مطلب سمجھتے ہوئے بولا۔''میں صادقہ بیگم سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے بڑے سے بڑا نقصان برداشت کرنے کو تیار ہوں۔ اب اس عورت کے ساتھ میں ایک لمحہ بھی گزارا نہیں کرسکتا۔ کل آپ کے پاس سے جانے کے بعد اُس نے میری والدہ سے انتہائی بدتمیزی کی ہے بلکہ یہاں تک کہہ دیا ہے کہ اگر انہوں نے مجھے دوسری شادی سے باز رکھنے کی کوشش نہیں کی تو وہ میری والدہ کو دھکے دے کر بنگلے سے نکال دے گی اور مجھے بھی بنگلے میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دے گی۔''

''جمشید صاحب! آپ کی بیوی تو بڑی دیدہ دلیر عورت ہے۔'' میں نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔''یعنی آپ ہی کے بنگلے سے وہ آپ کو اور آپ کی والدہ کو بے دخل کرنے کا منصوبہ بنا رہی ہے۔''

وہ ناگواری سے بولا۔''وہ ایسی ہی عورت ہے بیگ صاحب۔'' ایک لمحے کے توقف سے اُس نے اضافہ کیا۔''اور میں جانتا ہوں کہ اُس نے اتنی بڑی بات کس برتے پر کی ہے۔''

''کیا میں اس کی وجہ جان سکتا ہوں؟''

''آپ کو بتانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔'' وہ تعاون آمیز لہجے میں بولا۔''دراصل صادقہ کو یہ غرا ہے کہ مذکورہ بنگلہ اُس کے نام ہے لیکن وہ اُلو کی پٹھی یہ نہیں جانتی کہ میں اپنی والدہ کی عزت کے لئے ایسے دس بنگلے قربان کرسکتا ہوں۔ کل رات اُس نے گھر میں جو اودھم مچایا ہے اس کے بعد میرے دل اور زندگی میں صادقہ کے لئے ذرہ برابر بھی گنجائش باقی نہیں رہی۔ میں پہلی فرصت میں اُس سے علیحدگی اختیار کرنا چاہتا ہوں اور اس کا بہترین طریقہ یہ ہی ہے کہ میں اسے طلاق دے دوں۔ آپ اس سلسلے میں میری قانونی راہ نمائی فرمائیں۔''

میں نے پوچھا۔''کیا یہ آپ کا حتمی فیصلہ ہے؟''

''ہاں۔'' اُس نے اثبات میں جواب دیا۔''اب صادقہ سے مصالحت کی ہر راہ بند ہو چکی

ہے۔ آپ طلاق کے کاغذات تیار کرلیں۔''

میں نے اپنا فرض پورا کرتے ہوئے کہا۔''میرا مشورہ ہے جمشید صاحب کہ آپ اس مسئلے پر ایک مرتبہ پھر ٹھنڈے دل و دماغ سے غور کرلیں۔''

''بیگ صاحب! میں نے دل و دماغ کے تمام دروازے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے صادقہ پر بند کردیئے ہیں۔ میری خواہش ہے کہ میں تین لفظ بول کر صادقہ کو طلاق دے کر فارغ کر دوں لیکن عائلی قوانین کی رو سے ثالثی کونسل سے طلاق کی تحریری توثیق بھی ضروری قرار دے دی گئی ہے اس لئے آپ تمام ضروری کاغذات تیار کرلیں۔''

میں نے پوچھا۔''کیا جمشید ٹیکسٹائل مل میں بھی آپ کی بیگم کا کوئی حصہ ہے؟''

''نہیں۔'' اُس نے نفی میں سر ہلایا۔''میں اس فیکٹری کا بلاشرکت غیرے مالک ہوں۔ ہمارا موجودہ بنگلہ اور ایک گاڑی صادقہ کے نام ہے۔ میں ان دونوں چیزوں کو اپنی جان کا صدقہ سمجھوں گا۔ خدا ایک بار اس بے ہودہ اور بدزبان عورت سے میری جان چھڑا دے۔''

''کیا آپ کا کوئی مشترکہ بینک اکاؤنٹ بھی ہے؟''

اُس نے نفی میں جواب دیا۔''ہمارے بینک اکاؤنٹس علیحدہ علیحدہ ہیں۔''

میں نے پوچھا۔''آپ کے نکاح فارم پر حق مہر کی مالیت کیا ہے؟''

''ایک لاکھ روپیہ سکہ پاکستان رائج الوقت۔'' اُس نے جواب دیا۔''میں طلاق نامے کے ساتھ ہی اس رقم کا چیک بھی اُسے بھجوانا چاہتا ہوں۔''

''بچوں کا کیا ہوگا؟'' میں نے ایک اہم سوال کیا۔

وہ دُکھی لہجے میں بولا۔''دونوں بچے تو میرے ساتھ رہتے ہوئے بھی میرے نہیں ہیں۔ وہ پوری طرح اپنی ماں کی مٹھی میں ہیں اور مجھے ایک ظالم اور خودغرض باپ سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ مجھے دولت کے سوا کسی بھی چیز سے کوئی غرض نہیں ہے۔''

''اس کا تو واضح مطلب یہ ہی ہوا کہ دونوں بچے اپنی والدہ کے ساتھ رہنا پسند کریں گے۔'' میں نے کہا۔''طلاق کے بعد آپ کو اپنی والدہ کے ساتھ کہیں دوسری جگہ منتقل ہونا پڑے گا۔''

''میں چٹکی بجاتے میں اپنی رہائش کا بندوبست کرلوں گا۔'' وہ رعونت آمیز لہجے میں بولا۔ ''اور جہاں تک بچوں کا تعلق ہے تو وہ اب اس عمر کو پہنچ چکے ہیں کہ اپنی مرضی کے مطابق کہیں بھی رہنے کے قانونی طور پر مجاز ہیں۔ میں ان پر اپنی مرضی مسلط نہیں کرسکوں گا۔''

میں نے کہا۔''ٹھیک ہے، میں آپ کی خواہش کے مطابق طلاق نامے کے کاغذات تیار

کروالیتا ہوں۔کل آپ بعد از دوپہر دو سے چھ بجے کے دوران میں کسی بھی وقت آ کر دستخط کر دیں۔ میں کل ہی بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک طلاق نامہ آپ کی بیوی کو بھجوا دوں گا۔ اس کے ساتھ ہی طلاق نامے کی ایک نقل یونین کونسل کے دفتر بھی بھیجنا ہوگی تاکہ سند رہے اور بہ وقت ضرورت کام آئے۔"

جمشید علی پندرہ بیس منٹ مزید میرے دفتر میں رُکا اور اس سلسلے میں مختلف قانونی نکات پوچھتا رہا۔ میں نے بھی اُس سے طلاق نامے کی تیاری میں استعمال ہونے والی تمام معلومات حاصل کرلیں۔

جمشید علی نے میرا شکریہ ادا کیا اور کل آنے کا وعدہ کر کے رخصت ہو گیا۔

اگلے روز میں نے جمشید علی کے حسب منشا طلاق نامہ تیار کر دیا۔ حق مہر کی رقم کا کراس چیک وہ اپنے ساتھ لے کر آیا تھا۔ میں نے اُس چیک کو طلاق نامے کے ساتھ نتھی کر دیا اور صادقہ کے نام رجسٹری کر دیا۔

میں ایک بات آپ کو بتانا بھول گیا۔ گزشتہ روز جمشید علی کے رخصت ہونے سے قبل میں نے اُس سے وکالت نامے پر دستخط کروالئے تھے اور اپنی فیس وصول کرنا بھی نہیں بھولا تھا۔

چار روز بعد مذکورہ رجسٹری مجھے واپس موصول ہو گئی۔ صادقہ نے وہ رجسٹری وصول نہیں کی تھی۔ ڈاکیے نے اپنے ہاتھ سے رجسٹری پر یہ ریمارکس تحریر کئے تھے۔ "مکتوب الیہ رجسٹری وصول کرنے سے انکاری ہے۔"

اس دوران میں جمشید علی مسلسل مجھ سے رابطہ رکھے ہوئے تھا اور میں نے اُس سے وعدہ کیا تھا کہ جیسے ہی دوسری جانب سے کوئی جواب موصول ہو، میں فوری طور پر اُسے آگاہ کروں گا۔

رجسٹری کی واپسی کے بعد میں نے جمشید علی کو اُس کی فیکٹری فون کیا۔ آپریٹر نے لائن دی تو جمشید علی میری آواز سنتے ہی پہچان گیا پھر بے قراری سے پوچھنے لگا۔ "کیا خیر خبر ہے بیگ صاحب؟"

میں نے بتایا۔ "رجسٹری واپس آ گئی ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"آپ کی بیوی نے رجسٹری وصول کرنے سے انکار کر دیا ہے۔"

وہ تشویش ناک لہجے میں بولا۔ "اب کیا ہوگا؟"

"جو بھی ہوگا، اچھا ہی ہوگا جمشید صاحب۔" میں نے تشفی آمیز انداز میں کہا۔ "آپ

بالکل بے فکر ہو جائیں۔"

"میں بے فکر کیسے ہو جاؤں۔" وہ جلدی سے بولا۔ "آگے کیا ہوگا، کچھ مجھے بھی تو بتائیں۔"

میں نے بتایا۔ "آپ کے سامنے ہی میں نے طلاق نامے کی ایک نقل ثالثی کونسل کے دفتر بھی روانہ کی تھی۔ اب اس کے بعد اُن کا کام شروع ہوتا ہے۔"

"وہ کیا کریں گے؟"

"وہ فریقین کے نام سمن جاری کریں گے۔" میں نے بتایا۔ "آپ دونوں کو ثالثی کونسل کے دفتر میں جا کر وضاحت کرنا ہوگی۔ مصالحتی کمیٹی آپ دونوں کے مابین مصالحت کی کوشش کرے گی۔ اگر آپ نے مصالحت سے صاف انکار کر دیا تو نوے روز کے بعد طلاق کی توثیق ہو جائے گی۔"

جمشید نے پوچھا۔ "ثالثی کونسل کب تک ہمارے نام سمن جاری کرے گی؟"

"میرا خیال ہے، ایک ہفتے کے اندر آپ کو سمن مل جائے گا۔"

تھوڑی سی مزید گفتگو کے بعد میں نے فون بند کر دیا۔ میرا خیال تھا کہ اب ثالثی کونسل والے اس مسئلے سے بخوبی نمٹ لیں گے اور مجھے زیادہ بھاگ دوڑ نہیں کرنا پڑے گی۔

پانچ روز کے بعد جمشید علی نے فون کر کے مجھے بتایا کہ اُس نے سمن وصول کر لیا ہے۔ میں نے حتیٰ المقدور اُس کی تسلی تشفی کی۔ وہ مصر تھا کہ میں تمام وقت اُس کے ساتھ رہوں۔ میں اُس کا وکیل تھا۔ وہ نہ بھی کہتا تو تمام اہم مراحل پر مجھے اُس کے ساتھ ہی رہنا تھا۔ بہرحال، میں نے حوصلہ بخش الفاظ میں اُسے یقین دہانی کروادی۔

✿......✿
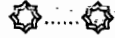
اگلے روز میں اپنے دفتر میں ایک مؤکل کے ساتھ مصروف تھا کہ سیکرٹری نے انٹرکام پر مجھے مطلع کیا۔ "بیگ صاحب! نیلم نامی ایک خاتون فوری طور پر آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔"

"تم نے اُسے بتایا نہیں کہ میں باری آنے پر ملاقات کرتا ہوں۔"

"میں نے بتایا تھا۔" سیکرٹری نے کہا۔ "لیکن وہ بضد ہیں کہ صرف چند سیکنڈ کے لئے ملنا چاہتی ہیں۔"

میں نے کہا۔ "ٹھیک ہے، میرے پاس موجود کلائنٹ کے بعد انہیں اندر بھیج دینا۔"

سیکرٹری چند لمحوں تک استقبالیہ پر موجود نیلم نامی کسی خاتون سے بات کرتی رہی پھر مجھ سے کہا۔ "بیگم صاحب! وہ کسی جمشید علی کے بارے میں آپ کو ہنگامی طور پر کچھ بتانا چاہ رہی

ہیں۔"

جمشید علی کے نام پر میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا پھر اپنی سیکرٹری سے کہا۔ "ٹھیک ہے، اسے اندر بھیج دو۔"

انٹر کام کا ریسیور رکھنے کے بعد میں نے اپنے سامنے بیٹھے ہوئے مؤکل سے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ "بس ایک منٹ میں، میں انہیں فارغ کر دوں گا۔"

میرے مؤکل نے اس مداخلت کو محسوس نہیں کیا اور بڑی خندہ پیشانی سے مجھے اس کی اجازت دے دی۔

نیلم چوبیس پچیس سال کی ایک حسین و جمیل عورت تھی۔ میں دل ہی دل میں اُس کے حسن کی تعریف کیے بنا نہ رہ سکا۔ اُس نے پھول دار کپڑے کا شلوار سوٹ پہن رکھا تھا جو اُس کی گوری رنگت پر خوب سج رہا تھا۔

رسمی کلمات کے بعد میں نے اُسے اپنے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میرے مؤکل کو دیکھ کر پہلے تو وہ جھجکی پھر بیٹھ گئی۔ اُس کی نشست سے بھی پریشانی عیاں تھی۔ چہرے پر حزن و ملال کے بادل میں پہلے ہی دیکھ چکا تھا۔

میں نے نرم لہجے میں استفسار کیا۔ "آپ جمشید علی کے بارے میں کیا اطلاع لے کر آئی ہیں؟"

"جمشید صاحب کو پولیس گرفتار کر کے لے گئی ہے۔" وہ روہانسے لہجے میں بولی۔

میں حیرت زدہ رہ گیا۔ "کیوں؟" میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ "پولیس نے جمشید صاحب کو کیوں گرفتار کیا ہے؟"

"اُن پر الزام ہے کہ انہوں نے اپنی بیوی صادقہ بیگم پر قاتلانہ حملہ کیا ہے۔" نیلم نے دل گرفتہ لہجے میں بتایا۔ "وہ اس وقت تھانے میں بند ہیں۔ انہوں نے مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے تاکہ آپ کو صورتِ حال سے آگاہ کر سکوں۔"

میں نے پوچھا۔ "پولیس نے جمشید علی کو کہاں سے گرفتار کیا ہے اور ان کی بیوی اس وقت کہاں ہیں؟"

"پولیس نے جمشید صاحب کو ہسپتال سے گرفتار کیا ہے۔ صادقہ بیگم اسی ہسپتال کے آئی سی یو میں موت و زیست کی کشمکش میں مبتلا ہیں۔"

میرے مزید استفسار پر نیلم نے بتایا کہ آج شام وہ اپنے باس جمشید علی کے ساتھ ہی اُس کے بنگلے پر پہنچی تھی۔ واضح رہے کہ نیلم ایک طویل عرصے سے جمشید علی کے دفتر میں کام کر

رہی تھی اور ترقی کرتے ہوئے اُس کی پرسنل سیکرٹری کے منصب تک جا پہنچی تھی۔ یہ بات ازاں بعد مجھے جمشید علی کی زبانی معلوم ہوئی تھی۔ نیلم نے بتایا کہ وہ آج پہلی مرتبہ اپنے باس کے ساتھ اس کے بنگلے پر آئی تھی۔ جمشید علی نے اسے بتایا تھا کہ وہ اسے اپنی والدہ سے ملوانا چاہتا تھا۔ بنگلے پر نیلم کی موجودگی سے صادقہ نے ایک طوفانِ بدتمیزی کھڑا کر دیا۔ دونوں میاں بیوی میں گھمسان کی زبانی جنگ ہوئی۔ پھر صادقہ بیگم نے اچانک ہی ریوالور نکال کر نیلم کو شوٹ کرنے کی کوشش کی۔ جمشید علی نے صادقہ کے ریوالور والے ہاتھ پر جھپٹا مارا۔ اسی دوران میں ریوالور چل گیا اور گولی صادقہ بیگم کے پیٹ میں لگی۔ وہ "ہائے میں مرگئی" کہہ کر وہیں پر ڈھیر ہو گئی۔ جمشید علی نے فی الفور اپنی گاڑی نکالی، صادقہ کو گاڑی کی عقبی نشست پر لٹایا اور ہسپتال کی جانب روانہ ہو گیا۔ نیلم اس وقت جمشید کے ساتھ ہی پسنجر سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ صادقہ کو فوری طور پر ایمرجنسی میں داخل کر لیا گیا۔ بعد ازاں اُسے آئی سی یو میں منتقل کر دیا گیا۔ اُس کی حالت خطرے سے باہر نہیں تھی۔ اُنہیں ہسپتال میں پہنچے ابھی آدھا گھنٹہ ہی گزرا ہو گا کہ پولیس وہاں آن دھمکی اور جمشید علی کو اپنی بیوی پر قاتلانہ حملے کے الزام میں گرفتار کر کے اپنے ساتھ لے گئی۔ پولیس کے ہمراہ روانہ ہونے سے قبل جمشید علی نے نیلم کو میری جانب دوڑا دیا تھا تاکہ میں اُسے پیش آنے والے ناگہانی واقعے سے آگاہ ہو سکوں۔

نیلم کی زبانی مجھے جو معلومات حاصل ہوئیں وہ کسی بھی طور مکمل نہیں تھیں۔ میں نے اُس سے کہا۔ "ٹھیک ہے، میں دفتر سے اٹھنے کے بعد جمشید علی سے ملاقات کر لوں گا۔ وہ کون سے تھانے کی حوالات میں بند ہے؟"

"یہ تو مجھے معلوم نہیں ہے۔" اُس کی آنکھوں سے خوف جھلک رہا تھا۔

میں نے ٹیلی فون سنبھال لیا۔ دو چار متوقع تھانوں کے نمبر ڈائل کرنے کے بعد متعلقہ تھانے کا سراغ معلوم ہو گیا۔ میں نے نیلم سے کہا۔ "آپ جانا چاہیں تو چلی جائیں، رُکنا چاہیں تو رُک جائیں۔ مجھے حیرت ہے کہ پولیس والوں نے آپ کو روکنے کی کوشش کیوں نہیں کی؟ آپ تو موقع کی عینی شاہد تھیں۔"

اُس نے میرے سوال کا جواب دینے کی بجائے پوچھا۔ "کیا میں آپ کا فون استعمال کر سکتی ہوں؟"

"بڑی خوشی سے۔" میں نے اجازت دے دی۔

وہ نمبر ملانے کے بعد گفتگو کرنے لگی۔ مجھے اندازہ ہوا کہ شاید وہ اپنی والدہ سے بات کر رہی تھی۔ اُس نے مختصر الفاظ میں جمشید علی کو پیش آمدہ حالات کے بارے میں بتایا اور آخر

میں کہا کہ وہ ذرا دیر سے گھر پہنچے گی اس لئے فکر نہ کی جائے۔ ریسیور رکھنے کے بعد وہ میری جانب متوجہ ہوئی۔

''بیگ صاحب! میں باہر انتظار گاہ میں بیٹھ جاتی ہوں۔ آپ فارغ ہو جائیں تو میں بھی آپ کے ساتھ تھانے چلوں گی۔''

مجھے بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ میں نے اُس کی تجویز سے اتفاق کیا اور وہ میرے کمرے سے باہر نکل گئی۔ اُس کے جانے کے بعد میں نے دیوار گیر کلاک پر نظر ڈالی۔ اس وقت سات بج کر چالیس منٹ ہوئے تھے۔

میں نے جلدی جلدی اپنے کلائنٹس کو فارغ کیا اور نیلم کے ساتھ متعلقہ تھانے کی جانب روانہ ہو گیا۔ جب میں نے تھانے کی دیوار کے ساتھ اپنی گاڑی پارک کی تو اس وقت نو بجنے میں چند منٹ باقی تھے۔

جمشید علی اس وقت ہیڈ محرر کے کمرے میں موجود تھا۔ اُس کے ہاتھوں میں ہتھ کڑی لگی ہوئی تھی اور وہ ایک چوبی بینچ پر سر جھکائے بیٹھا تھا۔ میں اُس کی جانب بڑھنے لگا تو حوالدار نے مجھے روک دیا۔ میں نے محسوس کیا کہ مجھ پر نظر پڑتے ہی جمشید علی کی آنکھوں میں اُمید کی چمک نمودار ہو گئی تھی۔ اُس نے سر کے اشارے سے مجھے سلام بھی کیا تھا۔

حوالدار نے کہا۔ ''ایس ایچ او صاحب کا حکم ہے کہ ملزم کے ساتھ کسی کو ملنے نہ دیا جائے۔''

''میرا نام مرزا امجد بیگ ایڈووکیٹ ہے۔'' میں نے اپنا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔ ''میں ملزم جمشید علی کا وکیل ہوں۔''

حوالدار نے عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھا جیسے اُسے میری بات کا یقین نہ آیا ہو۔ وہ بے پروائی سے بولا۔ ''اگر آپ ملزم کے وکیل ہیں تو ایس ایچ او صاحب سے خود بات کر لیں۔''

میں اس ناخوشگوار رویّے کو برداشت کرتے ہوئے تھانہ انچارج کے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ اتفاق سے تھانہ انچارج میرا شناسا نکل آیا۔ وہ پہلے کسی اور تھانے میں متعین تھا۔ یہاں اُس کی تعیناتی کو ابھی دو ماہ ہی ہوئے تھے۔ اُس نے بڑی گرم جوشی سے مجھ سے مصافحہ کیا۔ میں نے وہاں اپنی آمد کے بارے میں اُسے آگاہ کیا تو وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

''بیگ صاحب! آپ تو موت کے فرشتے سے بھی زیادہ مستعد ہو گئے ہیں۔ ابھی تو ہم ملزم کو پکڑ کر لائے ہی ہیں کہ آپ نازل ہو گئے۔ پہلے ہمیں تو پوچھ تاچھ کر لینے دیں۔''

میں نے کہا۔ ''چوہدری صاحب! آپ کی پوچھ تاچھ کے بعد وہ بے چارہ اس قابل ہی کہاں رہے گا کہ مجھے کچھ بتا سکے۔ آپ کی ''میزبانی'' تو اب مشہورِ عالم ہے۔''

''بیگ صاحب! یہ تو پولیس والوں کے خلاف آپ لوگوں کا پروپیگنڈہ ہے۔'' ایس ایچ او اپنی موٹی توند پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ ''آپ کا اکھاڑا (عدالت کا کمرا) تو سب سے زیادہ خطرناک جگہ ہے۔ وہاں سے بندہ یا تو سیدھا پھانسی کے تختے پر پہنچتا ہے یا پھر جیل کی ہوا کھانے چلا جاتا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''اور کچھ لوگ باعزت بری بھی ہو جاتے ہیں۔''

تھوڑی دیر تک ہمارے درمیان اسی نوعیت کی نوک جھونک ہوتی رہی اور آخر کار اُس نے مجھے ملزم جمشید علی سے مختصر ملاقات کی اجازت دے دی۔

ہم ایس ایچ او کے کمرے سے نکل ہی رہے تھے کہ اسی وقت ایک اے ایس آئی اندر داخل ہوا۔ نیلم پر نظر پڑتے ہی وہ ٹھٹک گیا پھر ایس ایچ او کی جانب دیکھتے ہوئے بولا۔

''چوہدری صاحب! یہی وہ لڑکی ہے۔''

''سرفراز شاہ! تم کون سی لڑکی کی بات کر رہے ہو؟'' ایس ایچ او نے استفسار کیا۔ ''یہ تو بیگ صاحب کے ساتھ آئی ہے۔''

''او سر جی، یہی لڑکی تو فساد کی جڑ ہے۔'' اے ایس آئی سرفراز شاہ پُروثوق لہجے میں بولا۔ ''اسی کی خاطر تو ملزم جمشید علی نے اپنی بیوی پر قاتلانہ حملہ کیا ہے۔ یہ ملزم کے ساتھ ہی ہسپتال چلی گئی تھی۔ وہاں میں نے اسے تلاش کیا لیکن یہ دکھائی نہیں دی۔ ابھی تو اس کا بیان شیان بھی لینا ہے۔''

میں نے محسوس کیا، نیلم اے ایس آئی کی باتیں سن کر سراسیمہ نظر آنے لگی تھی۔ بعد ازاں مجھے معلوم ہوا کہ اے ایس آئی سرفراز شاہ اس کیس کا انکوائری افسر تھا۔

میں نے نیلم کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ''تم اطمینان سے یہیں بیٹھو۔ تمہیں پریشان ہونے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ انکوائری افسر صاحب جو بھی سوال کریں ان کے صد فیصد سچے اور کھرے جواب دینا۔'' پھر میں نے سرفراز شاہ کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ''انکوائری افسر صاحب! آپ بخوشی موقع کے گواہ کا بیان نوٹ کریں۔ میں اس دوران اپنے مؤکل سے ملاقات کر لیتا ہوں۔''

نیلم نے ہراساں نظروں سے میری جانب دیکھا، میں نے پچکارنے والے انداز میں کہا۔ ''شاباش، گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔ سچ بولنے والے ڈرا نہیں کرتے۔''

میں ایس ایچ او کے کمرے سے نکلنے لگا تو اُس نے ایک سادہ لباس اہل کار کو آواز دے کر اپنے پاس بلایا، پھر تحکمانہ لہجے میں کہا۔ ''وکیل صاحب کی ملزم جمشید علی سے ملاقات کروا دو۔'' ایک لمحے کے توقف سے اُس نے اضافہ کیا۔ ''خیال رہے، وکیل صاحب علیحدگی میں اپنے مؤکل سے ملنا چاہتے ہیں۔''

عام طور پر تھانہ انچارج حوالاتیوں سے ملنے کی اجازت نہیں دیتے اور خاص طور پر وہ ملزم جو فوجداری کیس میں ملوث ہوں، ان کی تو کسی کو ہوا بھی نہیں لگنے دیتے۔ میری خوش قسمتی تھی کہ مجھے اپنی شناسائی کی بدولت یہ سہولت حاصل ہوگئی تھی۔ خاص طور پر اس لئے بھی کہ ملزم ابھی ریمانڈ پر نہیں تھا۔

سادہ لباس اہلکار کی راہ نمائی میں، میں ایک ایسے کمرے میں پہنچا جو اپنی ہیئت سے ریکارڈ رُوم دکھائی دیتا تھا۔ کمرے کے ایک گوشے میں قد آدم چوبی الماریاں ایستادہ تھیں۔ یہ الماریاں اس انداز میں کھڑی کی گئی تھیں کہ ایک چھوٹا سا پارٹیشن بن گیا تھا۔ وہاں ایک پرانی میز اور چند کرسیاں بھی رکھی ہوئی تھیں۔ پولیس اہلکار مجھے انتظار کرنے کا کہہ کر غائب ہو گیا۔

چند منٹ بعد وہ جمشید علی کے ساتھ دوبارہ نمودار ہوا اور مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''انچارج صاحب کا حکم ہے کہ آپ کو جو کچھ بھی پوچھنا ہے، جلدی پوچھ لیں۔ میں ادھر کمرے کے دروازے پر کھڑا ہوں۔''

پھر اس سے پہلے کہ میں کچھ بولتا، وہ تیز قدموں سے چلتے ہوئے وہاں سے ہٹ گیا۔ میں جمشید علی کی جانب متوجہ ہوگیا۔

اُس نے چھوٹتے ہی پوچھا۔ ''بیگ صاحب! آپ کے ساتھ نیلم بھی تھی۔ وہ نظر نہیں آ رہی؟''

''وہ اُدھر ایس ایچ او کے کمرے میں اپنا بیان ریکارڈ کروا رہی ہے۔'' میں نے بتایا۔

''ویسے یہ ہستی ہے کون اور آپ کی خاطر اتنی فکرمند کیوں ہے؟''

میں نے یہ سوال اس لئے کیا تھا کہ نیلم کو دیکھ کر جمشید علی کے چہرے پر حیات بخش رونق آ گئی تھی۔ اُس نے ایک ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے جواب دیا۔

''بیگ صاحب! میں نے آپ سے وعدہ کیا تھا کہ اپنی ہونے والی بیوی سے آپ کو ضرور ملواؤں گا۔ دیکھ لیں، قسمت نے کیسے برے حالات میں اس ملاقات کا انتظام کیا ہے۔''

''اوہ!'' میرے سینے سے ایک گہری سانس خارج ہوئی۔ ''تو آپ اپنی سیکرٹری نیلم سے

شادی کرنا چاہتے تھے؟''

اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔ میں نے اس کے انتخاب کی داد دی اور اصل موضوع کی طرف آ گیا۔ ''جمشید صاحب، یہ سب کچھ کس طرح ہو گیا؟''

اُس نے میرے سوال کے جواب میں جو تفصیل بیان کی اُس میں سے غیر ضروری باتوں کو حذف کر کے میں اس کا خلاصہ آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ واضح رہے کہ ان میں بہت سی باتیں مجھے بعد میں معلوم ہوئی تھیں۔

جمشید علی آج خلاف معمول دفتر سے جلدی اُٹھ گیا تھا۔ اُس نے اپنی والدہ کو سارے حالات سے آگاہ کر دیا تھا۔ خاص طور پر صادقہ کے طلاق والے معاملات جمشید علی کی والدہ جمیلہ خاتون کے علم میں تھے۔ جمشید علی نے دو روز قبل جمیلہ خاتون کو یہ بھی بتا دیا تھا کہ وہ اپنی سیکرٹری نیلم سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ جمیلہ خاتون نے اصرار کیا کہ وہ کسی روز نیلم کو اس سے ملوانے کے لئے گھر لے آئے۔ چنانچہ آج جمشید علی نیلم کو اپنے ساتھ ہی لے آیا تھا۔ نیلم کے لئے اپنے باس کے بنگلے پر آنے کا یہ پہلا موقع تھا۔ قصہ مختصر، جمیلہ خاتون نیلم سے مل کر بہت خوش ہوئی اور اُس نے اپنے اطمینان کا اظہار کر دیا۔ جب وہ تینوں بیٹھے آپس میں باتیں کر رہے تھے تو گھریلو ملازمہ نگہت پروین نے اُن کے مابین ہونے والی گفتگو کا موضوع بھانپ لیا۔ وہ اس وقت وہاں چائے اور دیگر لوازمات سرو کرنے آئی تھی۔ درحقیقت نگہت اپنی مالکن صادقہ بیگم کی انتہائی وفادار تھی۔ اُس نے پہلی فرصت میں جا کر صادقہ کے کان میں پھونک دیا کہ بنگلے کے ایک کمرے میں کیا پلان زیر بحث ہے۔ صادقہ بیگم تو پہلے ہی اپنے شوہر جمشید علی پر اُدھار کھائے بیٹھی تھی۔ ملازمہ کی اطلاع پر اُس کے پاؤں سے لگی اور سر سے باہر ہوگئی۔ وہ شدید غیظ و غضب کے عالم میں اُن کے سر پر پہنچ گئی۔

ایک طویل عرصے سے جمشید علی اور صادقہ بیگم علیحدہ علیحدہ بیڈ رُوم کی زندگی گزار رہے تھے۔ جمشید علی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ صادقہ وہاں آ سکتی تھی۔ صادقہ کی آمد پر وہ چونک اُٹھا۔

اُس نے سخت لہجے میں اپنی بیوی سے استفسار کیا۔ ''صادقہ! تم یہاں کیوں آئی ہو؟''

''واہ واہ، سبحان اللہ۔'' صادقہ نے منہ بگاڑ کر کہا۔ ''میری بلی اور مجھے ہی میاؤں۔ جمشید میاں، یہ میرا بنگلہ ہے۔ تم اس بنگلے میں میری آمد و رفت پر پابندی لگانے والے کون ہوتے ہو؟''

جمشید نے غصے سے کہا۔ ''میرے پاس تمہارے فضول سوال کا جواب دینے کے لئے

وقت نہیں ہے۔تم جاؤ یہاں سے۔"

وہ ترکی بہ ترکی بولی۔"تمہارے پاس مجھ سے بات کرنے کا وقت نہیں ہے اور اپنی داشتہ کے ساتھ گل چھرے اُڑانے کی تمہیں بہت فرصت ہے۔" اپنی بات ختم کر کے وہ معاندانہ نظروں سے نیلم کو گھورنے لگی۔

جمشید علی نے ناگواری سے کہا۔"تم یہاں سے جاتی ہو یا میں دھکے دے کر تمہیں دفع کروں؟"

"تم کیا دھکے دو گے مجھے۔" وہ طیش کے عالم میں بولی۔"دھکے تو میں تمہیں دوں گی..... تمہاری ماں اور داشتہ کو بھی ذلیل کر کے نکالوں گی۔"

نیلم کا چہرہ سرخ ہو گیا۔اُسے دو بار داشتہ کہہ کر مخاطب کیا گیا تھا۔اُسے شدید بے عزتی کا احساس ہوا۔وہ غصہ آمیز لہجے میں بولی۔"بیگم صاحبہ! آپ کو انسانوں سے بات کرنے کا سلیقہ نہیں ہے؟"

"اے ذلیل لڑکی، اپنی ناپاک زبان بند رکھ۔" صادقہ تڑخ کر بولی۔"مجھے انسانیت سکھانے آئی ہے۔اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھ حرافہ۔تجھے ایک شادی شدہ مرد پر ڈورے ڈالتے ہوئے ذرا شرم نہیں آئی؟"

نیلم نے شدید غصے کو برداشت کرتے ہوئے معتدل لہجے میں کہا۔"میں نے ایسا کوئی کام نہیں کیا جس پر مجھے شرمندہ ہونا پڑے۔"

"ہائے ہائے، چوری اور سینہ زوری۔" صادقہ نے کھا جانے والی نظروں سے نیلم کو گھورا۔"کیا یہ جھوٹ ہے کہ تم جمشید علی سے شادی کرنے والی ہو؟"

"یہ سچ ہے۔" نیلم نے ٹھوس لہجے میں کہا۔"اور اس میں ندامت کا کوئی پہلو نہیں نکلتا۔"

صادقہ، نیلم کے جواب پر آتش زیر پا ہو گئی۔تیز لہجے میں بولی۔"تم بے غیرت ہی نہیں، فاحشہ بھی ہو۔کتنی ڈھٹائی سے اپنے کرتوتوں کا اعتراف کر رہی ہو اور شرمندہ ہونے کے بجائے فخر محسوس کر رہی ہو۔"

نیلم نے دھیمے لہجے میں کہا۔"جمشید صاحب واقعی ایک طویل عرصے سے جہنم میں زندگی بسر کر رہے تھے۔"

صادقہ کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا، تھرتھراتے ہوئے لہجے میں بولی۔"بے شرم لڑکی! تو کیا سمجھتی ہے جمشید صرف تیرا ہو کر رہے گا؟ یہ تو ہرجائی ہے۔پتہ نہیں کتنی لڑکیوں اور عورتوں کے ساتھ منہ کالا کرتا پھرتا ہے۔انہی میں سے ایک تو بھی ہے۔"

"بیگم صاحبہ زبان سنبھال کر بات کریں۔" نیلم کو بھی غصہ آ گیا۔"میرا منہ کھل گیا تو آپ کے لئے اچھا نہیں ہو گا۔"

"تم مجھے دھمکی دے رہی ہو؟"

"میں آپ کو نصیحت کر رہی ہوں۔"

"تم کتنے بے غیرت ہو جمشید۔" وہ جمشید علی کی طرف مڑتے ہوئے بولی۔"ایک دو ٹکے کی داشتہ سے مجھے ذلیل کروا رہے ہو۔"

جمشید نے کہا۔"تمہارا میرا اب کیا رشتہ رہ گیا ہے۔میں تمہیں طلاق دے چکا ہوں۔بہتر یہی ہے کہ ہمارے راستے میں نہ آؤ۔"

"تم مجھے طلاق نہیں دے سکتے جمشید۔" وہ ہذیانی انداز میں چیخی۔"میں نے طلاق نامہ وصول نہیں کیا تھا۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔" جمشید نے کہا۔"ثالثی کونسل اس طلاق کی گواہ ہے۔ہمارے نام سمن آ چکے ہیں۔تیر کمان سے نکل چکا ہے صادقہ۔گزرا ہوا وقت واپس نہیں آ سکتا۔ہمارے راستے جدا ہو چکے ہیں۔میں نے اپنی رہائش کے لئے ڈیفنس میں ایک بنگلہ خرید لیا ہے۔ہم کل وہاں شفٹ ہو جائیں گے۔تم خوامخواہ لکیر پیٹنے کی کوشش نہ کرو۔"

"تم کل شفٹ ہونا چاہتے ہو نا؟" وہ مجنونانہ انداز میں بولی۔"کل تو بہت دور ہے جمشید! میں تمہیں آج ہی "شفٹ" کرتی ہوں۔"

یہ کہتے ہوئے اُس نے اپنے لباس میں ہاتھ ڈال کر ایک ریوالور برآمد کر لیا اور ریوالور والے ہاتھ کو دائیں بائیں لہراتے ہوئے بولی۔"سب سے پہلے میں اس بدکردار عورت کو جہنم واصل کروں گی جس نے مجھ سے میرا شوہر چھین لیا ہے۔"

جمیلہ خاتون، نیلم اور جمشید پر سناٹا طاری ہو گیا۔وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ صادقہ اس حد تک چلی جائے گی۔آخر کار جمشید نے صادقہ کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔"یہ کیا حماقت کر رہی ہو صادقہ؟"

وہ غرائی۔"یہ حماقت نہیں، عقلمندی ہے۔"

"تم ہمیں قتل کر کے بچ نہیں سکو گی۔" جمشید نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔"یہ ریوالور پھینک دو اور سکون سے میری بات سنو۔"

"باتیں سننے سنانے کا وقت گزر چکا ہے جمشید۔" صادقہ نے نیلم کو کڑے تیوروں سے گھورتے ہوئے جنون آمیز لہجے میں کہا۔"اس چھنال کی خاطر تم مجھے طلاق دینا چاہتے تھے

نا۔ لو، سب سے پہلے میں اسی کی لاش کو گراتی ہوں۔ مرنے کے لئے تیار ہو جاؤ کمینی عورت!''

صادقہ کی بات پوری ہوئی ہی تھی کہ جمشید نے جھپٹا مار کر اُس کے ریوالور والے ہاتھ کو دبوچ لیا۔ صادقہ کا ہاتھ نیچے کی جانب جھک گیا۔ وہ اپنا ہاتھ چھڑانے کے لئے زور آزمائی کرنے لگی۔ اسی چھینا جھپٹی میں ریوالور کا ٹرائیگر دب گیا۔ بدقسمتی سے ریوالور کی نال اس وقت صادقہ کے پیٹ کی جانب تھی۔ ''ٹھائیں'' سے گولی چلی اور صدقہ کے پیٹ میں پیوست ہو گئی۔

صادقہ تیورا کر گری اور زمین بوس ہو گئی۔ جمشید علی نے اُس کے ہاتھ میں پھنسے ہوئے ریوالور کو کھینچ نکالا اور ایک طرف پھینک دیا۔ اس کے بعد وہ پہلی فرصت میں اُسے اپنی گاڑی میں ڈال کر ایک پرائیویٹ ہسپتال میں لے گیا۔ کچھ ہی دیر بعد پولیس نے اُسے ہسپتال سے گرفتار کر لیا۔ جمشید نے ایک عقل مندی یہ کی تھی کہ آنکھ بچا کر نیلم کو میری جانب روانہ کر دیا تھا۔ نیلم حیرت انگیز مضبوط اعصاب کی مالک عورت ثابت ہو رہی تھی۔ اُس کی جگہ کوئی دوسری عورت ہوتی تو یا تو بے ہوش ہو چکی ہوتی یا بستر پر پڑی خوف سے کانپ رہی ہوتی۔ جو کچھ پیش آ چکا تھا وہ کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ جمشید نے نیلم کو اپنی زندگی کا ساتھی بنانے کا فیصلہ کر کے بڑی عقل مندی کا ثبوت دیا تھا۔ میں ایک بار پھر دل ہی دل میں اُس کے انتخاب پر داد دیئے بنا نہ رہ سکا۔ لیکن اس وقت سب سے اہم مسئلہ جمشید علی کی زندگی کا تھا جو داؤ پر لگ چکی تھی۔ دوسری جانب ہسپتال کے آئی سی یو میں صادقہ زندگی اور موت کے درمیان سوالیہ نشان بنی ہوئی تھی۔ اگر خدانخواستہ وہ زندگی کی بازی ہار جاتی تو جمشید کی مشکلات میں بے پناہ اضافہ ہو جاتا۔

وقوعہ کی تفصیلات سے آگاہ ہونے کے بعد میں نے جمشید علی سے پوچھا۔ ''کیا پولیس نے صادقہ کا بیان لے لیا تھا؟''

''میرے سامنے تو نہیں لیا تھا۔'' اُس نے جواب دیا۔ ''ویسے وہ بیان دینے کی حالت میں تھی بھی نہیں۔''

میں نے تسلی بخش لہجے میں کہا۔ ''آپ کسی قسم کی فکر نہ کریں جمشید صاحب۔ جو واقعات آپ نے مجھے بتائے ہیں وہی بیان دیتے ہوئے پولیس کو بھی بتائیں۔ ایک حرف کا بھی ردوبدل نہ کریں۔ انشاء اللہ کل صبح میں ضمانت کی درخواست کے ساتھ عدالت پہنچ جاؤں گا۔''

''بیگ صاحب! آپ میری ضمانت کروالیں گے نا؟''

''میں نے کہا نا، آپ اس سلسلے میں بالکل پریشان نہ ہوں۔ اس واقعے میں آپ کی پوزیشن اتنی نازک بھی نہیں ہے۔''

جمشید نے تشویش ناک لہجے میں کہا۔ ''اگر صادقہ کو کچھ ہو گیا تو میری جان مصیبت میں آ جائے گی۔ مجھے تو لمبی سزا ہو جائے گی۔''

''آپ فی الحال صادقہ کو اپنے ذہن سے جھٹک دیں۔'' میں نے مشورے کے انداز میں کہا۔ ''خدا جو کرے گا، بہتر ہی کرے گا۔''

اُس نے کمزور سے لہجے میں پوچھا۔ ''بیگ صاحب! آپ کا اندازہ کیا ہے، مجھے کتنے عرصے کی سزا ہو سکتی ہے؟''

میں نے کہا۔ ''جمشید صاحب! میں سردست تو کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا۔ ابھی تو پولیس نے آپ کا بیان بھی نہیں لیا اور نہ ہی میں نے ایف آئی آر کا مطالعہ کیا ہے۔ جب تک پولیس کی لگائی ہوئی دفعات کا پتہ نہیں چلے گا، حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔''

وہ مایوس نظروں سے میری جانب دیکھنے لگا۔ میں نے اُسے تاکیدی لہجے میں کہا۔ ''ممکن ہے، آج رات پولیس والے آپ سے کچھ اُگلوانے کے لئے تشدد وغیرہ کرنا چاہیں۔ آپ کو گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ جو بھی مطالبہ کریں، آپ اسے پورا کرنے کے لئے تیار ہو جائیں۔ وہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگر آپ ان کی مٹھی گرم کر دیں تو وہ ہلکی دفعہ لگائیں گے۔ آپ ہلکی اور بھاری دفعہ کی پرواہ نہ کریں اور ان کی ہر بات مانتے جائیں۔ اگر وہ آپ سے کچھ اقرار بھی کروانا چاہیں تو بے دریغ کر ڈالیں۔ پولیس کی کسٹڈی میں دیئے گئے بیان کی عدالت میں کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ انشاء اللہ کل صبح میں آپ کی ضمانت کروانے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔''

وہ بولا۔ ''بیگ صاحب! ایک طرف تو آپ یہ کہتے ہیں کہ میں پولیس کو بھی وہی بیان دوں جو آپ کو دیا ہے اور دوسری جانب آپ مجھے یہ ہدایت دے رہے ہیں کہ میں ان کی ہر بات بے چون و چرا مان لوں اور ان کی مرضی کا بیان دوں۔''

''آپ شاید میری بات کو سمجھ نہیں سکے ہیں۔'' میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''پہلے تو آپ وہی بیان دیں جو سچ ہے۔ اگر پولیس والوں کو آپ کا سچا بیان ہضم نہ ہو اور وہ سختی کرنا چاہیں تو پھر تشدد سے بچنے کے لئے اُن کی زبان بولنا شروع کر دیں۔ ویسے تو پولیس والوں کو ریمانڈ سے قبل کسی سختی کی اجازت نہیں ہوتی۔ لیکن یہ تھانہ ہے، یہاں سب کچھ ممکن ہے۔ میں نے احتیاط کے طور پر آپ کو بریفنگ کی ہے۔''

وہ مطمئن نظر آنے لگا۔ میں وہاں سے اُٹھ کر تھانہ انچارج کے کمرے میں آ گیا۔ ایس ایچ او موجود تھا۔ نیلم کا بیان ہو چکا تھا۔ انکوائری افسر سرفراز شاہ کے چہرے سے ظاہر ہوتا تھا کہ اُسے نیلم کا بیان کچھ زیادہ پسند نہیں آیا تھا۔ سچ بہت کم لوگوں کو پسند آتا ہے۔

میں نے ایس ایچ او سے پوچھا۔ ''چوہدری صاحب! آپ کو اس واقعے کی اطلاع کس نے دی تھی؟''

''واردات کہیں بیگ صاحب۔'' وہ بولا۔ ''یہ کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے۔''

میں نے کہا۔ ''چلیں واردات ہی کہہ لیں۔ اب میرے سوال کا جواب دیں۔''

اُس نے آواز دے کر ایک کانسٹیبل کو اپنے کمرے میں بلایا پھر اُسے روزنامچہ رجسٹر لانے کو کہا۔ تھوڑی ہی دیر بعد کانسٹیبل روزنامچہ لے آیا۔ ایس ایچ او روزنامچے پر نگاہیں دوڑاتے ہوئے بولا۔

''آج شام سوا چھ بجے ہمیں شمشاد خان نامی ایک شخص نے فون کر کے اطلاع دی کہ پی ای سی ایچ ایس کے بنگلہ نمبر...... میں ایک واردات ہو گئی ہے۔ میں نے ایک حوالدار کو دو سپاہیوں کے ساتھ صورتِ حال معلوم کرنے مذکورہ بنگلے پر بھیجا۔ قریب قریب ساڑھے چھ بجے مجھے اطلاع ملی کہ یہ ایک قاتلانہ حملے کی واردات تھی۔ مضروبہ کو ہسپتال پہنچا دیا گیا تھا۔ حملہ آور کوئی اور نہیں بلکہ مضروبہ کا اپنا شوہر ہی تھا اور وہی اسے ہسپتال لے کر گیا تھا۔ میں نے اے ایس آئی سرفراز شاہ کو ساتھ لیا اور فی الفور متعلقہ ہسپتال پہنچ گیا۔ پھر ہم نے ملزم جمشید علی کو گرفتار کر لیا۔''

میں نے پوچھا۔ ''آپ نے مضروبہ صادقہ بیگم کا بیان بھی لیا ہو گا۔''

''نہ جی۔'' وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''اُس کی حالت تشویش ناک ہے۔ وہ مسلسل بے ہوشی میں ہے۔ خدا جانے بچتی بھی ہے یا نہیں۔''

''چوہدری صاحب، آپ نے وہ ریوالور تو اپنے قبضے میں کر لیا ہو گا جو صادقہ بیگم کو مضروبہ بنانے کا وسیلہ بنا ہے۔''

''او بس کریں بیگ صاحب۔'' وہ رُکھائی سے بولا۔ ''کچھ کام ہمارے لئے بھی چھوڑ دیں۔''

میں نے پوچھا۔ ''آپ ملزم پر کون سی دفعہ لگانے کا ارادہ رکھتے ہیں؟''

''بس اب میں آپ کی کسی بات کا جواب نہیں دوں گا۔''

میں سمجھ گیا کہ اب مجھے وہاں وقت ضائع نہیں کرنا چاہئے۔ میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے چوہدری صاحب! کل صبح عدالت میں ملاقات ہو گی۔'' پھر میں نیلم کے ساتھ تھانے سے باہر نکل آیا۔

جب ہم گاڑی کے پاس پہنچے تو نیلم نے کہا۔ ''بیگ صاحب! آپ سے ایک چھوٹی سی درخواست ہے۔''

میں نے سوالیہ نظروں سے اُس کی طرف دیکھا، وہ بولی۔ ''اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو مجھے میرے گھر تک ڈراپ کر دیں۔ ایک تو دیر بہت ہو چکی ہے، دوسرے میں خود میں اکیلے جانے کی ہمت بھی محسوس نہیں کر رہی ہوں۔''

میں نے رسٹ واچ پر نگاہ دوڑائی۔ رات کے سوا دس بج چکے تھے۔ واقعی اب تو خاصی دیر ہو چکی تھی۔ میں نے نیلم سے پوچھا۔ ''آپ کو جانا کہاں ہے؟''

اُس نے جواب دیا۔ ''ناظم آباد۔''

''ٹھیک ہے، میں آپ کو آپ کے گھر تک چھوڑ دیتا ہوں۔'' میں نے کہا اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر گاڑی اسٹارٹ کر دی اور تھانے کی حدود سے باہر نکال لی۔

تھوڑی دیر تک ہمارے درمیان خاموشی رہی پھر میں نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔

''آپ بڑی ہمت والی خاتون ہیں۔''

''مصائب سے ٹکراتے ٹکراتے ہمت خود بخود پیدا ہو جاتی ہے بیگ صاحب۔'' اُس نے جواب دیا اور سامنے سڑک پر دیکھنے لگی۔

میں نے پوچھا۔ ''آپ نے میرے دفتر سے شاید اپنی والدہ کو فون کیا تھا؟''

''آپ کا اندازہ درست ہے۔''

اُس نے بات کو آگے بڑھایا۔ ''آپ نے جس انداز میں اپنی والدہ سے جمشید صاحب کو پیش آنے والے واقعہ کا تذکرہ کیا تھا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کی والدہ جمشید صاحب کو اچھی طرح جانتی ہیں۔''

''جمشید صاحب اکثر ہمارے گھر آتے رہتے تھے۔''

میں دراصل اُسے باتوں میں لگا کر اُس کے اعصابی دباؤ کو قدرے کم کرنا چاہتا تھا۔ میں نے کہا۔ ''جمشید صاحب نے مجھے آپ کے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہے۔''

اُس نے چونک کر مجھے دیکھا۔ میں نے کہا۔ ''جمشید صاحب، آپ سے شادی کرنے والے تھے۔''

اُس نے سر کی اثباتی جنبش سے میرے سوال کا جواب دیا پھر پوچھا۔ ''اس کیس میں

جمشید صاحب کی پوزیشن کیا ہے؟''

میں نے ایک آئس کریم پارلر کے سامنے گاڑی روکتے ہوئے کہا۔ ''کل صبح انشاء اللہ میں جمشید صاحب کی ضمانت کروانے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔''

اُس نے اطمینان کی سانس لی پھر پوچھا۔ ''آپ نے یہاں گاڑی کیوں روک دی ہے؟''

''موسم اور حالات کا تقاضہ ہے کہ ایک ایک ٹھنڈی آئس کریم کھائی جائے۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو؟''

اُس نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ آئس کریم کھانے کے بعد میں نے نیلم کو ناظم آباد میں اُس کے فلیٹ پر چھوڑا، پھر اپنے گھر کی جانب روانہ ہو گیا۔

نیلم کی معیت میں اس مختصر سے سفر میں، میں نے اس کے بارے میں خاصی معلومات حاصل کر لی تھیں۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ مجھے اپنا سچا ہمدرد سمجھتی تھی۔ میں اُس کے ہونے والے شوہر کا وکیل تھا۔ اُس کا مجھ پر اعتماد کرنا عین فطری بات تھی۔

نیلم، ناظم آباد میں اپنی بوڑھی والدہ اور چھوٹی بہن نائلہ کے ساتھ رہتی تھی۔ یہ فلیٹ جمشید علی ہی نے نیلم کو خرید کر دیا تھا۔ ازیں قبل وہ لوگ لیاقت آباد المعروف بہ لالو کھیت میں رہتے تھے۔ اور وہ بھی ایک کرایہ دار کی حیثیت سے۔ نیلم نے گریجویشن کرنے کے بعد ملازمت کی تھی۔ وہ ٹیلی فون آپریٹر کی حیثیت سے جمشید کی ٹیکسٹائل مل میں آئی تھی۔ وہ ابتدائی چند دنوں ہی میں جمشید کی نظر میں آ گئی تھی۔ جمشید موقع بہ موقع مختلف مراحل پر اُسے ہر ہر انداز سے آزماتا رہا۔ نیلم ہر آزمائش پر پوری اترتی رہی۔ آخر کار جمشید نے اُسے اپنی پرسنل سیکرٹری بنا لیا۔ جب جمشید علی کو یقین ہو گیا کہ نیلم ہر لحاظ سے اُس کی بیوی بننے کے لئے موزوں لڑکی ہے تو اُس نے نیلم پر اپنی پسندیدگی کا اظہار کر دیا۔ اس سلسلے میں وہ نیلم کی والدہ سے بھی ملا۔ نیلم کی والدہ حدیث النساء کو اس رشتے پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ ویسے بھی اس دوران میں جمشید علی نے اس مختصر سے خاندان پر احسانات کی بارش کر دی۔ وہ لوگ لالو کھیت کے جھونپڑے سے اٹھ کر ایک عالی شان فلیٹ میں آ گئے تھے۔ نیلم کی چھوٹی بہن نائلہ کا تعلیمی سلسلہ جو ایک موقع پر گھریلو حالات کے پیش نظر موقوف ہو گیا تھا، اب دوبارہ رواں دواں ہو گیا تھا۔ جمشید علی نے شروع ہی میں حدیث النساء پر یہ بات واضح کر دی تھی کہ وہ اپنی پہلی بیوی کو طلاق نہیں دے گا البتہ وہ نیلم کو بالکل الگ تھلگ رکھنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ حدیث النساء کو جمشید علی کی یہ شرط بھی منظور تھی۔ اُس کی بیٹی ٹھکانے لگ رہی تھی اور بڑے مضبوط ٹھکانے

لگ رہی تھی۔ ازاں بعد پیدا ہونے والے حالات بھی حدیث النساء کے علم میں تھے۔ جمشید علی نے طلاق والے سلسلے میں ہونے والی ساری کارروائی کو حدیث النساء سے چھپایا نہیں تھا۔ گویا دونوں جانب اعتماد کی باہمی فضا عروج پر تھی اور یہ فریقین کے لئے بہت اچھی بات تھی۔

میں جب گھر پہنچا تو رات کے ساڑھے گیارہ بج رہے تھے۔ دوسرے روز مجھے جلدی عدالت پہنچنا تھا اور عدالت میں بھی جانے سے پہلے مجھے اپنے دفتر جا کر جمشید علی کی درخواست ضمانت تیار کروانا تھی اس لئے کھانے سے فارغ ہونے کے بعد میں اسٹڈی میں جانے کے بجائے فوری طور پر سونے کی تیاری میں مصروف ہو گیا۔

✿......✿
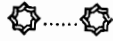
اگلے روز پولیس نے جمشید علی کو عدالت میں پیش کیا اور سات روز کا ریمانڈ طلب کر لیا۔ میں نے عدالت میں آتے ہی درخواست ضمانت اور اپنا وکالت نامہ داخل کر دیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے پولیس ایف آئی آر کی نقل بھی حاصل کر لی تھی۔

پولیس نے ایف آئی آر میں ملزم جمشید علی پر دفعات تین سو سات، تین سو پچیس اور تین سو چھبیس عائد کی تھیں۔ تعزیراتِ پاکستان کی دفعہ تین سو سات یعنی اقدام قتل عمد کی سزا کم از کم دس سال اور زیادہ سے زیادہ قید تا حیات تھی۔ دفعہ تین سو پچیس یعنی بالارادہ ضررِ شدید پہنچانے کی سزا سات سال قید مع جرمانہ تھی اور دفعہ تین سو چھبیس یعنی بہ ذریعہ خطرناک وسیلہ ضررِ شدید پہنچانے کی سزا دس سال قید مع جرمانہ یا زیادہ سے زیادہ قید تا حیات تھی۔ یہ تینوں دفعات ناقابل ضمانت تھیں۔

وکیل سرکار نے ریمانڈ کے حق میں دلائل دیتے ہوئے کہا۔ ''جناب عالی! ملزم جمشید علی اپنی بیوی مضروبہ صادقہ بیگم پر بالارادہ قاتلانہ حملے کا مرتکب ہوا ہے۔ اس سلسلے میں پولیس کو شواہد جمع کرنے کے لئے کچھ وقت درکار ہو گا۔ لہٰذا میری معزز عدالت سے استدعا ہے کہ ملزم کا سات روزہ پولیس ریمانڈ دے دیا جائے۔''

میں اپنی جگہ سے اُٹھ کر کھڑا ہوا اور ضمانت کے حق میں بولنا شروع کیا۔ ''یور آنر! ملزم جمشید علی ایک معروف صنعت کار اور صاحب حیثیت شخص ہے لہٰذا اس کے روپوش یا فرار ہونے کا کوئی خدشہ نہیں ہے۔ پولیس ایف آئی آر کے مطابق اس پر جو دفعات لگائی گئی ہیں ان میں ذرہ برابر صداقت نہیں ہے بلکہ اصل واقعہ کچھ اور ہی ہے۔ پولیس نے اپنا کام آسان بنانے کے لئے بالارادہ قاتلانہ حملے کا جواز گھڑ لیا ہے۔ جب اس کیس کی باقاعدہ سماعت ہو

گی تو میں اہم انکشافات کروں گا۔ فی الحال میں معزز عدالت سے استدعا کرتا ہوں کہ میرے موکل کو شخصی ضمانت یا ذاتی مچلکے پر رہا کرنے کا حکم جاری کیا جائے۔''

نیلم کے توسط سے میں نے جمشید علی کے ایک قریبی صنعت کار دوست سے رابطہ کیا تھا اور وہ اس وقت شخصی ضمانت کے لئے عدالت میں موجود تھا۔ ازیں علاوہ تھوڑی دیر پہلے جمشید علی کا منیجر مقبول چغتائی بھی عدالت میں پہنچ چکا تھا۔ میں نے اُسے ہدایت کی تھی کہ وہ اپنے ساتھ ایک معقول رقم بھی لیتا آئے۔

وکیل سرکار نے کہا۔''جناب عالی! مضروبہ صادقہ کی حالت تشویش ناک ہے۔ وہ ابھی تک مسلسل بے ہوشی کی کیفیت میں ہے۔ طویل بے ہوشی اس کی زندگی کے لئے سنگین خطرہ بھی ثابت ہوسکتی ہے۔ اس لئے موجودہ صورتِ حال میں ملزم کی درخواست ضمانت منظور کرنا انصاف کے تقاضوں کے منافی ہوگا۔''

میں نے کہا۔''جناب عالی! مضروبہ صادقہ بیگم ایک اتفاقی حادثے کا شکار ہوئی ہے۔ اُسے بالارادہ قاتلانہ حملہ کہنا کسی بھی طرح مناسب نہیں ہے۔'' ایک لمحے کے توقف سے میں نے اضافہ کیا۔''یور آنر، مضروبہ، ملزم کی بیوی ہے وہ ایک طویل عرصے سے ایک ہی گھر میں رہ رہے ہیں۔ اگر میرا موکل واقعی اُسے قتل کرنے کا ارادہ رکھتا تھا تو اس کے لئے اُسے بے شمار مواقع میسر تھے۔ وہ گھر میں بڑی آسانی سے اپنے ارادے کو عملی جامہ پہنا سکتا تھا۔ نال کے طور پر وہ اپنی بیوی کو خواب گاہ میں ہلاک کرسکتا تھا۔ اس عمل کے لئے اُسے دو تین اد کے سامنے یہ سب کچھ کرنے کی کیا ضرورت تھی۔''

''دو تین افراد سے آپ کی کیا مراد ہے بیگ صاحب؟'' جج نے چشمے کے اوپر سے مجھے ھا۔

میں نے کہا۔''جناب عالی! جب یہ حادثہ پیش آیا اس وقت میرے موکل اور مضروبہ کے وہ ملزم کی والدہ اور سیکرٹری بھی جائے حادثہ پر موجود تھیں۔ بالارادہ قاتلانہ حملہ یوں تو بس کیا جا سکتا اور خاص طور پر ایسا شخص جو ایسے کام کے لئے کئی مواقع رکھتا ہو، اس انداز ی کام کر کے مصیبت کو آواز نہیں دے سکتا۔''

''آپ اس سلسلے میں کیا کہتے ہیں؟'' جج نے وکیل سرکار کی جانب دیکھا۔

وہ بولا۔''جناب عالی! مضروبہ صادقہ کا بیان ابھی تک نہیں ہو سکا۔ ہم اس کے ہوش میں نے کا انتظار کر رہے ہیں۔ اس کی حالت خطرے سے باہر نہیں ہے۔ جب تک اس کا بیان ہیں ہو جاتا، ملزم کو آزاد چھوڑنا مناسب نہیں ہوگا۔ یہ بہت خطرناک شخص ہے، ایک مرتبہ

اپنی بیوی کو ضرر پہنچا چکا ہے۔ آئندہ بھی ایسی کوشش کر سکتا ہے۔''

میں نے ضمانت کے حق میں دلائل دیتے ہوئے کہا۔''جناب عالی! وکیل سرکار میرے موکل کو ایک خطرناک شخص قرار دے رہے ہیں جبکہ حالات وشواہد سے یہ بات ثابت ہے کہ اسی خطرناک شخص نے اپنی بیوی کو فوری طور پر ہسپتال پہنچایا تھا۔ وکیل سرکار نے خدشہ ظاہر کیا ہے کہ اگر میرے موکل کی درخواست ضمانت منظور کر لی گئی تو وہ آئندہ بھی اپنی بیوی کو ضرر پہنچا سکتا ہے۔ وکیل سرکار کا یہ خدشہ بھی بے بنیاد ہے۔ میرا موکل اگر اپنی بیوی کی جان کا دشمن ہوتا یا اسے کسی قسم کا ضرر پہنچانے کا ارادہ رکھتا تو اس کی جان بچانے کے لئے فی الفور اسے ہسپتال نہیں لے کر جاتا۔ میرے موکل کے اس عمل سے تو ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مبنی بر خلوص نیت کا مالک ایک گداز دل کا انسان ہے، اس کے علاوہ بھی بہت سی ایسی باتیں ہیں جو میرے موکل کے حق میں جاتی ہیں۔ ان کا ذکر میں مناسب موقع پر عدالتی کارروائی کے دوران میں کروں گا۔''

وکیل سرکار نے احتجاجی لہجے میں کہا۔''جناب عالی! ملزم ایک بااثر شخص ہے۔ اگر اس کی ضمانت ہوگئی تو وہ گواہوں پر اثر انداز ہوسکتا ہے۔''

''جناب عالی!'' میں نے کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔''میرا موکل ایک امن پسند اور شریف شہری ہے۔ وہ نہ تو کسی طور گواہوں پر اثر انداز ہوسکتا ہے اور نہ ہی تفتیش میں کسی قسم کی رُکاوٹ ڈال سکتا ہے۔ پولیس نے ایف آئی آر درج کرتے وقت جن دفعات کا استعمال کیا ہے وہ اصل حالات کے مطابق نہیں ہیں۔ میں عدالتی کارروائی کے دوران میں انہیں غلط ثابت کروں گا۔''

جج نے وکیل سرکار کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔''وکیل صاحب، آپ کے پاس ضمانت رُکوانے کے لئے کوئی ٹھوس دلائل ہیں؟''

وہ اِدھر اُدھر دیکھنے کے بعد بولا۔''جناب عالی! مضروبہ زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہے۔ ان حالات میں حملہ آور کو آزاد چھوڑنا کسی بھی طور مناسب نہیں ہوگا۔''

میں نے کہا۔''جناب عالی! انسانیت تقاضہ کرتی ہے کہ ان مصیبت کے لمحات میں ایک شوہر کو اپنی شدید زخمی بیوی کے پاس ہونا چاہئے۔''

وکیل سرکار نے چوٹ کی۔''جناب عالی! قانون کا تقاضہ ہے کہ ایک ملزم کو پولیس کی کسٹڈی میں ہونا چاہئے تاکہ جلد از جلد تفتیش مکمل کر کے چالان پیش کیا جائے۔''

''یور آنر۔'' میں نے جج کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔''میں وکیل مخالف کی اس بات سے

اتفاق کرتا ہوں کہ قانون کے تقاضے ہر حال میں پورے ہونے چاہئیں۔ اس سلسلے میں پولیس پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ جتنی جلدی ممکن ہو سکے، اپنی تفتیش مکمل کر کے چالان پیش کر دے۔ پولیس کو تفتیش کے لئے میرے مؤکل کے جسمانی ریمانڈ کی ضرورت نہیں ہے۔ میرا مؤکل پولیس کو بالتفصیل اپنا بیان ریکارڈ کروا چکا ہے۔''

وکیل سرکار نے کہا۔ ''جناب عالی! یہ اقدام قتل عمد کا کیس ہے اور ناقابل ضمانت ہے۔ ملزم ایک سنگین جرم کا مرتکب ہوا ہے۔ اس لئے کسی قسم کی نرمی کا مستحق نہیں ہے۔''

میں نے کہا۔ ''جناب عالی! مضروبہ صادقہ بیگم ایک اتفاقی حادثے کا شکار ہو کر ہسپتال پہنچی ہے۔ یہ قطعی طور پر اقدام قتل عمد کا معاملہ نہیں ہے اور یہ بات میں مناسب وقت آنے پر ثابت بھی کر دوں گا۔ درحقیقت گرفتاری کے بعد پولیس نے میرے مؤکل سے دو لاکھ روپے بطور رشوت طلب کئے تھے اور وعدہ کیا تھا کہ اگر ان کا مطالبہ پورا کیا گیا تو وہ کوئی ہلکی دفعہ لگائیں گے۔ لیکن میرے مؤکل نے ان کا مطالبہ ماننے سے صاف انکار کر دیا۔ چنانچہ پولیس نے اسے پھانسنے کے لئے سخت ترین دفعات لگائی ہیں۔'' ایک لمحے کے توقف سے میں نے اضافہ کیا۔ ''جناب عالی! میرا مؤکل ایک امن پسند شہری ہے۔ اس کا کردار بے داغ ہے۔ آج تک وہ کسی قسم کی غیر قانونی سرگرمیوں میں بھی ملوث نہیں پایا گیا۔ پولیس کا یہ خدشہ بے بنیاد ہے کہ وہ تفتیش کی راہ میں رُکاوٹ بن سکتا ہے یا گواہوں پر اثر انداز ہو سکتا ہے۔ میرا مؤکل اس معاشرے کا ایک باعزت اور باوقار فرد ہے۔ اس کا پولیس ریکارڈ صاف اور بے داغ ہے۔ وہ ایک معروف کاروباری شخصیت ہے۔ کپڑے کی صنعت میں اس کا نام نہایت معتبر اور قابل بھروسہ ہے۔ ان دلائل کی روشنی میں، میں معزز عدالت سے پُرزور اپیل کرتا ہوں کہ وہ میرے مؤکل کی درخواست ضمانت کو فوری طور پر قبول کر کے اس کی رہائی کا حکم صادر کرے۔ نیز عدالت سے میری مزید درخواست ہے کہ وہ پولیس کو جلد از جلد چالان پیش کرنے کی ہدایت کرے۔ دیٹس آل یور آنر۔''

وکیل سرکار نے ایک مرتبہ پھر میرے مؤکل کی ضمانت کے خلاف دلائل دینا شروع کر دیئے۔ میں نے واضح طور پر محسوس کیا تھا کہ جج میرے دلائل سے خاصا متاثر نظر آ رہا تھا۔ وہ کچھ دیر تک تو سرکاری وکیل کی تقریر سنتا رہا پھر قدرے اُکتائے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

''آپ کوئی نئی بات بھی کہنا چاہتے ہیں یا پرانی ہی باتوں کو دہراتے رہیں گے؟''

سرکاری وکیل نے کہا۔ ''جناب عالی! پولیس کی تفتیش مکمل کرنے کے بعد ہی کوئی نئی بات سامنے آئے گی۔ فی الحال میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ملزم ایک سنگین جرم کا مرتکب ہوا ہے

اور یہ ایک ناقابل ضمانت کیس......''

''یہ بات آپ پہلے بھی کئی مرتبہ دُہرا چکے ہیں۔'' جج نے سرکاری وکیل کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ پھر وہ اپنے سامنے میز پر پھیلے ہوئے کاغذات کا مطالعہ کرنے لگا۔

تھوڑی دیر کے بعد جج نے سر اُٹھا کر حاضرین عدالت پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالی اور ملزم جمشید علی کو پچاس ہزار روپے کے مچلکے پر رہا کرنے کا حکم صادر کر دیا۔ نیز پولیس کو تاکید کی کہ وہ جلد از جلد کیس کا چالان پیش کرے۔

جمشید علی نے تشکر آمیز نظروں سے مجھے دیکھا۔ نیلم بھی اس وقت عدالت میں موجود تھی اور اُس کے چہرے سے اطمینان جھلک رہا تھا۔

میں نے جمشید علی کے جنرل منیجر کو اپنے پاس بلایا اور چند ضروری ہدایات دینے کے بعد مبلغ پچاس ہزار روپے کا پے آرڈر بنوانے کے لئے بھیج دیا۔ آدھے گھنٹے کے بعد وہ مذکورہ پے آرڈر بنوا کر واپس آ گیا۔ اس کے بعد کی کاغذی کارروائی میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ جمشید علی نے ضمانت کے کاغذات پر دستخط کئے اور اے ایس آئی سرفراز شاہ نے اُس کی ہتھکڑی کھول دی۔

عدالت کا کمرا واقعی کسی اکھاڑے سے کم نہیں ہوتا۔ اکھاڑے میں برسرِ پیکار پہلوان ایک دوسرے کو چت کرنے کے لئے اپنے اپنے طور پر بہترین جسمانی داؤ کا استعمال کرتے ہیں۔ عدالت کے کمرے میں وکلاء اپنی ذہانت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ دراصل یہ ایک ایسی جنگ ہوتی ہے جو قانون کے دائرے میں رہتے ہوئے لڑی جاتی ہے اور فریقین کو اپنے اعصاب اور جذبات پر مکمل کنٹرول رکھنا ہوتا ہے۔ اس جنگ کو جیتنے کے لئے ذہانت کے ساتھ ساتھ ہوشیاری اور چالاکی کی بھی اشد ضرورت ہوتی ہے۔

میں نے عدالت کے روبرو پولیس کے رشوت طلب کرنے والی جو بات کی تھی اس میں کوئی حقیقت نہیں تھی۔ پولیس نے جمشید علی سے ایسا کوئی مطالبہ نہیں کیا تھا۔ یہ بات میں نے عدالت میں پہنچتے ہی معلوم کر لی تھی حالانکہ میں نے گزشتہ رات اُسے ہدایت کی تھی کہ وہ پولیس تشدد سے بچنے کے لئے ان کا ہر مطالبہ پورا کرنے کا وعدہ کر لے۔ لیکن پولیس کی جانب سے حیرت انگیز طور پر ایسا کوئی مطالبہ نہیں کیا گیا۔ میں نے جج کے سامنے پولیس کے رشوت طلب کرنے کا ذکر کر کے جو داؤ آزمایا تھا وہ خاصا سودمند ثابت ہوا تھا۔

ہم عدالت سے باہر آئے تو جمشید علی بار بار میرا شکریہ ادا کر رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ''جمشید صاحب! آپ کی ضمانت تو ہو گئی ہے لیکن یہ مت سمجھیں کہ پولیس آسانی سے آپ کا

پیچھا چھوڑ دے گی۔''

''ہاں، یہ بات تو میں بھی محسوس کر رہا ہوں۔'' وہ نحیف سی آواز میں بولا۔''خدا کرے، صادقہ کی زندگی بچ جائے۔'' پھر اُس نے نیلم کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔''اس کے بارے میں آخری اطلاع کیا ہے؟''

نیلم نے بتایا۔''صادقہ بیگم کو ابھی تک ہوش نہیں آیا۔ ڈاکٹروں کی تشویش بڑھتی جا رہی ہے۔''

''بیگ صاحب!'' جمشید نے مجھے مخاطب کیا۔''اگر خدانخواستہ صادقہ زندگی کی بازی ہار گئی تو پھر کیا ہوگا؟''

میں نے کہا۔''کچھ نہیں ہوگا، صرف آپ کی مشکلات میں اضافہ ہو جائے گا لیکن آپ فکرمند نہ ہوں۔ اس کیس کا ہر پہلو میری نظر میں ہے۔ میں ایک دو روز میں مکمل تیاری کر لوں گا۔ بس مجھے آپ کے تعاون کی ضرورت ہے۔''

''میں ہر قسم کے تعاون کے لئے تیار ہوں۔''

میں نے کہا۔''مجھے پتہ چلا ہے کہ کسی شمشاد خان نامی شخص نے پولیس کو اس واقعے کی اطلاع دی تھی۔ یہ شمشاد خان کون ہے؟''

جمشید علی کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات اُبھر آئے۔ اُس نے جواب دیا۔''شمشاد خان، صادقہ کا بھائی ہے۔ مجھے یہ شخص ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ اس کا چال چلن ٹھیک ہے اور نہ ہی عادات و اطوار۔ اپنے گھر میں اُس کی آمدورفت مجھے ذرا پسند نہیں ہے۔ بہرحال میں نے صادقہ سے صاف صاف کہہ رکھا ہے کہ میری موجودگی میں شمشاد خان ہمارے گھر نہ آئے۔''

''پولیس کو اطلاع دینے کا واضح مطلب یہ ہے کہ شمشاد خان وقوعہ کے وقت یا اس کے فوراً بعد وہاں موجود تھا۔''

جمشید علی نے بتایا۔''جب یہ واقعہ پیش آیا، اس وقت تو شمشاد گھر میں نہیں تھا۔ میرا خیال ہے، وہ میرے ہسپتال روانہ ہونے کے بعد وہاں پہنچا ہوگا۔''

مزید استفسار پر جمشید علی نے بتایا کہ اُس کا سالا شمشاد خان ایک اسٹیٹ ایجنٹ تھا اور اُس کی رہائش سوسائٹی آفس کے نزدیک تھی جبکہ اُس کی اسٹیٹ ایجنسی سندھی مسلم سوسائٹی کے علاقے میں تھی۔ علاوہ ازیں شمشاد خان ایک فتنہ پرور شخص تھا، وہ جمشید علی کے خلاف صادقہ کے کان بھرتا رہتا تھا۔ اسی وجہ سے جمشید علی اسے سخت ناپسند کرتا تھا۔ شمشاد علی نے نازیہ اور آصف کو بھی ایسی ایسی پٹیاں پڑھائی تھیں کہ وہ اپنے باپ کی جانب سے بدگمان

ہوتے چلے گئے تھے۔ پھر بچوں کو باپ کی طرف سے باغی کرنے میں صادقہ کا بھی ہاتھ تھا۔

قصہ مختصر، شمشاد خان ایک لالچی، کمینہ خصلت اور موقع پرست انسان تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم ہو چکا تھا کہ اس معاملے کو پولیس تک لے جانے اور جمشید علی کو پھنسانے میں سب سے زیادہ کوشش شمشاد خان ہی نے کی تھی۔

میں نے جمشید علی سے کہا۔''آپ کی بات سے اندازہ ہوتا ہے کہ شمشاد خان کمینگی کے انتہائی درجے تک بھی جا سکتا ہے۔''

''اس جیسے بدفطرت شخص سے کچھ بھی بعید نہیں ہے۔''

''خیر۔'' میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔''شمشاد علی کا میں ٹھیک ٹھاک بندوبست کر دوں گا لیکن آپ مجھے ایک ایسا آدمی دیں جو میری مرضی کے مطابق بھاگ دوڑ کر سکے۔''

''کسی آدمی کی کیا ضرورت ہے۔'' جمشید علی نے جلدی سے کہا۔''آپ مجھے حکم کریں، کس قسم کی بھاگ دوڑ آپ کا مقصود ہے؟''

میں نے اُسے اپنی تفصیلات سے آگاہ کیا۔ اُس نے مجھے یقین دلایا کہ یہ کام ہو جائے گا۔ ان تمام معلومات کا تعلق کیس کی تیاری سے تھا جن کا ذکر بعد میں مناسب موقع پر آئے گا۔

میں نے وقت رخصت جمشید علی سے کہا۔''میں آپ کی سیکرٹری نیلم اور آپ کی والدہ کا نام بھی صفائی کے گواہوں میں شامل کرنا چاہتا ہوں اس لئے آپ انہیں شام میرے دفتر میں بھیج دیں تاکہ میں انہیں ان کا بیان یاد کروا دوں۔''

جمشید علی نے کہا۔''پولیس نے بھی ان دونوں کا بیان لیا ہے۔ کیا عدالت میں بھی انہیں وہی بیان دینا ہوگا؟''

''پولیس موقع پر جو بیان لیتی ہے اس میں بعض باتیں وہ سہولت کی خاطر اپنی مرضی سے بھی شامل کر لیتی ہے۔ یہ ایک طرح سے یکطرفہ کارروائی ہوتی ہے۔ بعض اوقات تو گواہ کی جانب سے بیان میں ایسی ایسی باتیں بھی درج کر لی جاتی ہیں جو گواہ نے خواب و خیال میں بھی نہیں کہی ہوتیں۔ عدالت میں جج کے روبرو جو حلفیہ بیان دیا جاتا ہے وہ بالواسطہ یا بلاواسطہ کیس پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ صفائی کے گواہوں کو ضروری نکات ذہن نشین کروا دوں اور ان کے بیان کا خاکہ بھی انہیں سمجھا دوں۔ کیونکہ بیان دینے کے بعد انہیں وکیل استغاثہ کی جرح کا سامنا بھی کرنا ہوگا۔''

میری طویل وضاحت جمشید علی کی سمجھ میں آ گئی، اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔''ٹھیک ہے بیگ صاحب! ابھی تو میں سیدھا ہسپتال جاؤں گا۔ صادقہ کی بے ہودگیاں اور

بدتمیزیاں تو رہیں ایک طرف لیکن انسان ہونے کے ناتے میرا فرض بنتا ہے کہ اس کی نازک موقع پر نگہداشت کروں۔ آپ فکر نہ کریں۔ میں شام میں اپنی والدہ اور نیلم کے ساتھ آپ کے پاس حاضر ہو جاؤں گا۔"

پھر وہ مجھ سے مصافحہ کرنے کے بعد نیلم کے ساتھ جنرل مینجر مقبول چغتائی کی جانب بڑھ گیا۔ میں نے ایک دوسری عدالت کا رُخ کیا۔

جمشید علی حسب وعدہ شام کو میرے دفتر آیا۔ میں نے بیانات کا خاکہ تیار کر لیا تھا۔ نیلم اور جمیلہ خاتون کو میں نے اُن کے بیانات لکھ کر دے دیئے تا کہ وہ اچھی طرح یاد کر لیں اور تمام اہم نکات زبانی بھی سمجھا دیئے۔ ان بیانات کی تفصیل آگے چل کر عدالتی کارروائی کے دوران میں آئے گی۔

جمشید علی جانے کے لئے اُٹھنے لگا تو میں نے اُسے یاد دہانی کروائی۔ "آپ کو یاد ہے نا، میں نے آپ کے ذمے کون کون سے کام لگائے ہیں؟"

"مجھے اچھی طرح معلوم ہے۔" وہ بولا۔ "آپ کی مطلوبہ معلومات انشاء اللہ کل شام تک آپ کو مل جائیں گی۔"

"آپ ہسپتال میں گئے تھے۔" میں نے ایک ضروری سوال کیا۔ "صادقہ بیگم کی حالت کے بارے میں بتائیں۔"

"وہ ہنوز بے ہوشی کی حالت میں ہے۔"

"ڈاکٹر کیا کہتے ہیں؟"

اُس نے بتایا۔ "ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ پیٹ میں لگنے والی گولی نے ایک گردے کو بری طرح متاثر کیا ہے۔ وہ صادقہ کو ہوش میں لانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ تاہم وہ زیادہ پُر اُمید نہیں ہیں۔"

میں نے پُرخیال انداز میں کہا۔ "اللہ مالک ہے۔"

وہ "خدا حافظ" کہہ کر رخصت ہو گیا۔

اُس کے جانے کے بعد میں اپنے دوسرے کلائنٹس کے ساتھ مصروف ہو گیا۔

☆......☆
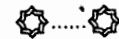
دوسری صبح میں ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد اخبار کا مطالعہ کر رہا تھا کہ فون کی گھنٹی بج اُٹھی۔ میں نے ریسیور اُٹھا کر کان سے لگایا اور ماؤتھ پیس میں "ہیلو" کہا۔

دوسری جانب جمشید علی تھا۔ اُس کی آواز میں گھبراہٹ نمایاں تھی۔ تھرتھراتے ہوئے لہجے

میں بولا۔ "بیگ صاحب! غضب ہو گیا۔"

"کیا ہوا بھائی؟"

"صادقہ چل بسی ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "کب! کس وقت؟"

"رات کے آخری پہر۔" اُس نے جواب دیا۔ "مجھے ابھی تھوڑی دیر پہلے اطلاع ملی ہے۔"

"کیا بے ہوشی ہی کی حالت میں اُس کا انتقال ہوا ہے؟"

وہ بولا۔ "ابھی مجھے زیادہ تفصیلات کا پتہ نہیں ہے۔ میں نے سب سے پہلے آپ ہی کو فون کیا ہے۔ میں ہسپتال جانے کے لئے گھر سے نکل رہا ہوں، آپ سے ایک چھوٹی سی درخواست ہے۔"

"ہاں ہاں، کہیں۔"

"اگر ممکن ہو سکے تو آپ بھی ہسپتال آ جائیں۔"

میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "ٹھیک ہے، میں عدالت جانے سے پہلے آپ کو پک کر لوں گا۔"

اُس نے شکریہ ادا کرنے کے بعد فون بند کر دیا۔

میں ہسپتال پہنچا تو پولیس وہاں موجود تھی۔ میں سب سے پہلے نائٹ ڈیوٹی والے ڈاکٹر سے ملا اور اُس سے صادقہ کی موت کے بارے میں سوالات کرنے لگا۔

اُس نے مجھے بتایا کہ مرنے سے پہلے مضروبہ صادقہ کو چند لمحے کے لئے ہوش آ گیا تھا۔

میں نے پوچھا۔ "ہوش میں آنے کے بعد اُس نے کچھ کہا تھا؟"

ڈاکٹر جس کا نام بعد میں مجھے ندیم ہاشمی معلوم ہوا، اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "ہاں، اُس نے چند جملے بولے تھے۔ پھر اس کی تکرار کرتی رہی تھی۔ حتیٰ کہ اُس کی آواز معدوم ہوتی چلی گئی۔ پھر اُس کی رُوح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔"

میں نے بے تاب لہجے میں پوچھا۔ "متوفیہ نے کون سے جملے کی تکرار کی تھی؟"

ڈاکٹر نے بتایا۔ "ہوش میں آنے کے بعد صادقہ پہلے تو ہولے سے کراہی تھی۔ کراہنے کے دوران میں اس کے چہرے پر ایسے تاثرات نمودار ہوئے تھے جیسے وہ کرب کی انتہائی منزلوں سے گزر رہی ہو۔ پھر اُس نے نیم بے ہوشی کی سی کیفیت میں بڑبڑانے والے انداز میں کہا تھا...... جمشید، تم اس چھنال کی خاطر مجھے طلاق دینا چاہتے تھے نا۔ لو، سب سے پہلے

میں اسی کی لاش گراتی ہوں۔ مرنے کے لئے تیار ہو جاؤ کمینی عورت۔ آخری جملے کی تکرار
کے دوران میں ہی اُس کا دم ٹوٹ گیا تھا۔''

''اوہ!'' میرے سینے سے ایک گہری اطمینان بخش سانس خارج ہوئی۔ مجھے یوں محسوس
ہوا جیسے اسی لمحے میں نے وہ کیس جیت لیا ہو۔

اتنی دیر میں تفتیشی افسر سرفراز شاہ ہمارے قریب آتے ہوئے بولا۔ ''یہاں کیا میٹنگ ہو
رہی ہے بھائی؟'' پھر مجھ پر نگاہ پڑتے ہی وہ چونکا۔ ''اوہ، وکیل صاحب بھی موجود ہیں۔
بیگ صاحب آپ اتنی صبح یہاں کیا کر رہے ہیں؟''

میں نے اُس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ''ان سے ملئے انکوائری افسر
صاحب۔'' میں نے ڈاکٹر کی جانب اشارہ کیا۔ ''یہ ڈاکٹر ندیم ہاشمی ہیں۔ یہ مضروبہ صادقہ
کے آخری لمحات میں اس کے قریب موجود تھے۔ ان کا بیان فی الفور ریکارڈ کریں۔ آپ کا
کام بہت آسان ہو جائے گا۔''

انکوائری افسر نے مجھے گھور کر دیکھا، پھر سوالیہ نظروں سے ڈاکٹر ہاشمی کو تکنے لگا۔ ندیم ہاشمی
نے وہ تمام باتیں دہرا دیں جو وہ ابھی تھوڑی دیر پہلے مجھے بتا چکا تھا۔

انکوائری افسر نے طنزیہ انداز میں میری جانب دیکھا اور زہریلے لہجے میں بولا۔ ''بیگ
صاحب! لگتا ہے، آپ نے ڈاکٹر کو یہ بیان رٹوانے میں خاصی محنت کی ہے۔ یقینی طور پر آپ
نے کچھ رقم بھی خرچ کی ہوگی۔''

انکوائری افسر کی بات سن کر ڈاکٹر ندیم ہاشمی بھڑک اُٹھا، تیز لہجے میں بولا۔ ''آپ مجھ پر
دروغ گوئی اور رشوت کا الزام لگا رہے ہیں۔ آپ کو شرم آنا چاہئے۔ سب کو اپنے جیسا سمجھ
رکھا ہے آپ نے۔''

''زیادہ غصے میں نہ آئیں ڈاکٹر صاحب۔'' اے ایس آئی سرفراز شاہ نے کہا۔ ''ڈاکٹروں
کا کچا چٹھا بھی ہم سے پوشیدہ نہیں ہے۔''

انکوائری افسر کے اس جملے نے جلتی پر تیل کا کام کیا، ڈاکٹر ندیم ہاشمی کا چہرہ غصے سے سرخ
ہو گیا۔ وہ طیش کے عالم میں بولا۔ ''فکر نہیں کرو افسر، میں تمہاری شکایت اوپر تک پہنچاؤں
گا۔ آئندہ تمہیں کسی ڈاکٹر پر کیچڑ اچھالنے کی ہمت نہیں ہوگی۔'' پھر وہ میری جانب مڑتے
ہوئے بولا۔ ''وکیل صاحب، آپ اس تمام گفتگو کے گواہ ہیں۔ میں اپنی شکایت میں آپ کا
نام بطور گواہ دُرج کروں گا۔''

''بصد خوشی ڈاکٹر صاحب۔'' میں نے خوشگوار لہجے میں کہا۔ ''لیکن میں کوئی کام فیس

کے بغیر نہیں کرتا۔''

اُس نے حیرت سے میری جانب دیکھا۔ ''کیسی فیس؟''

میں نے کہا۔ ''گواہی بطور فیس۔''

''میں کچھ نہیں سمجھا۔''

اُس نے وضاحت کی۔ ''آپ اپنے شکایت نامے میں میرا نام بطور گواہ شامل کر لیں،
میں اس کیس کے صفائی کے گواہوں میں آپ کا نام شامل کر لیتا ہوں۔ کیا خیال ہے آپ
کا؟''

''خیال تو اچھا ہے۔'' وہ ابھی تک اُلجھا ہوا تھا۔ ''لیکن صفائی کے گواہ کے طور پر مجھے کرنا
کیا ہوگا؟''

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''بہت آسان۔ آپ کے ہسپتال میں داخل مضروبہ صادقہ
بیگم نے اپنی زندگی کی آخری گھڑیوں میں جو کچھ کہا ہے، آپ کو بھری عدالت میں جج کے
روبرو اسے دہرانا ہوگا اور حلفیہ اس کی تصدیق بھی کرنا ہوگی۔''

''ضرور ضرور۔'' وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''یہ تو میرا اخلاقی فرض بھی ہے۔
میں سچ بولنے سے نہیں گھبراتا۔ آپ بخوشی میرا نام صفائی کے گواہوں کی فہرست میں شامل کر
لیں۔''

میں انکوائری افسر کی جانب مڑا۔ ''شاہ جی! آپ یہ بات تو جانتے ہوں گے کہ عدالت
مرنے والے کے آخری کلمات کو بڑی اہمیت دیتی ہے۔ دم آخر کسی انسان سے جھوٹ بولنے
کی توقع نہیں کی جا سکتی۔''

وہ مجھے خونخوار نظروں سے گھورتے ہوئے ایک طرف جانے لگا۔ میں نے پیچھے سے کہا۔
''اب ہماری ملاقات عدالت کے کمرے ہی میں ہوگی، خوب تیاری کر کے آنا، اے ایس آئی
صاحب۔''

ڈاکٹر ندیم ہاشمی نے اُس کے زخموں پر نمک پاشی کرتے ہوئے با آواز بلند کہا۔ ''میں آج
ہی علاقہ ایس پی کے نام اپنی مصدقہ شکایت روانہ کر دوں گا۔ اگر میری شکایت کو قابل توجہ نہ
سمجھا گیا تو میں بیگ صاحب کے توسط سے ہتک عزت کا دعویٰ دائر کر دوں گا۔''

مزید تھوڑی دیر ہسپتال میں رُکنے کے بعد میں عدالت روانہ ہو گیا۔

✡......✡
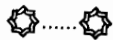
پولیس نے غیر معمولی مستعدی کا مظاہرہ کرتے ہوئے پانچ روز بعد چالان پیش کر دیا۔

کئی صفحات پر مشتمل چالان رپورٹ کاغذی خانہ پُری سے زیادہ کچھ نہیں تھی۔ وہ کاغذ کا پیٹ بھرنے کا اعلیٰ ترین نمونہ تھا۔ دراصل صادقہ کی موت کے بعد اس کیس نے جتنی تیزی سے کروٹ بدلی تھی اس نے پولیس کو حواس باختہ کر دیا تھا۔ خاص طور پر صادقہ نے زندگی کی آخری سانسوں میں جو کلمات ادا کئے تھے اس کے بعد سے اس کیس پر پولیس کی گرفت کمزور تر اور ہماری گفتگو مضبوط ترین ہو گئی تھی۔

پولیس رپورٹ کا خلاصہ یہ تھا۔ ''ملزم جمشید علی ایک ظالم و جابر شخص تھا۔ وہ اکثر و بیشتر اپنی بیوی کو زدو کوب کرتا رہتا تھا۔ ماں کے ساتھ ہونے والی اس زیادتی کے سبب دونوں بچے بھی باپ سے باغی ہو گئے تھے۔ صادقہ شوہر کا ہر ستم برداشت کر رہی تھی کہ ملزم نے دوسری شادی کا فیصلہ کر کے صادقہ پر ساتوں آسمان ایک ساتھ گرا دیئے۔ ملزم نے متوفیہ کا سینہ چھلنی کرنے کے لئے اس عورت کو اپنی ماں سے بھی ملوا دیا جس سے وہ شادی کرنا چاہتا تھا۔ متوفیہ نے زندگی میں پہلی مرتبہ لب کشائی کی اور ملزم کے اس فعل پر صدائے احتجاج بلند کی۔ ملزم سچائی کو برداشت نہ کر سکا اور فی الفور ریوالور نکال کر متوفیہ صادقہ بیگم کو شوٹ کر دیا۔ ملزم کو یقین تھا کہ اُس نے اپنی بیوی کو موت کے گھاٹ اُتار دیا ہے لیکن اُس نے قانون کی آنکھ میں دُھول جھونکنے کے لئے ڈرامہ رچایا تھا اور سب کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے لئے زخمی بیوی کو ہسپتال پہنچا دیا وغیرہ وغیرہ۔

جج نے کارروائی کا آغاز کرتے ہوئے فردِ جرم پڑھ کر سنائی۔ ملزم نے صحت جرم سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد ملزم جمشید علی نے اپنا طویل بیان ریکارڈ کروایا۔ اس بیان میں زیادہ تر باتیں وہی تھیں جو تھانے میں ملاقات کے دوران وہ مجھے بتا چکا تھا۔ لہٰذا دوبارہ ان باتوں کا تذکرہ کرنا صفحات کا زیاں ہو گا۔

استغاثہ کی جانب سے نصف درجن گواہوں کی فہرست پیش کی گئی تھی جن میں میرے مؤکل کے دونوں بچوں آصف اور نازیہ کے علاوہ گھریلو ملازمہ نگہت پروین، پڑوسی منظور الٰہی، جمشید ٹیکسٹائل مل کا اکاؤنٹنٹ عبدالرحمٰن اور متوفیہ کا بھائی شمشاد خان شامل تھا۔

استغاثہ کی جانب سے سب سے پہلے نازیہ اور آصف گواہی دینے آئے۔ ان کی گواہی میں کوئی ایسی خاص بات نہیں تھی جو قابل ذکر ہو۔ وہ وقوعہ کے روز گھر پر موجود ہی نہیں تھے۔ وکیل استغاثہ نے انہیں محض اس لئے پیش کیا تھا کہ وہ اپنے بیان سے ملزم کو ایک ظالم و جابر شخص ثابت کر سکیں۔ انہوں نے اپنے باپ کے بارے میں خاصا زہر اُگلا۔ یہ وہی زہر تھا جو ان کی ماں صادقہ بیگم اور ماموں شمشاد خان موقع بے موقع قطرہ قطرہ ان کے ذہنوں میں

ٹپکاتے رہتے تھے۔

اس کے بعد ملزم کا پڑوسی منظور الٰہی بیان دینے آیا۔ اُس نے سچ بولنے کا حلف اٹھانے کے بعد مختصر سا بیان دیا۔ اُس کا بیان ریکارڈ ہو چکا تو وکیل استغاثہ سوالات کے لئے آگے بڑھا۔

''منظور الٰہی صاحب!'' اُس نے جرح کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ ملزم کے پڑوسی ہیں۔ آپ نے بیان دیا ہے کہ ملزم کے گھر سے اکثر لڑائی جھگڑے کی آوازیں آتی رہتی تھیں؟''

''جی ہاں، میں نے یہی بیان دیا ہے۔''

وکیل استغاثہ نے پوچھا۔ ''آپ معزز عدالت کو بتائیں گے کہ یہ جھگڑا کن افراد کے مابین ہوا کرتا تھا؟''

''یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔'' منظور الٰہی نے کہا۔ ''وہ آوازیں ملزم اور اس کی بیوی کی ہوا کرتی تھیں۔''

''منظور الٰہی صاحب! وقوعہ کے روز آپ گھر پر ہی تھے؟''

''جی ہاں، میں گھر میں موجود تھا۔''

''آپ نے کیا دیکھا؟'' وکیل استغاثہ نے پوچھا۔ ''میرا مطلب ہے، اُس روز آپ کے پڑوس میں کیا واقعہ پیش آیا تھا؟''

منظور الٰہی نے جواب دیا۔ ''لگ بھگ چھ بجے شام میں نے اچانک گولی چلنے کی آواز سنی تو چونک اٹھا۔ میں صورتِ حال کا جائزہ لینے کے لئے گھر سے باہر نکلا تو پتہ چلا ملزم نے اپنی بیوی کو شوٹ کر دیا ہے۔''

وکیل استغاثہ نے مزید دو تین سوال پوچھنے کے بعد جرح کا سلسلہ موقوف کر دیا۔

میں اپنی جگہ سے اٹھا اور جج کی اجازت حاصل کرنے کے بعد کٹہرے میں موجود گواہِ استغاثہ منظور الٰہی کے قریب آ گیا۔ کچھ دیر تک میں خاموشی سے اُس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا، پھر سوال کیا۔ ''منظور الٰہی صاحب! ابھی تھوڑی دیر پہلے آپ نے وکیل استغاثہ کے ایک سوال کے جواب میں بتایا ہے کہ آپ وقوعہ کے روز گھر پر تھے۔ آپ اس عدالت کو بتانا پسند کریں گے کہ مذکورہ روز کیا تاریخ تھی؟''

وہ پریشان نظروں سے مجھے دیکھنے لگا پھر کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

''میرا خیال ہے، اُس روز شاید بارہ تاریخ تھی۔''

”شاید کیوں؟“ میں نے اُسے گھورا۔ ”آپ کو یقین کیوں نہیں ہے۔ یہ بات زیادہ پرانی تو نہیں ہے۔“

”وہ دراصل میری یادداشت کچھ زیادہ اچھی نہیں ہے۔“

اس جواب پر وکیل استغاثہ نے اُسے گھور کر دیکھا۔ پھر بات بناتے ہوئے بولا۔ ”یور آنر، معزز گواہ زندگی میں پہلی مرتبہ عدالت میں حاضر ہوا ہے اس لئے ذرا نروس ہو گیا ہے۔ ورنہ چند روز پہلے کا واقعہ بھی بھلا کوئی بھولنے کی بات ہے۔“

”تھینک یو میرے فاضل دوست۔“ میں نے طنزیہ انداز میں وکیل استغاثہ کی جانب دیکھا۔ ”میں عمر بھر آپ کا احسان مند رہوں گا۔ آپ نے میری نظر میں ”یادداشت کی کمزوری“ اور ”نروس ہونے“ کا مفہوم واضح کر دیا ہے۔“

وہ ایسی نظروں سے مجھے دیکھنے لگا جیسے اُس کے پلے کچھ نہ پڑا ہو۔ میں گواہ کی جانب متوجہ ہو گیا۔ ”منظور الٰہی صاحب! آپ کے وکیل نے تصدیق کر دی ہے کہ آپ کی یادداشت ماشاء اللہ بہت اچھی ہے۔ لیکن عدالت کے ماحول نے آپ کو تھوڑا نروس کر دیا ہے۔ اگر آپ جواب دینے کی پوزیشن میں ہوں تو میں سوال کروں؟“

اُس نے اپنے وجود کے وزن کو ایک پاؤں سے دوسرے پاؤں پر منتقل کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ پوچھیں، کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟“

میں نے پوچھا۔ ”منظور الٰہی صاحب! آپ نے وکیل استغاثہ کے ایک سوال کے جواب میں بتایا ہے کہ وقوعہ کے روز کم و بیش چھ بجے آپ نے گولی چلنے کی آواز سنی تو آپ صورتِ حال کا جائزہ لینے کے لئے گھر سے باہر نکل آئے تھے۔“

اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔ میں نے پوچھا۔ ”باہر آ کر آپ کو معلوم ہوا کہ آپ کے پڑوسی نے اپنی بیوی کو شوٹ کر دیا ہے۔ یہ بات آپ کو کسی نے بتائی تھی یا آپ نے موقع واردات پر جا کر خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا؟“

”یہ بات مجھے ملزم کے ایک رشتے دار شمشاد خان نے بتائی تھی۔“

”یعنی آپ گھر کے اندر نہیں گئے تھے؟“

”نہیں۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”شمشاد خان مجھے گیٹ پر ہی مل گیا تھا۔ اُس نے بتایا تھا کہ ملزم ابھی ابھی زخمی صادقہ کو گاڑی میں ڈال کر کہیں لے گیا ہے۔“

میں نے پوچھا۔ ”آپ کو اپنے پڑوسی سے کوئی شکایت ہے؟“

اُس نے نفی میں جواب دیا۔ میں نے جرح کے سلسلے کو ختم کر دیا۔

استغاثہ کا اگلا گواہ جمشید ٹیکسٹائل مل کا اکاؤنٹنٹ عبدالرحمٰن تھا۔ اس شخص کے بارے میں جمشید علی مجھے بتا چکا تھا کہ وہ صادقہ بیگم کا چمچہ خاص تھا۔ مجھے حیرت اس بات پر تھی کہ اس کا نام استغاثہ کے گواہوں میں کیوں شامل کیا گیا تھا۔ وقوعہ کے وقت وہ جائے واردات سے میلوں دُور فیکٹری میں اپنے کام میں مشغول تھا۔ اس نے جب بیان دیا تو میری اُلجھن دُور ہو گئی۔ اسے محض اس لئے گواہی کے لئے بلایا گیا تھا کہ وہ ملزم کو ظالم اور متوفیہ کو مظلوم ثابت کر سکے۔

وکیل استغاثہ اپنی جرح ختم کر چکا تو میں نے گواہ عبدالرحمٰن سے سوال کیا۔ ”عبدالرحمٰن صاحب! آپ کی فیکٹری میں ملازمین کو تنخواہ کون سی تاریخ کو دی جاتی ہے؟“

وکیل استغاثہ میرے اس غیر متعلقہ سوال پر عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔ عبدالرحمٰن نے میرے سوال کا جواب دیا۔ ”ہماری فیکٹری میں ہر ماہ یکم کو تنخواہ دے دی جاتی ہے۔“

”کبھی دیر سویر بھی ہو جاتی ہو گی؟“

”قطعی نہیں جناب۔“ وہ پُر وثوق لہجے میں بولا۔ ”اگر پہلی تاریخ کو اتوار یا کوئی چھٹی پڑ رہی ہو تو ہم ایک روز پہلے ہی تنخواہ تقسیم کر دیتے ہیں۔“

میں نے پوچھا۔ ”ایک ذاتی قسم کا سوال کر رہا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ جمشید ٹیکسٹائل مل میں اکاؤنٹس کے ساتھ ساتھ کیش کے معاملات کو بھی دیکھتے ہیں۔ کیا خیال ہے، آپ کو اپنی صلاحیتوں کے مطابق معاوضہ مل رہا ہے؟“

وہ بولا۔ ”ہمارے ملک میں کسی شخص کو اس کی صلاحیتوں کے مطابق معاوضہ کہاں ملتا ہے۔“

”یعنی اگر آپ جمشید ٹیکسٹائل مل کی ملازمت چھوڑ کر کہیں اور کام کریں تو بھی آپ کو کم و بیش اتنی ہی تنخواہ ملے گی۔“

”آپ کہہ سکتے ہیں۔“

میں نے کہا۔ ”گویا آپ کو فیکٹری سے نہیں بلکہ اس ملک سے شکوہ ہے جہاں کسی شخص کو اس کی محنت کا پورا صلہ نہیں ملتا؟“

جج میرے نقطۂ نظر کو سمجھ رہا تھا اور بڑی دلچسپی سے جرح سن رہا تھا۔ گواہ عبدالرحمٰن نے جواب دیا۔ ”کچھ ایسی ہی بات ہے۔“

”جناب عالی! مجھے اور کچھ نہیں پوچھنا۔“ میں نے جج کی جانب دیکھتے ہوئے کہا اور اپنی

جگہ پر آ کر بیٹھ گیا۔

کٹہرے میں کھڑا عبدالرحمٰن ہکا بکا مجھے دیکھنے لگا۔ پتہ نہیں، وہ ذہن میں کس قسم کی خطرناک جرح کا تصور لے کر آیا تھا۔ بہرحال مجھے جو کچھ پوچھنا تھا وہ میں پوچھ چکا تھا۔ میری کارکردگی سے جج خاصا متاثر نظر آ رہا تھا۔

عبدالرحمٰن کے بعد گھریلو ملازمہ نگہت پروین گواہی دینے کے لئے کٹہرے میں آئی۔ وہ تیس بتیس سال کی ایک قبول صورت عورت تھی۔ اُس نے موسم کی مناسبت سے ہلکے کپڑے کا شلوار سوٹ پہن رکھا تھا۔ حلف اٹھانے کے بعد اُس نے طویل بیان دیا۔ زورِ بیاں ملزم کی برائیاں اور مالکن کی اچھائیاں بیان کرنے پر تھا۔ اپنے بیان کے آخر میں اُس نے بتایا کہ وقوعہ کے روز جب اس نے اپنی مالکن کو جا کر بتایا کہ ملزم اس عورت کو اپنے گھر لے آیا ہے جس سے وہ شادی کا منصوبہ بنا رہا ہے تو اُس کی مالکن بازپرس کرنے مالک کے کمرے میں چلی گئی۔ پھر تھوڑی ہی دیر کے بعد گولی چلنے کی آواز آئی۔ اس کے چند لمحے بعد ملزم اپنی بیوی کو گاڑی میں ڈال کر بنگلے سے روانہ ہو گیا۔

اس کا بیان ختم ہوا تو وکیل استغاثہ نے سرسری انداز میں دو چار سوالات کئے جس سے یہ ثابت کرنا مقصود تھا کہ ملزم اپنی بیوی سے بہت نفرت کرتا تھا اور اس سے دشمنی کی حد تک بیر رکھتا تھا، وغیرہ وغیرہ۔ وکیل استغاثہ کا رویہ میری توقع کے مطابق تھا۔

میں اپنی باری پر جرح کرنے کے لئے کٹہرے کے پاس آیا اور نگہت پروین سے سوال کیا۔ ’’نگہت پروین! تمہیں ملزم کے بنگلے پر کام کرتے ہوئے کتنا عرصہ ہوا ہے؟‘‘

اُس نے اُنگلیوں پر حساب لگانے کے بعد جواب دیا۔ ’’آٹھ سال جناب۔‘‘

’’آٹھ سال اچھی خاصی مدت ہوتی ہے۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’کیا اس عرصے کے دوران میں تمہیں اپنے مالک میں ایک بھی خوبی نظر نہیں آئی؟‘‘

اُس نے پہلے ملزم کی طرف دیکھا پھر وکیل استغاثہ کی جانب۔ اس کے بعد اُس نے میرے سوال کا جواب دیا۔ ’’مجھے ان میں ایک بھی خوبی نظر نہیں آئی۔‘‘

میں نے پوچھا۔ ’’گزشتہ آٹھ سال میں تمہیں اپنی مالکن میں کوئی ایک خرابی بھی نظر نہیں آئی ہو گی؟‘‘

’’نہ جی، وہ بہت اچھی عورت تھیں۔‘‘

’’تمہاری مالکن تو اب اس دنیا میں نہیں رہی۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’تمہاری نوکری کا کیا ہو گا۔ اس بنگلے میں تو تمہارا دل نہیں لگے گا؟‘‘

’’ہاں جی، اب میں شمشاد صاحب کے گھر میں کام کروں گی۔‘‘ اُس نے جواب دیا۔ ’’میں نے اُن سے نوکری کی بات کر لی ہے۔‘‘

’’کیا تم نازیہ اور آصف کو تنہا چھوڑ دو گی؟‘‘

وہ جلدی سے بولی۔ ’’کیوں جی، وہ بھی میرے ساتھ ہی شمشاد صاحب کے گھر میں رہیں گے بلکہ ہم سب بعد میں اسی بنگلے میں منتقل ہو جائیں گے۔ جمشید صاحب تو جیل چلے جائیں گے نا۔‘‘

وہ اپنی بے وقوفی نما سادگی میں بہت بڑا انکشاف کر گئی تھی۔ جج نے چونک کر اُسے دیکھا۔ وکیل استغاثہ تلملا کر رہ گیا۔ میں فی الفور ایکشن میں آ گیا۔ میں نے تیز لہجے میں سوال کیا۔ ’’نگہت پروین، تمہیں یہ پٹی کس نے پڑھائی ہے؟‘‘

وہ حاضرینِ عدالت کے چہروں پر بدلتے ہوئے تاثرات سے اندازہ لگا چکی تھی کہ اُس سے کوئی سنگین غلطی سرزد ہو گئی تھی۔ اُس کے چہرے پر گھبراہٹ نما تشویش کے آثار نمودار ہوئے۔ لرزاں لہجے میں بولی۔ ’’کون سی پٹی وکیل صاحب؟‘‘

میں نے پوچھا۔ ’’والدہ کے وفات کے بعد نازیہ اور آصف شمشاد خان کے گھر کیوں چلے جائیں گے؟‘‘

’’وہ جی...... وہ جی۔‘‘ وہ لکنت آمیز لہجے میں بولی۔

میں نے کہا۔ ’’اور بعد میں تم سب لوگ بشمول شمشاد خان میرے مؤکل کے بنگلے میں کیوں چلے جاؤ گے۔ بتاؤ، جواب دو۔‘‘

وہ بری طرح ہراساں ہو چکی تھی۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا جواب دے۔ جج نے اُسے سرزنش کی۔ ’’بی بی! وکیل صاحب جو پوچھ رہے ہیں، اس کا جواب دو۔‘‘

میں نے اُس کے بولنے سے پہلے ہی ایک اور حملہ کر دیا۔ ’’تمہیں یہ بات کس نے بتائی ہے کہ ملزم جیل چلا جائے گا؟‘‘

وہ روہانسے لہجے میں بولی۔ ’’میں کچھ نہیں بتاؤں گی۔ مجھے کچھ معلوم نہیں۔‘‘

جج نے غصیلی نظروں سے اُسے دیکھا اور ڈانٹنے والے انداز میں کہا۔ ’’بی بی! اگر تم نے فوری طور پر وکیل صاحب کے تینوں سوالوں کا جواب نہیں دیا تو میں تمہیں توہینِ عدالت کے جرم میں جیل بھجوا دوں گا۔‘‘

اُس کا رنگ سرسوں کی مانند پیلا پڑ گیا، سراسیمہ لہجے میں بولی۔ ’’میں نے کچھ نہیں کیا ہے۔ میرا کوئی قصور نہیں۔ وہ...... وہ تو سب کچھ شمشاد صاحب نے مجھے بتایا تھا۔ انہوں نے

کہا تھا فی الحال بچے اور میں ان کے گھر چلے جائیں گے۔ جمشید صاحب پر مقدمہ چلے گا۔ ممکن ہے، انہیں سزائے موت ہی ہو جائے۔ ان کے جیل جانے کے بعد شمشاد صاحب اس بنگلے میں آ کر رہنے لگیں گے۔'' اپنی بات ختم کرنے کے بعد وہ رحم طلب نظروں سے جج کو دیکھنے لگی۔ پھر گلوگیر لہجے میں بولی۔ ''سر جی، میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔ آپ مجھے جیل نہ بھیجیں۔ میں ان لوگوں سے دُور چلی جاؤں گی، کسی دوسری جگہ ملازمت کرلوں گی۔''

پھر وہ باقاعدہ آنسوؤں سے رونے لگی۔

جج نے وکیل استغاثہ کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا استغاثہ کا گواہ شمشاد خان اس وقت عدالت میں موجود ہے؟''

وکیل استغاثہ نے جواب دیا۔ ''جناب عالی، وہ تھوڑی دیر پہلے برآمدے میں بینچ پر بیٹھا ہوا تھا۔''

''اُسے بیان کے لئے اندر بلائیں۔'' جج نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

واضح رہے کہ عدالت کے کمرے میں ایک وقت میں صرف ایک گواہ کو ہی گواہی کے لئے بلایا جاتا ہے۔ باقی متعلقہ گواہان باہر برآمدے میں اپنی باری کے منتظر رہتے ہیں۔ اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ایک گواہ کی گواہی دوسرے گواہ کے بیان کو متاثر نہ کرے۔

ہماری خوش قسمتی یہ تھی کہ ہمارا کیس پہلے نمبر پر تھا اس لئے ہمیں زیادہ سے زیادہ وقت مل رہا تھا ورنہ ایک ہی دن میں اتنے گواہوں کا بیان کروانا ممکن نہیں تھا۔

تھوڑی ہی دیر کے بعد نگہت پروین کی جگہ شمشاد خان گواہوں کے کٹہرے میں کھڑا تھا۔ اُس نے سچ بولنے کا حلف اٹھایا پھر اپنا بیان ریکارڈ کروایا۔ اُس کا بیان پولیس رپورٹ کا خلاصہ تھا۔

وکیل سرکار نے متعلقہ کم اور غیر متعلقہ سوالات زیادہ کئے۔ دراصل وہ تھوڑی دیر پہلے پیدا ہو جانے والی صورتِ حال سے بوکھلایا ہوا تھا۔ نگہت پروین کے انکشاف نے کیس کا پانسا پلٹ دیا تھا۔ جج کے رویئے سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ حقیقت حال تک پہنچ چکا ہے۔

میں نے جج کی خواہش کو مدنظر رکھتے ہوئے جرح کا آغاز کیا۔ ''شمشاد صاحب! کیا آپ نے ملزم کی ملازمہ نگہت پروین سے کہا تھا کہ ملزم کے دونوں بچے اب آپ کے یہاں منتقل ہو جائیں گے؟''

اُس کے چہرے پر اُلجھن کے آثار پیدا ہوئے لیکن جلد ہی وہ سنبھل گیا اور تھوک نگلتے ہوئے بولا۔ ''ہاں، میں نے یہ بات کہی تھی۔ ظاہر ہے ماں کے بغیر بچے اکیلے کیسے رہ سکتے

ہیں۔ انہیں کسی نہ کسی سرپرست کی ضرورت ہوگی۔ مجھ سے زیادہ ان کی نگہداشت اور کون کر سکتا ہے۔''

''شمشاد صاحب!'' میں نے اُسے کڑے تیوروں سے گھورتے ہوئے کہا۔ ''آپ نے ملزم کی ملازمہ کو بتایا تھا کہ ازاں بعد آپ سب لوگ ملزم کے بنگلے میں منتقل ہو جائیں گے؟''

''نہیں، میں نے ایسی کوئی بات نہیں کہی۔'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ اُس کے چہرے سے پریشانی جھلک رہی تھی۔

''کیا آپ نے ملزم کی ملازمہ کو یقین دلایا تھا کہ ملزم کو سزائے موت یا قید تا حیات ہو جائے گی۔؟''

''نہیں......نہیں تو......'' اُس کی زبان لڑکھڑانے لگی۔ ''میں بھلا ایسا کیوں کہنے لگا؟''

جج نے اُسے جھاڑ پلائی۔ ''مسٹر شمشاد! تم جن باتوں سے انکاری ہو، ابھی تھوڑی دیر پہلے استغاثہ کی گواہ نگہت پروین ان باتوں کا اقرار کر چکی ہے۔''

''جناب! اس نے جھوٹ بولا ہے۔'' وہ ہراساں نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

جج نے اپنے سامنے پھیلے ہوئے کاغذات پر کچھ نوٹ کیا پھر مجھے جرح جاری رکھنے کی ہدایت کی۔ جج کے چہرے پر غصے کے تاثرات میں نے واضح طور پر محسوس کئے تھے۔

میں نے سوال کیا۔ ''شمشاد صاحب! وقوعہ کے روز آپ ملزم کے بنگلے پر موجود تھے؟''

''نہیں، میں وہاں بعد میں پہنچا تھا۔''

''پولیس کو اس واقعے کی اطلاع آپ نے دی تھی؟'' میں نے پوچھا۔

اُس نے اثبات میں جواب دیا۔ میں نے پوچھا۔ ''جب پولیس بنگلے پر پہنچی تو اس وقت تک ملزم اپنی مضروبہ بیوی کو گاڑی میں ڈال کر وہاں سے روانہ ہو چکا تھا۔ آپ نے پولیس کو بتایا کہ وہ ہسپتال گیا ہے۔ آپ کو کیسے پتہ چلا کہ وہ ہسپتال گیا ہوگا جب کہ آپ وہاں ملزم کی روانگی کے بعد پہنچے تھے؟''

اُس پر جھنجھلاہٹ آمیز پریشانی کی کیفیت طاری تھی، اُکھڑے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''یہ تو سامنے کی بات ہے، کسی بھی زخمی شخص کو ہسپتال ہی لے جایا جاتا ہے۔''

''بالکل درست!'' میں نے اُس کی تائید کی، پھر پوچھا۔ ''آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ وہ فلاں پرائیویٹ ہسپتال لے گیا ہوگا۔ آپ نے تو پولیس کو ہسپتال کا نام بھی بتایا تھا؟''

''یہ تو کامن سینس کی بات ہے۔'' وہ چڑچڑے لہجے میں بولا۔ ''وہاں نزدیک ترین ہسپتال وہی تھا۔ ملزم کو وہیں جانا چاہئے تھا۔ اگر میری جگہ کوئی بھی شخص ہوتا تو اس کے ذہن

میں بھی اسی ہسپتال کا نام آتا۔"

میں نے سوال کیا۔ "شمشاد صاحب! فائر کی آواز سن کر ملزم کا پڑوسی اور استغاثہ کا معزز گواہ منظور الٰہی اپنے گھر سے باہر نکل آیا تھا۔ گیٹ پر اُس کی ملاقات آپ سے ہوئی اور آپ نے اُسے بتایا کہ ملزم نے اپنی بیوی کو شوٹ کر دیا ہے۔ مجھے پوچھنا آپ سے یہ ہے کہ آپ نے بنگلے میں داخل ہوئے بغیر یہ کیسے جان لیا کہ ملزم نے اپنی بیوی کو گولی مار دی ہے؟"

اُس نے جواب دیا۔ "جب منظور الٰہی سے میری بات ہوئی تھی تو اس وقت میں بنگلے کے اندر سے ایک چکر لگا کر باہر آیا تھا۔"

"لیکن ابھی تھوڑی دیر پہلے آپ نے بتایا ہے کہ جب آپ موقع واردات پر پہنچے تو ملزم اپنی مضروبہ بیوی کو ہسپتال لے جا چکا تھا؟" میں نے اُس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔

"تو؟" اُس نے اُلجھن آمیز لہجے میں سوال کیا۔

"تو یہ شمشاد صاحب!" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "گواہ منظور الٰہی کا بیان ہے کہ وہ گولی چلنے کی آواز سن کر فی الفور گھر سے نکل آیا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ملزم اور اُس کی زخمی بیوی ابھی بنگلے کے اندر ہی تھے۔ جب کہ آپ فرماتے ہیں، آپ ان کے ہسپتال جانے کے بعد وہاں پہنچے تھے۔ علاوہ ازیں آپ کا بیان ہے کہ گواہ منظور الٰہی سے جب آپ کی بات ہوئی اس وقت آپ بنگلے کے اندر ایک چکر لگا کر باہر آئے تھے۔ ان تمام واقعات میں وقت کے حوالے سے خاصا تضاد پایا جاتا ہے۔ آپ اس بارے میں کیا کہتے ہیں؟"

"میں نے جو بیان دیا ہے وہی مبنی بر سچ ہے۔" وہ ڈھٹائی سے بولا۔ "ممکن ہے گواہ منظور الٰہی کو مغالطہ ہوا ہو۔ وہ گولی چلنے کے کچھ دیر بعد گھر سے نکلا ہو۔"

میں نے سخت لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔ "منظور الٰہی کا دعویٰ ہے کہ وہ فائر کی آواز سنتے ہی گھر سے باہر نکل آیا تھا۔"

"اگر وہ یہ کہتا ہے تو صاف جھوٹ بولتا ہے۔" شمشاد خان نگاہیں چراتے ہوئے بولا۔

"بہت خوب۔" میں نے استہزائیہ انداز میں کہا، پھر جج کی جانب روئے سخن پھیرتے ہوئے اضافہ کیا۔ "جناب عالی! استغاثہ کا گواہ شمشاد خان، استغاثہ کے دیگر دو گواہان (منظور الٰہی اور نگہت پروین) کے بیان کو مبنی بر دروغ قرار دے رہا ہے۔ اس کا واضح مطلب یہ ہوا کہ ہر دو صورت میں کہیں نہ کہیں کوئی گڑبڑ موجود ہے۔ بہ الفاظ دیگر استغاثہ کی عمارت کی

اینٹیں یکے بعد دیگرے گرنے لگی ہیں۔ یا تو شمشاد خان حقائق کو چھپانے کی کوشش کر رہا ہے یا پھر منظور الٰہی اور نگہت پروین نے جھوٹ کا سہارا لیا ہے۔ اس سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ استغاثہ کے مذکورہ گواہان شہادت کے معیار پر پورے نہیں اترتے۔ لہٰذا معزز عدالت سے میری استدعا ہے کہ جھوٹے گواہوں کا نام استغاثہ کی فہرست سے خارج کر کے وکیل استغاثہ سے اس بارے میں باز پرس کی جائے۔ دیٹس آل یور آنر۔"

اس کے ساتھ ہی عدالت کا وقت ختم ہو گیا۔ جج نے پندرہ روز بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کر دی۔ ساتھ ہی مجھے ہدایت کی کہ آئندہ پیشی پر میں صفائی کے گواہوں کو بلوالوں۔"

میں نے فاتحانہ نظروں سے وکیل استغاثہ کی جانب دیکھا۔ اُس نے معاندانہ انداز میں مجھے گھورا اور چہرہ دوسری جانب پھیرلیا۔ میں نے ایک لمحے میں اُس کے چہرے پر لکھی ہوئی ناکامی کو واضح طور پر پڑھ لیا تھا۔

✡......✡
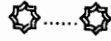
دو روز بعد شمشاد خان میرے دفتر میں آیا۔ وہ خاصے خوش گوار موڈ میں تھا۔ اُسے دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی تھی۔ استغاثہ کے گواہ عام طور پر مخالف پارٹی کے وکیل سے دُور ہی رہنے کی کوشش کرتے ہیں، شمشاد خان تو اس کیس میں ایک طرح سے مدعی کا کردار بھی ادا کر رہا تھا۔

رسمی کلمات کے بعد اُس نے کہا۔ "بیگ صاحب! آپ مجھے اپنے دفتر میں دیکھ کر حیران تو ہو رہے ہوں گے لیکن میں آپ کے پاس ایک تجویز لے کر آیا ہوں۔ مجھے اُمید ہے، آپ مجھ سے اتفاق کریں گے۔"

"اتفاق کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ تو میں آپ کی تجویز سننے کے بعد ہی کروں گا۔" میں نے غیر جذباتی لہجے میں کہا۔

وہ ایک دم سنجیدہ نظر آنے لگا۔ کچھ دیر تک وہ خیالوں میں ڈوبا رہا، پھر رازدارانہ انداز میں بولا۔ "بیگ صاحب، میرے بہنوئی جمشید علی نے جو کچھ بھی کیا ہے، بہت برا کیا ہے۔ اس کے باوجود بھی میں مصالحت کی کوئی راہ نکالنا چاہتا ہوں اسی لئے آپ کے پاس حاضر ہوا ہوں۔"

میں نے کوئی بات نہیں کی، خاموشی سے اُس کی جانب دیکھتا رہا۔ چند لمحوں کے توقف کے بعد وہ بولا۔ "بیگ صاحب! ملزم جمشید علی اگر پھانسی کے تختے پر بھی چڑھ جائے یا اُسے

قید تا حیات بھی ہو جائے تو بھی میری پیاری بہن زندہ نہیں ہو سکتی۔ میں آپ کے پاس تجویز لے کر آیا ہوں کہ اگر ملزم میری بہن کے قتل کا مناسب ''خون بہا'' ادا کر دے تو میں اس کیس سے دست بردار ہو جاؤں گا اور ہم مل جل کر اس معاملے کو رفع دفع کر دیں گے۔ میرا مطالبہ شریعت کے عین مطابق ہے۔ شریعت کی اصطلاح میں اسے ''دیت'' کہتے ہیں۔''

میں نے دل میں اُسے ایک ہزار گالیوں سے نوازا۔ وہ بدخصلت، کمینہ فطرت اسٹیٹ ایجنٹ اپنی مُردہ بہن کے پیسے کھرے کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اندرونی غصے کو ضبط کرتے ہوئے اُسے تھوڑا سا گھسنا چاہا۔ میں نے ایسا ظاہر کیا جیسے اُس کی بات مجھے معقول لگی ہو۔

''تجویز تو آپ کی خاصی وزنی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اب یہ بھی بتا دیں کہ آپ معاملہ رفع دفع کرنے کے لئے کتنی رقم لیں گے؟''

وہ سمجھا جیسے میں اُس کی چال میں آ گیا ہوں، سرگوشیانہ لہجے میں بولا۔ ''میرا خیال ہے، دس لاکھ روپے ٹھیک رہیں گے۔''

میں نے گویا پھسلتے ہوئے کہا۔ ''ہاں ٹھیک ہے، لیکن شمشاد صاحب مجھے اس کیس سے کیا فائدہ ہوگا؟ کیونکہ ایک تو مجھے تقریباً جیتے ہوئے کیس سے دستبردار ہونا پڑے گا، دوسرے آپ جانتے ہیں میرا مؤکل ابھی ملزم ہے، اُس پر جرم ثابت نہیں ہوا۔ آپ اس بات سے بھی بخوبی آگاہ ہیں کہ کیس پر میری گرفت کس درجے کی ہے؟''

''آپس کی بات ہے۔'' وہ خوشامدانہ انداز میں مسکرایا۔ ''اگر آپ ملزم کو دیت دینے پر تیار کر لیں تو اس رقم میں سے دس پرسنٹ آپ کا ہوگا۔''

میں اپنے غصے کو ضبط نہ کر سکا، سخت لہجے میں بولا۔ ''میں نے تو سنا تھا، تم پراپرٹی ایجنٹ ہو۔ مکانوں کی خرید و فروخت کا کام کرتے ہو۔ لیکن تمہاری باتوں سے میں نے اندازہ لگایا ہے کہ آج کل تمہارا کاروبار کچھ اچھا نہیں چل رہا ہے اس لئے تم نے مُردوں کی تجارت شروع کر دی ہے۔''

''آپ ناراض کیوں ہوتے ہیں بیگ صاحب۔'' وہ جھینپے ہوئے انداز میں بولا۔ ''یہ تو ایک تجویز تھی۔''

''بڑی گھٹیا تجویز تھی تمہاری۔'' میں نے نفرت آمیز لہجے میں کہا۔

وہ کچھ نہیں بولا، خاموشی سے اٹھا اور تیز قدموں سے چلتے ہوئے میرے دفتر سے نکل گیا۔ میں اُس کی شیطانی ذہنیت پر افسردگی سے سر ہلا کر رہ گیا۔ اس کے سوا میں اور کر بھی کیا سکتا تھا۔

☆......☆
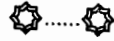
آئندہ دو پیشیوں پر کوئی قابل ذکر کارروائی نہ ہو سکی۔

ایک مرتبہ تو وکیل سرکار نے اپنی بیماری کا سرٹیفکیٹ بھیج دیا اور دوسری دفعہ جج غیر حاضر تھا۔ چنانچہ تیسری پیشی پر پہلے ملزم کا بیان ہوا۔ وکیل سرکار نے اپنے تئیں سخت ترین جرح کی لیکن وہ میرے مؤکل کو ہراساں نہ کر سکا اور نہ ہی اپنے مطلب کی کوئی بات اُگلوا سکا جو اُس کے لئے مفید ثابت ہوتی۔ پھر عدالت کا وقت ختم ہو گیا۔ آئندہ پیشی پر صفائی کے گواہان نے بیان دیا جن میں نیلم اور جمیلہ خاتون کا بیان آپس میں خاصی حد تک مماثلت رکھتا تھا اور وہ میرے مؤکل کے حق میں جاتا تھا۔ اس میں وہ تمام حقائق شامل تھے جو ملزم جمشید علی نے مجھے تھانے میں بتائے تھے اس لئے یہاں دوبارہ ان کا ذکر کرنا مناسب نہ ہوگا۔ وکیل سرکار، جمیلہ خاتون اور نیلم سے بھی کوئی ایسی بات نہ اُگلوا سکا جو اُس کے لئے مفید ثابت ہوتی۔

صفائی کا اگلا گواہ ثالثی کونسل کا چیئرمین تھا۔ اُس نے اس بات کی تصدیق کی کہ ملزم اپنی بیوی کو طلاق دے چکا تھا اور یہ کہ ثالثی کونسل کی جانب سے فریقین کو سمن جاری کر دیئے گئے تھے جو انہوں نے وصول بھی کر لئے تھے۔ اُس نے جوابِ دعویٰ میں طلاق نامے والی رجسٹری کی نقل بھی منسلک کر دی تھی۔ وہ رجسٹری مرحومہ صادقہ بیگم نے وصول نہیں کی تھی۔

صفائی کا آخری گواہ ڈاکٹر ندیم ہاشمی تھا۔ اُس نے سچ بولنے کا حلف اٹھانے کے بعد متوفیہ کے آخری کلمات عدالت کے روبرو دُہرائے اور تصدیق کر دی۔

وکیل سرکار نے سرسری طور پر چند سوالات کئے اور اپنی جگہ پر جا کر بیٹھ گیا۔ اُس کا سارا جوش و خروش غائب ہو چکا تھا۔ جج صورت حال کو اچھی طرح سمجھ چکا تھا اور حقائق کی تہ تک بھی پہنچ چکا تھا۔ آخر میں، میں اپنے مؤکل کے حق میں دلائل دینے کے لئے کھڑا ہوا اور روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے اپنے دلائل کا آغاز کیا۔

''جنابِ عالی!'' میں نے کھنکھار کر گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔ ''ساری صورتِ حال روزِ روشن کی طرح عیاں ہو چکی ہے۔ اب اس بات میں کسی شک و شبے کی گنجائش نہیں رہی کہ میرے مؤکل کو خواہ مخواہ ایک سنگین جرم میں پھانسنے کی کوشش کی گئی ہے۔''

ایک لمحے کے توقف سے میں نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''جنابِ عالی! میرا مؤکل اپنی بدزبان بیوی کی بے ہودگیوں سے اس قدر عاجز تھا کہ اُس نے بحالت مجبوری دوسری شادی کا فیصلہ کر لیا۔ اس سلسلے میں اس نے قانونی راہ اختیار کی اور اپنی بیوی سے عقد ثانی کی اجازت لینا چاہی لیکن اُس نے نہ صرف یہ کہ ایسی اجازت

دینے سے شدت سے انکار کیا بلکہ گھر میں ایک فساد برپا کر دیا۔ وہ اپنے بچوں کو میرے مؤکل کی جانب سے اس قدر باغی کر چکی تھی کہ وہ باپ کی صورت سے نفرت کرنے لگے تھے۔ ازیں علاوہ وہ اکثر و بیشتر اپنی ساس کی بھی بے عزتی کرتی رہی تھی۔ جب میرے مؤکل نے دیکھا کہ پانی سر سے اونچا ہو رہا ہے تو اس نے ایک حتمی فیصلہ کر لیا۔ یہ فیصلہ صادقہ بیگم جیسی سازشی، فتنہ پرور، فسادی اور بدکلام بیوی سے نجات حاصل کرنے کا فیصلہ تھا۔ میرے مؤکل نے میرے توسط سے اپنی بیوی کے نام طلاق نامہ مع کراس چیک برائے حق مہر بذریعہ رجسٹری ڈاک روانہ کر دیا جو متوفیہ صادقہ بیگم نے وصول نہیں کیا۔ جواب دعویٰ میں مذکورہ رجسٹری کی نقل اور لفافہ موجود ہے جس پر ڈاکیئے کے ہاتھ کا لکھا ہوا نوٹ بھی موجود ہے...... مکتوب الیہ رجسٹری وصول کرنے سے انکاری ہے...... یہ رجسٹری مورخہ دو جولائی کو روانہ کی گئی جو مذکورہ بالا نوٹ کے ساتھ چھ جولائی کو واپس آ گئی۔ اس رجسٹری کی ایک نقل ثالثی کونسل کو بھی روانہ کی گئی تھی جس کی تصدیق صفائی کے گواہ ثالثی کونسل کے چیئرمین معزز عدالت کے روبرو کر چکے ہیں۔“

میں نے تھوک نگل کر حلق تر کیا، پھر سلسلۂ کلام کو جوڑتے ہوئے کہا۔ ”یور آنر! وقوعہ کے روز میرا مؤکل اپنی سیکرٹری نیلم کو اپنی والدہ سے ملوانے لایا تھا کیونکہ وہ نیلم سے شادی کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ گھریلو ملازمہ نگہت پروین کی زبانی متوفیہ صادقہ بیگم کو جب نیلم کی آمد اور مقصد کا علم ہوا تو وہ آپے سے باہر ہو گئی۔ اُس نے اپنے لباس میں ایک ریوالور چھپایا اور اس کمرے میں پہنچ گئی جہاں میرا مؤکل اپنی والدہ جمیلہ خاتون اور سیکرٹری نیلم کے ساتھ موجود تھا۔ متوفیہ نے وہاں پہنچ کر پہلے تو میرے مؤکل سے جھگڑا کیا پھر جب میرے مؤکل اور اُس کی سیکرٹری نیلم نے بہ بانگ دہل اقرار کر لیا کہ وہ شادی کرنے جا رہے ہیں تو متوفیہ کو اپنے غصے پر قابو نہ رہا اور اُس نے اپنے لباس میں سے ریوالور نکال کر نیلم پر تان لیا اور اُسے قتل کی دھمکی دی تھی۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ اپنی دھمکی پر عمل کر پاتی، میرے مؤکل نے اس کے ریوالور والے ہاتھ پر اپنا ہاتھ ڈال دیا۔ نتیجے کے طور پر ریوالور کا ٹریگر دب گیا۔ متوفیہ کی بدقسمتی کہ جس وقت گولی چلی، ریوالور کی نال اُس کے پیٹ کی جانب تھی۔ لہٰذا گولی اُس کے پیٹ میں داخل ہو کر اُس کے گردے کو ضررِ شدید پہنچانے کا سبب بنی جو ازاں بعد اس کی موت کا وسیلہ بن گئی۔ متوفیہ نے اپنی زندگی کے آخری لمحات میں کراہتے ہوئے جو جملے ادا کیئے وہ وہی جملے تھے جو زخمی ہونے سے پہلے اُس نے نیلم پر حملہ آور ہوتے وقت اپنی زبان سے ادا کیئے تھے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر ندیم ہاشمی کی گواہی معزز عدالت کے ریکارڈ پر موجود

ہے۔ متوفیہ کے مذکورہ کلمات اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ وہ اپنے شوہر کی سیکرٹری کو قتل کرنے کا ارادہ رکھتی تھی۔ متوفیہ کے دھمکی آمیز جملے کچھ یوں تھے...... جمشید، اس چھنال کی خاطر تم مجھے طلاق دینا چاہتے ہو نا۔ لو، سب سے پہلے میں اسی کی لاش گراتی ہوں۔ مرنے کے لئے تیار ہو جاؤ کمینی عورت!......

جناب عالی! اب تک جو حقائق سامنے آئے ہیں ان سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ کسی بھی مرحلے پر میرے مؤکل نے متوفیہ صادقہ بیگم پر حملہ آور ہونے کی کوشش نہیں کی بلکہ صادقہ بیگم کو پیش آنے والا واقعہ ایک اتفاقی حادثہ تھا۔“

میں نے ذرا توقف کر کے حاضرین عدالت پر ایک سرسری نگاہ دوڑائی۔ سب کی نظریں مجھ پر لگی ہوئی تھیں۔ جج بھی گہری دلچسپی سے میرے دلائل سن رہا تھا۔

میں نے اپنے دلائل جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”جناب عالی! پولیس نے میرے مؤکل پر جو دفعات عائد کی ہیں ان کا سرے سے کوئی جواز ہی نہیں بنتا۔ دفعات تین سو سات، تین سو پچیس اور تین سو چھبیس کا استعمال مذکورہ کیس میں مضحکہ خیز ہے، جبکہ یہ سیدھا سیدھا تعزیراتِ پاکستان کی دفعہ اکیاسی کا کیس بنتا ہے۔“ پھر میں نے دفعہ اکیاسی کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”کوئی امر صرف اس وجہ سے جرم نہیں ہے کہ یہ جان کر کیا جا رہا ہے کہ اس سے کوئی ضرر پہنچنے کا احتمال ہے۔ اگر اس امر کے ارتکاب سے ضرر پہنچانے کی کوئی نیت مجرمانہ ہو اور دوسرے شخص یا مالی ضرر کو روکنے یا بچانے کی غرض سے نیک نیتی سے اس کا ارتکاب کیا جائے تو یہ امر درگزر کے قابل ہو سکتا ہے۔“

ایک لمحے کو رُک کر میں نے جج کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”جناب عالی! میرے مؤکل کا متوفیہ کے ریوالور والے ہاتھ پر جھپٹا مارنا اس امر کی دلالت کرتا ہے کہ وہ نیک نیت تھا اور وہ نیلم کو جانی ضرر پہنچنے سے بچانا چاہتا تھا۔ لہٰذا حالات و واقعات اور شواہد کی روشنی میں معزز عدالت سے میری استدعا ہے کہ میرے مؤکل کو باعزت بری کرنے کے احکامات جاری کیئے جائیں۔ ویٹس آل، یور آنر۔“

جج کافی دیر تک اپنے سامنے میز پر پھیلے ہوئے کاغذات کو اُلٹ پلٹ کر دیکھتا رہا۔ پھر وہ اٹھ کر اپنے چیمبر میں چلا گیا۔ آدھے گھنٹے کے بعد وہ دوبارہ کرسی پر آ کر براجمان ہوا اور ایک ہفتے بعد فیصلے کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کر دی۔

✡......✡
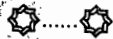
آئندہ پیشی پر عدالت نے میرے مؤکل کے حق میں فیصلہ سنا دیا۔

اسی شام جمشید علی نیلم کے ساتھ میرے دفتر میں آیا۔ آصف اور نازیہ بھی ان کے ہمراہ تھے۔ واضح رہے کہ دونوں بچے اس کیس کی عدالتی کارروائی کے دوران میں باقاعدگی سے عدالت کے کمرے میں موجود رہتے تھے۔ سماعت کے دوران میں تیزی سے بدلتی ہوئی صورتِ حال نے انہیں خاصا متاثر کیا تھا۔ آہستہ آہستہ حقیقت اُن کی نگاہوں میں عیاں ہوتی چلی گئی تھی اور جب یہ کیس اپنے آخری مراحل میں تھا تو اُن کے دل پوری طرح جمشید علی کی جانب پھر چکے تھے۔ صادقہ بیگم کی خود غرضی و زیادتی اور مفاد پرست و کمینہ خصلت ماموں شمشاد احمد کا مکروہ چہرہ اُن کے سامنے بے نقاب ہو چکا تھا۔ بچوں کو اپنے باپ کے ساتھ دیکھ کر مجھے بے پناہ مسرت کا احساس ہوا تھا۔

جمشید علی نے کہا۔ ”ابھی تو ہم صرف آپ کا شکریہ ادا کرنے آئے ہیں۔ لیکن عنقریب ہی میں آپ کو اپنی شادی کا دعوت نامہ دینے آؤں گا اور آپ کی شمولیت میرے لئے باعث افتخار ہو گی۔“

میں نے نیلم کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میری دُعا ہے کہ آپ کی ہونے والی نصف بہتر آپ کے لئے مثالی بیوی ثابت ہو۔“

”انشاء اللہ ایسا ہی ہوگا۔“ نیلم نے تیقن سے کہا۔

وہ مزید تھوڑی دیر بیٹھ کر رخصت ہو گئے۔ ازاں بعد میں نے حسب وعدہ اُن کی شادی میں شرکت کی۔ اس کے بعد بھی کافی عرصے تک اُن سے گاہے بگاہے ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ میں نے ہمیشہ انہیں خوش وخرم اور ایک دوسرے کی محبت میں مخمور پایا۔

قدرت کے کام بھی بڑے نرالے ہوتے ہیں۔ اس کی مصلحتوں کو سمجھنا آسان نہیں۔ اُس کے نوازنے کا اپنا ایک انوکھا طریقہ کار ہے۔ جمشید علی نے ازدواجی زندگی کا ایک طویل عرصہ اپنی نصف بدتر کے ساتھ جس اذیت میں گزارا تھا، نیلم اس ”ریاضت“ کا انعام تھی۔

نیلم اور جمشید کی پُر بہار وخوش وخرم ازدواجی زندگی کو دیکھ کر اس بات پر میرا ایمان پختہ ہو گیا کہ خدا کے ہاں دیر ہے، اندھیر نہیں۔

سفید خون

وہ کسی شاعر کا خواب لگتی تھی!

منگل کی شام وہ میرے دفتر میں داخل ہوئی تو اُس کے سراپا سے کمرا جگمگا اُٹھا۔ میں نے اپنی زندگی میں اتنی خوب صورت عورت پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ بلاشبہ وہ مرقع حسن تھی...... لیکن اس وقت اُس کا چہرہ فکر و تردد کی دبیز بدلیوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔

میں نے پیشہ ورانہ مسکراہٹ سے اُس کا استقبال کیا اور بیٹھنے کے لئے کہا۔ رسمی علیک سلیک کے بعد میں نے اُس کی آمد کی غرض و غایت دریافت کی۔

”آپ مرزا امجد بیگ ایڈووکیٹ ہیں؟“ اُس نے سنجیدہ لہجے میں استفسار کیا۔

لہجے کی تمام تر سنجیدگی کے باوجود بھی یوں محسوس ہوا جیسے جلترنگ بج اٹھے ہوں۔ اُس کی مترنم آواز مدھر گھنٹیوں کی مانند گونجی اور میرے کمرے کے در و دیوار میں جذب ہو گئی۔

”جی ہاں، میرا نام مرزا امجد بیگ ایڈووکیٹ ہے۔“ میں نے شائستہ لہجے میں اُس کے سوال کا جواب دیا۔ پھر پوچھا۔ ”فرمائیے، میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟“

”مجھے بیگم کے ڈی خان نے آپ کے پاس بھیجا ہے۔“ اُس نے اپنے پرس سے ایک وزیٹنگ کارڈ نکال کر میری جانب بڑھا دیا۔

میں نے ایک اچٹتی سی نظر کارڈ پر ڈالی اور اُسے اپنے سامنے میز پر رکھ دیا۔ بیگم کے ڈی (خلیق داد) خان ایک معروف سماجی کارکن تھیں۔ وہ فلاحی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی تھیں۔ انہوں نے حقوقِ نسواں کی ایک انجمن بھی بنا رکھی تھی۔ خاص طور پر بے آسرا و بے سہارا عورتوں، بیواؤں اور مستحق وستم رسیدہ عورتوں کی ممکنہ حد تک مدد کرنا اُن کی زندگی کی ترجیحات میں شامل تھا۔

میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھنے لگا۔ میرے اندازے کے مطابق اُس کی عمر چھتیس سینتیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔ اُس نے موسم کی مناسبت سے ہلکے رنگ کا صاف ستھرا لباس زیب تن کر رکھا تھا۔ اپنے تمام تر جادوئی حسن کے باوجود بھی اندرونی پریشانی، ویرانی بن کر اُس کے چہرے پر رقص کر رہی تھی۔

میری سوالیہ نظروں کو فوری طور پر اُس نے بھانپ لیا اور پرس میں کچھ تلاش کرنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد اُس نے پرس میں سے ایک لفافہ برآمد کیا اور میری جانب بڑھا دیا۔ میں نے لفافہ کھول کر دیکھا۔ اُس میں ایک تہ شدہ خط تھا جو میرے نام تھا اور بیگم کے ڈی خان نے تحریر کیا تھا۔ نفسِ مضمون کچھ یوں تھا۔

''بیگ صاحب! سلام مسنون۔

میں حور بانو کو آپ کے پاس بھیج رہی ہوں۔ بے چاری بڑی دُکھی اور مصیبت زدہ ہے۔ مالک مکان نے اس کا جینا دوبھر کر رکھا ہے۔ اسے قانونی مدد کی ضرورت ہے اور میرے خیال میں آپ سے زیادہ موزوں مددگار اور کون ہوسکتا ہے۔ مجھے حور بانو کے معاملات کی تفصیل معلوم نہیں ہے اس لئے براہِ راست آپ کے پاس بھیجا ہے۔ اور ہاں...... اپنی فیس کے بارے میں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ چیریٹی کیس نہیں ہے۔ آپ کی فیس میری انجمن کے اکاؤنٹ سے ادا کی جائے گی۔ ویسے مجھے اُمید ہے کہ آپ ممکنہ حد تک فیس میں رعایت کریں گے۔ یہ کارِثواب بھی ہے۔

فقط بیگم کے ڈی خان۔''

میں نے خط ختم کرنے کے بعد اپنے سامنے بیٹھی ہوئی حور بانو کو دیکھا، وہ واقعی حور شمائل تھی۔ اسم بامسمّٰی کا ایسا شاہکار پہلے کبھی میری نظر سے نہیں گزرا تھا۔ وہ بالکل خاموش تھی اور اُس کی بولتی ہوئی سُرمگیں نگاہیں امداد طلب نظروں سے میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ بیک وقت وہ مجھے اچھی بھی لگی اور مجھے اُس پر ترس بھی آیا۔

میں نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور پوچھا۔ ''حور بانو صاحبہ! فرمائیں، کیا مسئلہ ہے آپ کا؟''

''میری قسمت خراب ہوگئی ہے۔'' وہ افسردہ لہجے میں بولی۔

میں نے کہا۔ ''قسمت بنانے اور بگاڑنے والا اوپر بیٹھا ہے۔ میرے لائق کوئی خدمت ہو تو بتائیں۔'' پھر میں نے بیگم کے ڈی خان کے خط کا حوالہ دیتے ہوئے کہا۔ ''بیگم صاحبہ نے لکھا ہے کہ آپ کے مالک مکان نے آپ کو پریشان کر رکھا ہے۔ یہ کیا معاملہ ہے؟''

وہ ایک ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے بولی۔ ''میں نے عرض کیا نا، میری قسمت خراب ہوگئی ہے۔''

پھر اُس نے پرس میں سے ایک نوٹس نکال کر مجھے دکھایا۔ وہ نوٹس مالک مکان رجب علی کی جانب سے حور بانو کو بھیجا گیا تھا جس کے مطابق حور بانو کو ایک ماہ کے اندر وہ مکان خالی

کرنے کی ہدایت کی گئی تھی۔

میں نے پوچھا۔ ''کیا یہ سچ ہے کہ رجب علی اپنا مکان فروخت کرنا چاہتا ہے؟''

اس نوٹس میں مکان خالی کروانے کی وجہ مکان کی فروخت بتائی گئی تھی۔ یہ کوئی تعجب خیز بات نہیں تھی۔ اکثر مکان دار، کرائے داروں سے گھر خالی کروانے کے لئے اس قسم کی چالیں چلتے ہیں۔ بعض اوقات کرایہ بڑھانے کے لئے ایسے ہتھکنڈے استعمال کئے جاتے ہیں۔

حور بانو نے جواب دیا۔ ''میرا خیال ہے، رجب علی جھوٹ بول رہا ہے۔ اُس کا مکان فروخت کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ وہ محض ہم سے مکان خالی کروانا چاہتا ہے۔ جبکہ پہلے اُس نے وعدہ کیا تھا کہ ہم جب تک چاہیں، اس گھر میں رہیں۔ وہ ہمیں کبھی بے دخل نہیں کرے گا اور نہ ہی ہم سے کرایہ لے گا۔ لیکن کچھ عرصہ بعد ہی اُس نے کرائے کا مطالبہ شروع کر دیا۔ میں کسی نہ کسی طرح محنت مزدوری کر کے کرائے کی رقم اُس کی ہتھیلی پر رکھتی رہی۔ مگر اب تو وہ ہمیں مکان سے نکالنے پر تلا ہوا ہے۔ سنا تھا، لوگوں کا خون سفید ہو جاتا ہے۔ اب اپنی آنکھوں سے بھی دیکھ لیا ہے۔''

اُس کی غزالی آنکھوں میں آنسوؤں کی چمک نمودار ہوگئی۔ اُس کا آخری جملہ سن کر میں چونک اُٹھا تھا۔ میں نے جلدی سے سوال کیا۔

''کیا مالک مکان، رجب علی آپ کا رشتے دار ہے؟''

وہ نم ناک لہجے میں بولی۔ ''رجب علی میرا دیور ہے۔''

''آپ کا شوہر کہاں ہے؟''

حور بانو کے چہرے پر غم و اندوہ کا طوفان سا آ کر گزر گیا۔ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ''اگر شجاعت علی زندہ ہوتا تو آج میں اپنے تین معصوم بچوں کے ساتھ اپنے ہی گھر میں کرائے دار کی حیثیت سے نہ رہ رہی ہوتی۔''

شاید وہ مجھے حیران کرنے کا ارادہ باندھ کر اپنے گھر سے نکلی تھی۔ میں نے اُلجھن آمیز لہجے میں پوچھا۔ ''میں آپ کی بات کا مطلب نہیں سمجھا۔ آپ اپنے ہی گھر میں کرائے دار کی حیثیت سے کس طرح رہ رہی ہیں۔ کیا آپ یہ کہنا چاہتی ہیں کہ جس گھر کو خالی کرنے کا نوٹس آپ کو ملا ہے وہ گھر آپ کی ملکیت ہے؟''

''ملکیت تھا!'' وہ خواب ناک لہجے میں بولی۔ ''اب تو اس کا مالک رجب علی ہے لیکن اس ظالم کو یہ تو سوچنا چاہئے کہ اُس کی بھابھی اور تین پھولوں ایسے بھتیجے بھتیجیاں کس در کی خاک چھانیں گے۔ ہم پہلے ہی کیا کم دُکھی ہیں جو وہ یہ ستم ڈھانے چلا ہے۔''

میں نے پوچھا۔ ''حور بانو صاحبہ! کیا آپ یہ کہنا چاہتی ہیں کہ مذکورہ مکان پہلے آپ کی ملکیت تھا جو بعدازاں آپ کے دیور رجب علی نے آپ سے خرید لیا تھا؟''

''خریدنے کے بجائے ''ہتھیانا'' زیادہ مناسب لفظ ہوگا۔'' وہ نفرت آمیز لہجے میں بولی۔ ''پہلے تو مجھے شک تھا لیکن اب یقین ہو گیا ہے کہ میرے شوہر کے ساتھ جو کچھ پیش آیا اس میں رجب علی کا ہی ہاتھ تھا۔ وہ میرے شوہر شجاعت علی کی موت کا بھی ذمہ دار ہے۔ جوان بیٹی کے اغواء کا صدمہ کوئی معمولی بات نہیں ہوتی۔ شجاعت علی نے ایمان داری و دیانت داری کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا رکھا تھا۔ اس سے ایک پائی کے ہیر پھیر کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی کجا یہ کہ ڈیڑھ لاکھ روپے کا غبن۔ سب کچھ رجب علی کا کیا دھرا تھا۔ اس وقت تو میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ یہ احسان فراموش جس تھالی میں کھاتا ہے، اسے ہی چھید ڈالے گا۔ بھائی نے اس کے ساتھ کتنا اچھا سلوک کیا اور اس ناہنجار، بدفطرت، کمینہ خصلت شخص نے اسی عظیم بھائی کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے پہنچا دیا۔''

حور بانو کا طویل اور بے ربط بیان میں نے اپنے مزاج کے خلاف بڑے صبر وتحمل سے سنا۔ حالانکہ اُس کی اُلجھی ہوئی باتوں سے میرے پلے کچھ نہیں پڑا تھا لیکن میں نے اپنی عادت کے مطابق اُسے بیچ میں نہیں ٹوکا اور اُس کی بات مکمل ہونے تک خاموش بیٹھا رہا۔ کہتے ہیں، بانسری کی آواز میں درد اس لئے ہے کہ ایک روز اُسے درخت سے جدا کر دیا گیا تھا۔ حور بانو کی آواز سن کر میرے دل میں ہمدردی کے جذبات جاگ اُٹھے تھے۔ شاید اس کی یہ کیفیت شوہر کی جدائی کے سبب تھی۔

میں نے کہا۔ ''خاتون، آپ نے ابھی تک اپنے بارے میں مجھے جو کچھ بھی بتایا ہے وہ خاصا گنجلک ہے۔ ان آدھی ادھوری معلومات کی روشنی میں میرے لئے یہ فیصلہ کرنا دُشوار ہے کہ میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں۔ بہتر ہوگا کہ آپ مجھے ساری تفصیلات مرحلہ وار بتائیں۔ جب تک میں آپ کو پیش آمدہ حالات سے پوری طرح آگاہ نہ ہو جاؤں، میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکوں گا۔''

حور بانو نے ایک طویل سرد آہ خارج کرتے ہوئے، حواس مختل کر دینے والی نظروں سے مجھے دیکھا پھر جگر پاش آواز میں بولی۔ ''ٹھیک ہے وکیل صاحب، میں آپ کو اپنی دُکھ بھری کہانی پوری تفصیل کے ساتھ سناتی ہوں۔''

چند لمحوں تک خاموش رہ کر وہ خلاؤں میں گھورتی رہی۔ شاید اپنے خیالات کو مجتمع کر رہی تھی۔ پھر اُس نے ٹھہری ہوئی آواز میں بولنا شروع کیا۔ میں نے رف پیڈ اور قلم سنبھال لیا

اور پورے انہماک سے اُس کی داستان سننے لگا۔

میں حور بانو کی طولانی الم ناک داستان کا خلاصہ آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔

ساٹھ کی دہائی تک حور بانو کے لئے راوی چین ہی چین لکھ رہا تھا۔ مگر جب ستر کے عشرے کا آغاز ہوا تو اُس کی جمی جمائی زندگی میں پہلی بار ہلچل ہوئی۔ اس منفی تبدیلی کی وجہ اُس کے سسر طیب حسین کا انتقال تھا۔

طیب حسین جب تک زندہ رہا، اس گھر کا شیرازہ قائم و دائم رہا۔ حور بانو کو اللہ نے ہر نعمت سے نواز رکھا تھا۔ محبت کرنے والا شوہر اور تین نہایت تمیزدار اولادیں۔ اُس کی بڑی بیٹی اس وقت لگ بھگ بارہ سال کی تھی۔ فوزیہ سے چھوٹے دو بیٹے تھے، کاشف اور عمران۔ کاشف کی عمر آٹھ سال اور عمران کی کم و بیش چھ سال تھی۔

طیب حسین کی زندگی میں سب لوگ مل جل کر رہتے تھے۔ طیب حسین نے اپنی محنت سے تیں گز کے پلاٹ پر ایک دو منزلہ مکان تعمیر کروایا تھا۔ اُس کی دو ہی اولادیں تھیں یعنی بڑا بیٹا شجاعت علی اور چھوٹا بیٹا رجب علی۔ وہ خود ریٹائرڈ زندگی گزار رہا تھا۔ بیٹوں کے لئے اُس نے سر چھپانے کا ٹھکانا کرنے کے ساتھ ساتھ اُن کی شادی بھی کر دی تھی۔ چھوٹے بیٹے رجب علی کی شادی کو ابھی ایک سال بھی نہیں ہوا تھا۔ اُس کی بیوی شاہدہ پروین، حور بانو کے بالعکس تنک مزاج اور زبان کی تیز تھی۔ وہ حسن و خوب صورتی میں حور بانو کا پاسنگ بھی نہیں تھی۔ مگر اپنی دانست میں خود کو بڑی چیز سمجھتی تھی۔

رجب علی اپنی بیوی شاہدہ کے ساتھ مکان کی زیریں منزل پر رہائش پذیر تھا جبکہ شجاعت علی اپنے بیوی بچوں اور والدین کے ساتھ بالائی منزل پر رہتا تھا۔ حور بانو چونکہ خوش مزاج اور خدمت کرنے والی عورت تھی اس لئے طیب حسین اور اُس کی بیوی خورشید بیگم بڑی بہو کے ساتھ رہنے کو ترجیح دیتے تھے۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ حور بانو کے تین بچے بھی تھے اور بوڑھے بڑھیا کی ان بچوں میں جان تھی۔ پھر شاید وہ ایک خود پسند اور نک چڑھی عورت تھی اس لئے بھی اُن کی چھوٹی بہو سے زیادہ نہیں بنتی تھی۔

الختصر، طیب حسین کی وفات کے بعد گھر میں ایک فساد اُٹھ کھڑا ہوا۔ رجب علی شروع ہی سے شجاعت علی سے جلتا تھا اور موقع بے موقع اُس کے لئے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کرتا رہتا تھا۔ اُس کو یہ وہم ہو گیا تھا کہ والدین شجاعت علی سے زیادہ محبت کرتے ہیں اور اُسے کوئی خاص اہمیت نہیں دیتے۔ شجاعت علی، رجب علی سے لگ بھگ پندرہ سال بڑا تھا۔ رجب علی نے کبھی اسے بڑے بھائی کا احترام نہیں دیا تھا جبکہ اس کے باوجود بھی وہ اپنے چھوٹے بھائی

سے محبت کرتا تھا۔ شجاعت علی ایک ٹریڈنگ کمپنی میں اکاؤنٹنٹ کی حیثیت سے کام کرتا تھا جبکہ رجب علی نے نہ پڑھ کر دیا تھا اور نہ ہی کوئی ڈھنگ کا کام سیکھا تھا۔ وہ ایک بسکٹ فیکٹری میں کام کرتا تھا۔

شادی کے بعد رجب علی کا رویہ والدین کے ساتھ بھی خراب سے خراب تر ہوتا چلا گیا۔ اُس کا خیال تھا کہ وہ حور بانو کی بہ نسبت شاہدہ کو کم تر سمجھتے ہیں جبکہ اس بات میں کوئی حقیقت نہیں تھی۔ وہ شاہدہ کے مزاج کے پیش نظر اُس سے کتراتے تھے۔ اس صورتِ حال میں شاہدہ نے بھی شوہر کے کان بھرے اور وہ باپ کے انتقال کے بعد مکان کے بٹوارے پر کمر بستہ ہو گیا۔

شجاعت علی کو چھوٹے بھائی کے عزائم سے دھچکا لگا۔ اُس نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''رجب، یہ تم کیسی باتیں کر رہے ہو۔ ایک ساتھ رہنے میں ہی ہماری بھلائی ہے۔''

''میں اپنا برا بھلا خوب سمجھتا ہوں۔'' رجب علی نے اُکھڑے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ''تم مجھے کیا سمجھاؤ گے؟''

رجب علی کو کبھی توفیق نہیں ہوئی تھی کہ وہ بڑے بھائی کو ''آپ'' کہہ کر مخاطب کرتا۔ ''تم'' سننا تو شجاعت علی کے معمول میں داخل تھا۔ لیکن رجب علی جس انداز میں آج بات کر رہا تھا وہ اُسے سخت ناگوار گزرا تھا۔

شجاعت علی نے غصے کو ضبط کرتے ہوئے کہا۔ ''رجب، تمہارے لہجے نے مجھے بہت دُکھ پہنچایا ہے۔ ابا جی کی وفات کے بعد آخر تمہیں ہو کیا گیا ہے؟''

''میری آنکھیں کھل گئی ہیں۔'' وہ ترکی بہ ترکی بولا۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟''

''تم مطلب کو چھوڑو شجاعت علی۔'' رجب علی نے ڈھٹائی سے کہا۔ ''جلد از جلد مکان کا معاملہ نمٹانے کی کوشش کرو۔''

''آخر تم چاہتے کیا ہو؟'' شجاعت علی نے پوچھا۔

وہ بولا۔ ''میں نے کوئی زیادہ پیچیدہ بات تو نہیں کہہ دی۔ ہم ابا جی کی دو اولادیں ہیں۔ ان کی وفات کے بعد سب کچھ ہم دونوں کا ہے۔ مجھے میرا حصہ چاہئے۔''

''تم امی جی کو کیوں بھول رہے ہو؟'' شجاعت علی نے معتدل لہجے میں کہا۔ ''ابا جی کی وفات کے بعد ان کی ہر چیز کی مالک و مختار امی جی ہیں۔ میں مکان میں سے تمہیں کوئی حصہ کیسے دے سکتا ہوں۔''

رجب علی نے بیزاری سے کہا۔ ''یہ ساری باتیں میں نہیں جانتا۔''

''جائیداد کے بٹوارے کی پٹی تمہیں شاہدہ نے پڑھائی ہے؟'' شجاعت علی نے چبھتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

''شاہدہ کا ذکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' رجب علی نے بڑے بھائی کو گھورا۔ ''اُس کا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔''

''بہت خوب!'' وہ طنزیہ انداز میں مسکرایا۔

''میں جانتا ہوں، تمہاری بیوی، شاہدہ کے خلاف امی ابا کے کان بھرتی رہتی تھی۔'' رجب علی نے حور بانو کے لئے اپنی نفرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''اسی لئے وہ ہمیشہ شاہدہ کے خلاف رہے ہیں۔''

شجاعت علی نے کہا۔ ''یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔''

''بہرحال، یہ میری غلط فہمی ہے یا تمہاری خوش فہمی، مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں ہے۔'' رجب علی نے بے مروتی سے کہا۔ ''میں اور میری بیوی برے ہیں، ہمیں برے ہی رہنے دو۔ ہم دونوں آپ اچھے لوگوں کو چھوڑ کر کہیں چلے جائیں گے۔''

''کہاں چلے جاؤ گے تم؟'' شجاعت علی نے چونک کر پوچھا۔

رجب علی نے کہا۔ ''خدا کی دنیا بہت بڑی ہے۔ تمہیں ہمارے بارے میں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔''

فکر مند تو وہ ہو چکا تھا۔ رجب علی نے آج جن خیالات کا اظہار کیا تھا ان سے شجاعت علی کو بہت اذیت پہنچی تھی۔ اُس نے رات میں اپنی والدہ خورشید بیگم سے ذکر کیا۔ وہ بھی پریشان ہو گئی۔ وہ شوہر کی جدائی کے صدمے کو ابھی پوری طرح برداشت نہیں کر پائی تھی کہ ایک نیا فتنہ اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اُس نے بھی اپنے تئیں رجب علی کو سمجھانے کی بہت کوشش کی مگر رجب علی کی سوئی ایک ہی جگہ اٹک کر رہ گئی تھی۔

دو ماہ تک دونوں بھائیوں میں سرد جنگ جاری رہی۔ خورشید بیگم بھی رجب علی کو سمجھاتے سمجھاتے تھک گئی۔ تیسرے مہینے رجب علی اور اُس کی بیوی اوچھے ہتھکنڈوں پر اتر آئے۔ شاہدہ نے لڑائی جھگڑے شروع کر دیئے اور رجب علی نے کسی پراپرٹی ڈیلر سے مکان کی فروخت کی بات کر لی اور وہ آئے روز کسی نہ کسی گاہک کو لے کر آ دھمکتا۔ اس صورتِ حال اور بھائیوں کی نااتفاقی نے خورشید بیگم کو ایسا دلی صدمہ پہنچایا کہ وہ ایک ماہ کے اندر اندر اپنے شوہر سے جا ملی۔

طیب حسین کی موت کے بعد پیدا ہونے والے خانگی مسائل کو خورشید بیگم کی موت نے حل کر دیا۔ اس طرح رجب علی کی خواہش کی تکمیل آسان ہوگئی۔ اب شجاعت علی کے پاس اُس کی بات ماننے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ وہ جس حد تک چھوٹے بھائی کو ایک ساتھ رہنے کے فوائد اور الگ الگ رہنے کے نقصانات کے بارے میں نشیب و فراز سمجھا سکتا تھا، سمجھا چکا تھا مگر رجب علی ہر حال میں اپنا حصہ لے کر علیحدہ ہو جانا چاہتا تھا۔

بحالت مجبوری دو تین پراپرٹی ایجنٹس سے مکان کی قیمت کا اندازہ لگوایا گیا جو کم و بیش تین لاکھ تھا۔ واضح رہے کہ یہ قیمت اُنیس سو ستر عیسوی کی ہے۔ آج کل تو اسّی گز پر بنے ہوئے دو منزلہ مکان کی قیمت آٹھ لاکھ سے کم کیا ہوگی۔ ممکن ہے اس سے بھی زیادہ ہو۔

شجاعت علی نے ایک دانش مندانہ فیصلہ یہ کیا کہ باپ کی میراث کو فروخت کرنے کے بجائے اپنے نام ٹرانسفر کروا لیا۔ اس سلسلے میں ایک وکیل کے توسط سے قانونی دستاویز تیار کی گئیں۔ اب اس دو منزلہ مکان کا مالک و مختار کل شجاعت علی تھا۔ رجب علی کو اُس کے حصے کے ڈیڑھ لاکھ روپے شجاعت علی نے اپنے پاس سے وکیل کی موجودگی میں ادا کئے اور اس کے پکے ثبوت کے لئے باقاعدہ اسٹامپ پیپر تحریر کیا گیا۔ خوش قسمتی سے اس ماہ شجاعت علی کی ایک لاکھ روپے کی بیسی (کمیٹی) نکلی تھی۔ باقی رقم دفتر سے قرض لے لی۔

رجب علی اور شاہدہ کے جانے کے بعد شجاعت علی نے مکان کی زیریں منزل کرائے پر اٹھا دی۔ اس طرح اس کی آمدنی میں چھ سو روپے ماہوار کا اضافہ ہوگیا۔ چنانچہ دفتر میں قرض کے سلسلے میں جو ہر ماہ ایک ہزار روپے کٹتا تھے اُن کی وجہ سے پیدا ہونے والا معاشی خلا بڑی حد تک پُر ہوگیا۔

پھر پندرہ ماہ تک دونوں بھائیوں کے بیچ کوئی رابطہ نہ ہو سکا۔ شجاعت علی اُس کے پتے ٹھکانے سے واقف تھا نہ ہی وہ یہ جانتا تھا کہ رجب علی علیحدہ ہونے کے بعد کر کیا رہا تھا۔ ہاں، البتہ رجب علی اگر چاہتا تو وہ بڑے بھائی سے ملنے آ سکتا تھا لیکن اُس نے اس بات کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی ہوگی۔

اچانک ڈیڑھ سال کے بعد شجاعت علی کو رجب علی کے بارے میں تشویش ناک خبریں موصول ہونے لگیں۔ وہ ان دنوں بڑی کسمپرسی کی حالت میں زندگی گزار رہا تھا۔ شجاعت علی کے خون نے جوش مارا اور اُس نے چھوٹے بھائی کو کھوج نکالا۔

اس دوران میں رجب علی نے بہت ٹھوکریں کھائی تھیں اور تلخ تجربات سے دوچار ہوا تھا۔ بھائی سے علیحدہ ہونے کے بعد وہ اپنی بیوی شاہدہ کو لے کر کورنگی چلا گیا تھا اور سسرال

کے قریب ہی کرائے کے ایک مکان میں رہنے لگا تھا۔ اپنے حصے کے ڈیڑھ لاکھ روپے اُس نے کنسٹرکشن کے کاروبار میں لگا دیئے۔ وہ عبدالمنان نامی ایک سسرالی رشتے دار کے ساتھ مل کر چھوٹے موٹے تعمیراتی ٹھیکے لینے لگا۔ عبدالمنان ایک کائیاں شخص تھا جبکہ رجب علی نا تجربہ کار۔ ایک سال کے اندر اندر رجب علی کے ڈیڑھ لاکھ روپے ڈوب گئے۔

رجب علی کو اندازہ ہوگیا تھا کہ عبدالمنان نے کوئی چار سو بیسی کی ہے۔ وہ دبی زبان میں اس کا اظہار بھی کرنے لگا۔ نتیجے میں اُس کے گھر میں آئے روز جھگڑے ہونے لگے۔ شاہدہ اپنے میکے والوں کے خلاف ایک لفظ سننے کو تیار نہیں تھی۔ رجب علی اکھڑ مزاج تو تھا ہی، جواب میں اُس نے ایک دو بار شاہدہ کی پٹائی بھی کر دی۔ بس پھر کیا تھا، شاہدہ کا پورا خاندان رجب علی کے خلاف ہوگیا۔ خود شاہدہ نے بھی طلاق کا مطالبہ کر دیا۔

''میں تمہارے جیسے شکی اور پست ذہن کے انسان کے ساتھ ایک لمحہ نہیں رہ سکتی۔'' اُس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

رجب علی نے کہا۔ ''میرا شک بلاوجہ نہیں ہے شاہدہ۔''

''پھر کیا وجہ ہے تمہارے شک کی؟''

''دیکھو تمہارا ماموں عبدالمنان کنسٹرکشن کے کام میں سال ہا سال سے ہے۔ کبھی اُسے نقصان نہیں ہوا۔ پھر میرا سرمایہ کیوں ڈوب گیا؟''

''کاروبار میں نفع نقصان ہوتا ہی رہتا ہے۔'' شاہدہ نے جواب دیا۔ ''یہ بات تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ ماموں کو کبھی گھاٹا نہیں ہوا؟''

رجب علی نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''میں مانتا ہوں، کاروبار میں ہمیشہ فائدہ ہی نہیں ہوتا، کبھی تھوڑا بہت نقصان بھی ہو جاتا ہے۔ لیکن ہم دونوں اس کام میں شراکت دار تھے۔ رقم صرف میری ہی کیوں ڈوبی۔ اس نقصان میں تمہارے ماموں کو بھی حصے دار بننا چاہئے تھا۔

''تمہارا نقصان اس لئے ہوا کہ تم اناڑی تھے۔''

''گویا تمہارے ماموں کھلاڑی تھے۔'' رجب علی نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''اور انہوں نے ایک کہنہ مشق کھلاڑی کی طرح مجھ اناڑی کو ناک آؤٹ کر دیا؟''

شاہدہ غصے کے عالم میں پھنکاری۔ ''خبردار! جو میرے ماموں کے بارے میں ایسے گھٹیا الفاظ استعمال کئے۔ انہوں نے ہمیشہ مجھے اپنی بیٹی سمجھا ہے۔''

''میں نے دنیا میں ایسا کوئی ماموں نہیں دیکھا جو اپنی بھانجی کے گھر کا دشمن ہو جائے۔''

"تم نے ابھی دنیا دیکھی ہی کتنی ہے؟"

"جتنی دیکھی ہے، اسی تجربے کی بنا پر کہہ رہا ہوں۔"

شاہدہ نے تیوری چڑھا کر کہا۔"میرے ماموں نے تمہارے ساتھ فراڈ کیا ہے۔ وہ میرے دشمن ہیں۔ ہم سب بہت برے لوگ ہیں۔ تم مجھ بری کو چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟"

شاہدہ نے ڈھکے چھپے نہیں بلکہ بالکل واضح الفاظ میں طلاق کا مطالبہ کر دیا تھا۔ رجب علی کو توقع نہیں تھی کہ وہ اس حد تک بھی جا سکتی تھی۔ اُس نے اُلجھن آمیز ناراضی سے کہا۔

"شاہدہ جانتی ہو، تم کیا کہہ رہی ہو؟"

"ہاں، میں اچھی طرح جانتی ہوں۔"

رجب علی نے پوچھا۔"کیا واقعی تم میرے ساتھ رہنا نہیں چاہتیں؟"

"جو شخص کمزور عورت پر ہاتھ اُٹھائے وہ مرد نہیں ہوتا۔" شاہدہ نے کاٹ دار لہجے میں چوٹ کی۔"تم کئی بار مجھے زدو کوب کر چکے ہو۔ میں تم جیسے مرد کہلانے والے ہیجڑے کے ساتھ زندگی نہیں گزار سکتی۔"

"تم خوامخواہ بات کو بڑھا رہی ہو۔"

"بات تم نے بڑھائی ہے رجب۔" شاہدہ نے تلخ لہجے میں کہا۔"میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ تم ماموں عبدالمنان پر ایسا گھناؤنا الزام لگاؤ گے۔ میں تمہاری وجہ سے کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہی۔ تم نے تو پورے خاندان میں میری ناک کٹوا دی ہے۔"

پھر شاہدہ وہاں سے اُٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ رجب علی نے بڑے بھائی کو اور محمود آباد والے گھر کو محض شاہدہ کی باتوں میں آ کر چھوڑا تھا۔ وہ دن رات اُسے اپنا حق حاصل کرنے کے لئے اُکساتی رہتی تھی۔ اب رجب علی کو پچھتاوا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ عبدالمنان نے دھوکا دہی سے اُس کی رقم ہڑپ کر لی تھی لیکن وہ اتنا بے بس تھا کہ اُس کے خلاف کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ شاہدہ کو اُس نے سمجھانے کی کوشش کی لیکن اُس کی زبان پر طلاق کا لفظ نقش ہو گیا تھا۔ وہ اُٹھتے بیٹھتے یہ مطالبہ دہراتی رہتی تھی۔

آخر کار رجب علی نے شاہدہ کو آزاد کر دیا۔

کچھ ہی عرصے بعد شاہدہ نے ایک دولت مند شخص سے شادی کر لی۔ بعد ازاں رجب علی کو معلوم ہوا کہ شاہدہ نے اس صاحب ثروت شخص سے شادی کرنے کے لئے ہی اُس سے طلاق لی تھی۔

رجب علی واپس شجاعت علی کے پاس آنا چاہتا تھا لیکن وہ بڑے بھائی کے ساتھ جو سلوک

کر کے گیا تھا اس نے رجب علی کے پاؤں میں زنجیریں ڈال رکھی تھیں۔ وہ اپنے کئے پر نادم تھا اور دربدری کی زندگی گزار رہا تھا کہ شجاعت علی کو اُس کے حالات کی خبر ہو گئی۔ رجب علی لاکھ کمینہ فطرت سہی لیکن اس وقت وہ مصیبت زدہ تھا۔ شجاعت علی کو اُس پر رحم آ گیا۔ وہ ایک عظیم انسان تھا اس لئے مصیبت زدہ افراد کے لئے اپنے دل میں نرم گوشہ رکھتا تھا۔ رجب علی تو پھر اُس کا سگا بھائی تھا۔ لیکن اُس نے کوئی عملی قدم اٹھانے سے پہلے اپنی بیوی حور بانو سے مشورہ کرنا ضروری سمجھا۔

اُس نے رجب علی کے بارے میں تمام تر تفصیلات بتانے کے بعد پوچھا۔"کیا خیال ہے حور بانو! اس وقت رجب علی کو ہماری مدد کی ضرورت نہیں ہے؟"

اُس سمندر دل عورت کا جواب بڑا لاجواب تھا۔

"وہ آپ کا چھوٹا بھائی ہے۔" حور بانو نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔"آپ دونوں کی رگوں میں ایک ہی باپ کا خون گردش کر رہا ہے۔ لٹھ مارنے سے پانی نہیں بچھڑتا۔ اگر رجب علی اس وقت ہماری مدد کا مستحق ہے تو ہمیں ضرور اُس کے لئے کچھ نہ کچھ کرنا چاہئے۔"

شجاعت علی کے سینے سے اطمینان بخش سانس خارج ہوئی۔"تم نے میرا بوجھ ہلکا کر دیا ہے حور بانو۔"

"آپ کیا سوچ رہے تھے، میں مخالفت کروں گی؟"

"نہیں..... لیکن....."

"آپ مجھ سے ذکر کئے بغیر بھی رجب علی کو گھر لے آتے تو میں اعتراض نہ کرتی۔" حور بانو نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔"میرا ایمان ہے کہ آپ جو بھی قدم اٹھائیں گے، سوچ سمجھ کر ہی اٹھائیں گے اور اس میں ہماری کوئی اجتماعی بہتری پوشیدہ ہو گی۔"

حور بانو جتنی خوبصورت خود تھی، اس سے کہیں زیادہ خوبصورت اُس کا دل تھا۔ اُس کی صورت اور سیرت میں ذرّہ برابر تضاد نہیں تھا۔ اس حوالے سے میرا خیال ہے، شجاعت علی دنیا کا خوش قسمت ترین شوہر تھا۔

رجب علی کو واپس محمود آباد والے گھر لانے کا فیصلہ ہو چکا تو اس بات پر غور ہونے لگا کہ وہ رہے گا کہاں۔ مکان کی زیریں منزل کرائے پر اُٹھی ہوئی تھی اور بالائی منزل پر پانچ افراد دو کمروں میں گزارہ کر رہے تھے۔ اس کے علاوہ ایک چھوٹا سا ڈرائنگ رُوم تھا۔

حور بانو نے کہا۔"جب امی جی (یعنی اُس کی ساس، خورشید بیگم) حیات تھیں تو بھی ہم گزارہ کرتے ہی تھے نا۔ رجب علی کے آنے سے کیا مشکل آ جائے گی۔"

"امی جی کی بات دوسری تھی۔" شجاعت علی نے کہا۔ "وہ تو اکثر اوقات کاشف اور عمران کے ساتھ ہی سو جاتی تھیں۔ پھر ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ فوزیہ میٹرک میں جا چکی ہے، اُسے راتوں کو دیر تک پڑھنا ہوتا ہے۔ دوسرے بچے بھی پڑھتے ہیں۔"

"تو کیا ہوا، رجب علی ڈرائنگ رُوم میں سو جایا کرے گا۔" حور بانو نے فی الفور ایک حل پیش کر دیا۔

شجاعت علی نے کہا۔ "ہاں، سردست تو یہی کرنا پڑے گا۔ لیکن میں سوچ رہا ہوں کہ کرائے داروں کو مکان خالی کرنے کا نوٹس دے دوں۔"

"اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔" حور بانو نے جلدی سے کہا۔ "ہم جیسے تیسے گزارہ کر لیں گے۔ آپ خوامخواہ لگی بندھی آمدنی کو منقطع نہ کریں۔ آپ کی تنخواہ میں سے پہلے ہی ایک ہزار روپے کٹ جاتے ہیں۔"

"اچھی طرح سوچ لو حور بانو۔" شجاعت علی نے کہا۔ "کہیں بعد میں تمہیں شکایات نہ پیدا ہو جائیں۔"

"ایسا نہیں ہو گا۔ آپ مطمئن ہو جائیں۔"

شجاعت علی مطمئن ہو گیا اور رجب علی کو گھر لے آیا۔ شجاعت علی نے کوشش کر کے اُسے اپنے ہی دفتر میں ملازمت بھی دلوا دی۔ کام آؤٹ ڈور کلرک سے ملتا جلتا تھا۔ اس سے زیادہ بہتر نوکری اُسے مل بھی نہیں سکتی تھی۔ اُس کی تنخواہ بھی پندرہ سو روپے لگی تھی۔

بدفطرت انسان کو شرافت کی زندگی زیادہ عرصہ راس نہیں آتی۔ جب پیٹ بھر کر کھانا اور گھر کا آرام و سکون میسر آیا تو رجب علی کا فطری کمینہ پن عود کر آیا۔ بڑے بھائی کے حسن سلوک کے پیش نظر اُس نے اپنے اندر مصنوعی حلیمی پیدا کر لی تھی۔ وہ "تم" سے "آپ" پر آ گیا تھا اور بھائی کا احترام کرنے لگا تھا۔ مگر یہ سب کسی ڈرامے سے کم نہیں تھا۔ وہ یہ ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ اب اُسے عقل آ گئی ہے جبکہ درحقیقت ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ پہلے وہ شمشیرِ بُرّاں تھا، اب میٹھی چھری کا رُوپ دھار چکا تھا۔ میٹھی چھری بہرحال شمشیر بے نیام سے زیادہ خطرناک ہوتی ہے...... اور یہ میٹھی چھری بڑے بھائی کی جڑیں کاٹنے کی منصوبہ سازی میں مصروف تھی۔

ایک روز رجب علی نے شجاعت علی سے کہا۔ "بھائی صاحب! میں دیکھ رہا ہوں، آپ لوگوں کو میری وجہ سے خاصی پریشانی کا سامنا رہتا ہے۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ میں نچلی منزل پر شفٹ ہو جاؤں؟"

"نچلی منزل پر؟" شجاعت علی نے حیرت آمیز لہجے میں کہا۔ "مگر وہاں تو کرائے دار رہتے ہیں۔"

رجب علی نے محبت آمیز لہجے میں کہا۔ "آپ ان سے مکان خالی کروا لیں۔ وہی کرایہ میں آپ کو دے دیا کروں گا۔"

"تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا۔" شجاعت علی نے مصنوعی خفگی کا اظہار کیا۔ "میں تم سے کرایہ لیتا ہوا کیا اچھا لگوں گا۔"

"کیا فرق پڑتا ہے بھائی صاحب۔ ہمارے پیسے کوئی الگ تھوڑا ہی ہیں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن میں تمہارے بارے میں کچھ اور سوچ رہا ہوں۔"

"وہ کیا بھائی صاحب؟"

"کیا ساری عمر یوں ہی تنہا رہو گے؟" شجاعت علی نے میٹھی ناراضی سے چھوٹے بھائی کو دیکھا۔ "اپنی کمائی کو بچا کر رکھو۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ تم اپنی آمدنی کا بیشتر حصہ بچوں پر خرچ کر دیتے ہو۔ کچھ جمع جوڑ کرو تو تمہارا گھر دوبارہ بسانے کا سوچا جائے۔"

"اس بارے میں تو آپ ہی سوچیں تو اچھا ہے۔" وہ بیزاری سے بولا۔ "میں نے شادی نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے...... اور جہاں تک بچوں پر پیسے خرچ کرنے کا تعلق ہے تو آپ کے بچے میرے بھی بچے ہیں۔ پھر میں آپ ہی کے گھر میں کھاتا پیتا بھی تو ہوں۔"

"مجھے تمہارے ان خیالات سے دُکھ پہنچا ہے رجب۔" شجاعت علی نے شکایتی نظروں سے اُسے دیکھا۔ "تم یہ کھانے پینے کا حساب کہاں لے بیٹھے۔"

رجب علی نے ندامت آمیز لہجے میں کہا۔ "مجھے اس بات کا افسوس ہے کہ آپ کو میری باتوں سے تکلیف پہنچی ہے۔ ویسے میری تجویز کے بارے میں سوچیے گا ضرور۔ چاہے آپ مجھ سے کچھ کم کرایہ لے لیں۔"

شجاعت علی اس وقت تو خاموش ہو گیا۔ لیکن رجب علی خاموش بیٹھنے کو تیار نہیں تھا۔ وہ اپنے بھائی کو تباہ و برباد کر کے سب کچھ ہتھیا لینے کا پکا پروگرام بنائے بیٹھا تھا اور قدم قدم پر خوش اسلوبی سے آگے بڑھ رہا تھا۔ بظاہر یقین نہیں آتا تھا کہ ایک بھائی دوسرے بھائی کے خلاف اس حد تک بھی جا سکتا ہے۔ لیکن جب انسان کا خون سفید ہو جائے تو وہ ہر حد کو پھلانگ سکتا ہے۔

اب رجب علی نے اپنی بھابھی سے اکثر یہ کہنا شروع کر دیا کہ وہ زیریں منزل پر کرائے دار کی حیثیت سے منتقل ہونا چاہتا ہے جہاں وہ، یہ گھر چھوڑنے سے پہلے اپنی بیوی شاہدہ کے

ساتھ رہائش پذیر تھا۔

یہ بھی ایک حقیقت تھی کہ بالائی منزل چھ افراد کے لئے خاصی تنگ پڑ رہی تھی۔ کیونکہ بچے اب بڑے ہونے لگے تھے۔ چنانچہ رجب علی کے اصرار اور حقیقت پسندی کے پیش نظر شجاعت علی نے کرائے داروں سے مکان خالی کروا کے رجب علی کے حوالے کر دیا۔ شجاعت علی اس بات کے لئے تیار نہیں تھا لیکن رجب علی نے بصد اصرار چار سو روپے ماہوار بطور کرایہ دینا شروع کر دیئے۔

ایک محاذ پر قدم جمانے کے بعد اُس نے دوسرے محاذ پر طبع آزمائی شروع کر دی۔ شجاعت علی ٹریڈنگ کمپنی میں اکاؤنٹنٹ تو تھا ہی، اس کے ساتھ ساتھ اُسے کیش کے معاملات کو بھی دیکھنا پڑتا تھا۔ بینک سے رقم نکلوانا اور جمع کروانا بھی اُسی کی ذمے داری تھی۔

دفتر میں تمام ملازمین کو ماہانہ تنخواہیں یکم تاریخ کو دی جاتی تھیں۔ دیگر پارٹیوں کو بھی اسی دن ادائیگی کی جاتی تھی لیکن چونکہ یکم تاریخ کو بینک میں رش بہت زیادہ ہوتا تھا اس لئے ایک روز پہلے ہی بینک سے رقم نکلوا لی جاتی تھی۔ یہ بات کمپنی کے چند سرکردہ افراد کو ہی معلوم تھی۔ رقم شجاعت علی ہی بینک سے لے کر آتا تھا اس لئے رجب علی بھی اس بات سے واقف ہو گیا تھا۔ جب اُسے معلوم ہوا کہ قریب قریب ڈیڑھ لاکھ روپے کی رقم ایک روز کے لئے اُس کے بھائی کی الماری میں محفوظ رہتی ہے تو اُس کے شیطانی ذہن نے فی الفور ایک منصوبہ ترتیب دے ڈالا۔ رجب علی کے لئے یہ رقم اُڑا لینا مشکل ضرور تھا لیکن ناممکن نہیں تھا۔ بس اُسے موقع...... مناسب موقع کا انتظار کرنا تھا۔

پھر ایک ماہ اُسے یہ سنہری موقع ہاتھ آ گیا اور اُس نے بڑی صفائی سے ڈیڑھ لاکھ روپے کی رقم پر ہاتھ صاف کر ڈالا۔ دوسری صبح یکم تاریخ کو جب شجاعت علی نے اپنی الماری کھولی تو تجوری والا خالی خانہ اُس کا منہ چڑا رہا تھا......!

اگرچہ ایسا واقعہ پہلی مرتبہ پیش آیا تھا اور شجاعت علی کا کردار بھی بے داغ تھا۔ لیکن ڈیڑھ لاکھ کوئی معمولی رقم نہیں تھی کہ اُسے نظر انداز کر دیا جاتا۔ کمپنی نے اُسے غبن کے کیس میں تھانے بھجوا دیا۔ وہ اپنی صفائی میں بڑی بڑی قسمیں کھاتا رہا لیکن کسی نے اُس کی بات پر یقین نہیں کیا۔ یکم تاریخ کو اُس نے اپنے ہاتھوں سے الماری کھولی تھی اور یہی بات اُس کے خلاف جاتی تھی۔ اگر کسی نے اُس کے غیاب میں رقم چرائی ہوتی تو الماری کا تالا ٹوٹا ہوا ملتا۔

شجاعت علی کا بے داغ کردار داغ دار ہو چکا تھا۔ پولیس نے اُس سے رقم کے بارے میں اُگلوانے کے لئے خاصا تشدد بھی کیا لیکن انہیں اپنے مقصد میں کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ چنانچہ

کیس عدالت میں پہنچ گیا اور شجاعت علی کو جیل کسٹڈی ہو گئی۔ ظاہر ہے، رجب علی کو بھی ملازمت سے نکال دیا گیا تھا۔

حور بانو پر تو جیسے قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔ لیکن مکر و فریب کا پتلا رجب علی بڑی ہمدردی اور دردمندی سے اپنی بھابھی کی اشک شوئی میں لگا ہوا تھا۔

"آپ پریشان نہ ہوں بھابھی۔" اُس کی اداکاری قابل دید و قابل داد تھی۔ "میں نے کل ایک بہت مشہور وکیل سے بات کی تھی۔ انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ بھائی جان بہت جلد باعزت رہا ہو جائیں گے۔"

حور بانو نے رقت آمیز لہجے میں کہا۔ "شجاعت ایسا نہیں کر سکتے۔ ان کے خلاف کوئی گہری سازش کی گئی ہے۔"

"مجھے خود بھائی صاحب کی بے گناہی کا یقین ہے بھابھی۔" رجب علی نے پُر وثوق انداز میں کہا۔ "میں پوری کوشش کر رہا ہوں لیکن......"

اُس نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا، حور بانو نے جلدی سے پوچھا۔ "لیکن کیا؟"

"آپ کو تو معلوم ہی ہے بھابھی، بڑے وکیلوں کی فیس بھی بڑی ہوتی ہے۔" رجب علی نے ہچکچاہٹ آمیز لہجے میں کہا، پھر بولا۔ "اور آپ یہ بھی جانتی ہیں کہ میرے پاس......"

"تم اس کی فکر نہ کرو رجب۔" حور بانو نے فی الفور اُس کی بات کاٹ دی۔ "پیسوں کا انتظام میں کر دوں گی۔"

وکیل کی آڑ میں رجب علی اپنی بھابھی سے گاہے بگاہے چھوٹی بڑی رقمیں ہتھیانے لگا۔ اُس نے محض خانہ پُری کے لئے ایک بودے سے وکیل کی خدمات بھی حاصل کر رکھی تھیں جس نے چھ ماہ گزر جانے کے باوجود بھی باقاعدہ کارروائی کی نوبت نہیں آنے دی تھی اور تاریخیں لینے پر ہی اکتفا کیا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ اُسے شجاعت علی کی رہائی سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ اور رجب علی یہی چاہتا تھا۔ وہ بھائی کو جیل میں رکھ کر اُس کے گھر پر اپنا قبضہ مضبوط کرنا چاہتا تھا۔

رجب علی نے اگلا قدم انتہائی خطرناک اُٹھایا۔ اگر اُس میں ذرّہ برابر بھی غیرت ہوتی تو یہ اُس کے لئے ڈوب مرنے کا مقام تھا۔ واقعی کوئی بے غیرت شخص ہی ایسی نیچ حرکت کر سکتا تھا۔

بھائی کی اولاد اپنی اولاد ہوتی ہے۔ کوئی اپنی اولاد کو اغوا کروانے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ لیکن جب آنکھوں پر لالچ کی پٹی بندھ جائے، دماغ میں کچرا بھر جائے تو پھر

سوچ کی پاکیزگی خود بخود رخصت ہو جاتی ہے۔ آلودہ سوچ والے ذہن سے کسی بھلائی کی توقع عبث ہے۔ ایسا انسان پستی میں گرنے کے سوا کچھ کر ہی نہیں سکتا۔

رجب علی نے در پردہ رہتے ہوئے کرائے کے غنڈوں کی مدد سے شجاعت علی کی بیٹی فوزیہ کو اغوا کروا لیا۔ فوزیہ اسکول سے مقررہ وقت پر گھر نہیں پہنچی تو حور بانو کے اوسان خطا ہو گئے۔ شام تک اُس کی حالت مُردوں سے بدتر ہو چکی تھی۔ فوزیہ کی تمام سہیلیوں کے گھر فون کر کے معلوم کر لیا مگر اُس کا کوئی سراغ نہ ملا۔ تلاش کے سلسلے میں رجب علی کی تگ و دو کو دیکھ کر کوئی کہہ نہیں سکتا تھا کہ یہ سب کچھ اسی کا کیا دھرا ہے۔

وہ سردیوں کے دن تھے اس لئے رات جلدی ہو جاتی تھی۔ نو بجے کے قریب فون کی گھنٹی بج اُٹھی۔ حور بانو سمجھی، شاید فوزیہ کی کوئی اطلاع ہو گی۔ اُس نے جھٹ سے ریسیور اُٹھا لیا۔

''ہیلو! فوزیہ کا کچھ پتہ چلا؟'' بے اختیار اُس کے منہ سے نکل گیا۔

''فوزیہ ہمارے پاس ہے۔'' ایک بھاری بھرکم آواز حور بانو کی سماعت سے ٹکرائی۔

''تم کون ہو؟'' وہ تیز آواز میں چلائی۔ ''میں تمہیں نہیں جانتی۔ تم فوزیہ کو کیوں لے گئے ہو؟''

بھاری بھرکم اجنبی آواز دوبارہ اُبھری۔ ''میں نے تمہارے سوالات کے جواب دینے کے لئے فون نہیں کیا۔ میری بات غور سے سنو۔''

حور بانو ہمہ تن گوش ہو گئی۔ ریسیور میں کہا گیا۔ ''اگر تم چاہتی ہو کہ تمہاری بیٹی کو کوئی نقصان نہ پہنچے تو فوری طور پر ہمارا مطالبہ پورا کر دو۔''

''کیا چاہتے ہو تم لوگ؟''

''فوزیہ کی باعزت اور زندہ سلامت واپسی کی قیمت۔''

حور بانو نے جلدی سے کہا۔ ''دیکھو، اگر تم نے فوزیہ کو کوئی بڑی رقم حاصل کرنے کے لئے اغوا کیا ہے تو تمہاری توقع پوری نہیں ہو گی۔ ہم پہلے ہی ایک بہت بڑی مصیبت میں گھرے ہوئے ہیں۔ میرا شوہر جیل میں بند ہے۔''

''ہمیں تمہارے شوہر اور تمہارے حالات سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔'' بے مروتی سے کہا گیا۔ ''اگر تم نے ہماری بات نہ مانی تو اپنی بیٹی کو زندہ نہیں دیکھ سکو گی اور مارنے سے پہلے ہم اُس کی عزت......''

جملہ دانستہ ادھورا چھوڑ دیا گیا۔ حور بانو تڑپ اُٹھی۔

''خدارا، فوزیہ کو ہاتھ بھی نہ لگانا۔'' کلیجہ اُس کے منہ کو آ رہا تھا۔ ''مجھے بتاؤ، تمہیں کتنی رقم

کی ضرورت ہے؟''

سفاک لہجے میں کہا گیا۔ ''تین لاکھ!''

''اوہ!'' حور بانو کے منہ سے بے چارگی آمیز آہ برآمد ہوئی۔ ''میں اتنی بڑی رقم کا بندوبست نہیں کر سکتی۔''

حور بانو کا جملہ ختم ہوا ہی تھا کہ ریسیور میں فوزیہ کی چیخ سنائی دی۔ ''امی، یہ بہت ظالم لوگ ہیں۔ خدا کے لئے مجھے ان کے چنگل سے چھڑائیں۔''

''میری بچی۔'' حور بانو کا جگر دولخت ہو گیا۔ ''تم خیریت سے تو ہو نا؟''

''ابھی تک تو خیریت سے ہے۔'' فوزیہ کے بجائے اسی بھاری بھرکم آواز میں جواب دیا گیا۔ ''لیکن اگر تم نے ہمارا مطالبہ پورا نہ کیا تو پھر اس کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔''

اس دھمکی نے حور بانو کو لرزا کر رکھ دیا۔ وہ کپکپاہٹ آمیز لہجے میں بولی۔ ''تمہارا مطالبہ میری پہنچ سے بہت زیادہ ہے۔''

''اچھی طرح سوچ لو۔ میں ٹھیک پندرہ منٹ کے بعد دوبارہ فون کروں گا۔'' اُس شخص نے سفاک لہجے میں دھمکی دی۔ ''اگر پولیس کو اس بارے میں کچھ بتانے کی کوشش کی تو تمہیں فوزیہ کی لاش ہی ملے گی اور وہ بھی نوچی کھسوٹی ہوئی۔''

''نہیں نہیں، میں کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گی۔'' وہ پورے وجود سے کانپ رہی تھی۔

''میرا ایک آدمی تمہارے گھر کی نگرانی کر رہا ہے۔'' اُس نے روح فرسا انکشاف کیا۔

''اگر تم نے میری تاکید کے خلاف کوئی بھی حرکت کی تو......''

اس کے ساتھ ہی ریسیور رکھ دیا گیا۔

حور بانو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ رجب علی اس وقت اُس کے پاس ہی موجود تھا۔ وہ بڑے فن کارانہ انداز میں اپنی ''پیاری بھابھی'' کی دل جوئی کر رہا تھا۔

حور بانو نے اپنے دوپٹے کے پلّو سے آنسو خشک کرتے ہوئے کہا۔ ''اب کیا ہو گا رجب علی۔ میں تین لاکھ کہاں سے لاؤں؟''

''آپ پریشان نہ ہوں بھابھی۔ اللہ کوئی نہ کوئی وسیلہ بنا ہی دے گا۔'' رجب علی نے کھوکھلی تسلی دیتے ہوئے کہا۔

حور بانو کے ہاتھ سے ضبط کا بندھن چھوٹ گیا۔ ''کیا وسیلہ بنا دے گا؟ تمہارا بھائی جیل میں بند ہے۔ میں اپنے زیورات بھی بیچ کر تمہیں دے چکی ہوں۔ اب میرے پاس کیا بچا ہے۔ وہ مردود پورے تین لاکھ کا مطالبہ کر رہا ہے۔ کیا اللہ دیکھ نہیں رہا کہ ہم پہلے ہی کس قسم کے

حالات سے دوچار ہیں، اوپر سے ایک نئی مصیبت ڈال دی۔''

رجب علی کے دل میں مسرت کے لڈو پھوٹ رہے تھے لیکن وہ بظاہر انتہائی سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔ کوئی پتھر دل شخص ہی ایسا کہہ سکتا تھا۔

''بھابھی! اللہ کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی مصلحت پوشیدہ ہوتی ہے۔ آپ صبر سے کام لیں۔''

''نہیں صبر ہوتا مجھ سے۔'' وہ دل گیر آواز میں کراہی۔ ''میری جوان بیٹی وحشیوں کے قبضے میں ہے۔ اُس کی عزت محفوظ ہے نہ زندگی۔ اے خدایا! مجھے موت دے دے۔''

رجب علی نے حور بانو کو شانوں سے تھام کر کرسی پر بٹھا دیا، پھر بولا۔ ''اب اُس منحوس کا فون آیا تو میں خود بات کروں گا۔''

ابھی ان میں یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ فون کی گھنٹی ایک مرتبہ پھر بج اُٹھی۔ اس بار رجب علی نے فی الفور ریسیور اٹھالیا۔

''دیکھو، تم جو کوئی بھی ہو، اچھا نہیں کر رہے ہو۔'' دوسری طرف کی آواز سنتے ہی رجب علی نے سخت لہجے میں کہا۔ ''تم ایک ماں کو دُکھی کر کے خدا کے عذاب کو دعوت دے رہے ہو۔''

''بہت خوب، بھئی بہت خوب۔'' دوسری جانب سے ایک قہقہہ لگانے کے بعد کہا گیا۔ ''استاد، بڑی اچھی اداکاری کر رہے ہو۔''

حور بانو صرف وہی سن رہی تھی جو رجب علی کہہ رہا تھا۔ دوسری سمت کی باتیں اُس کی سماعت تک نہیں پہنچ رہی تھیں۔ رجب علی نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

''ذرا بچی سے میری بات کراؤ۔''

یہ سب سوچی سمجھی ڈرامے بازی تھی۔ سب کچھ پہلے ہی طے ہو چکا تھا۔ اس کے بعد دوسری جانب سے ریسیور میں فوزیہ کی آواز سنائی دی۔ وہ بہت سہمی ہوئی تھی۔ رجب علی نے تشفی آمیز لہجے میں کہا۔

''تم فکر نہ کرو بیٹی۔ تمہارا چاچو ابھی زندہ ہے۔ میں تمہیں کوئی گزند نہیں پہنچنے دوں گا۔ انہوں نے تمہیں مارا پیٹا تو نہیں؟''

فوزیہ نے گلوگیر آواز میں کہا۔ ''مارا تو نہیں چاچو لیکن مجھے ان سے بہت ڈر لگ رہا ہے۔ ان کے خوف ناک چہرے میری رُوح فنا کیے دے رہے ہیں۔''

''تم بہت بہادر بچی ہو۔'' رجب علی نے حوصلہ افزا لہجے میں کہا۔ ''میں جلد ہی تمہیں چھڑا لوں گا۔ ٹھیک ہے؟''

''ٹھیک ہے۔'' فوزیہ نے کہا۔ پھر اُس سے ریسیور چھین لیا گیا۔ شاید وہ اُسے دوسرے کمرے میں لے گئے تھے۔

طے شدہ پروگرام کے تحت فون بند کر دیا گیا لیکن رجب علی حور بانو کو سنانے کے لئے یکطرفہ گفتگو کرتا رہا۔ ریسیور اُس نے بدستور کان سے لگا رکھا تھا۔

''تین لاکھ روپے بہت زیادہ ہیں۔'' اُس نے مصلحت آمیز انداز میں کہا۔ ''ہماری حیثیت کو دیکھتے ہوئے کچھ رعایت کر دو۔''

وہ تھوڑی دیر تک دوسری جانب کی بات سننے کی اداکاری کرتا رہا پھر بولا۔ ''نہیں، دو لاکھ بھی مہیا کرنا ہمارے بس میں نہیں ہے۔ تم رقم جتنی بھی کم کرو گے، خدا کے قہر سے اتنے ہی محفوظ رہو گے۔''

چند لمحوں کے توقف کے بعد اُس نے کہا۔ ''اگر تم راتوں رات امیر بننے کے خواب دیکھ رہے ہو تو کسی کروڑ پتی دولت مند کو اغوا کرو۔ ایک بے بس اور لاچار ماں کے دل کو کیوں کھلونا بناتے ہو۔ کیا تمہاری کوئی بہن یا بیٹی نہیں ہے۔ ذرا سوچو، اگر انہیں......''

اُس نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ پھر ذرا توقف کے بعد کہا۔ ''بڑے بھائی، مجھے گالیاں کیوں دے رہے ہو۔ سچ ہمیشہ کڑوا ہوتا ہے۔ اپنی بہن بیٹی کی بات آئی تو تمہاری غیرت نے جوش مار دیا۔''

کچھ دیر کے بعد اُس نے سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے کہا۔ ''چلو ٹھیک ہے۔ ڈیڑھ لاکھ روپے ہی سہی لیکن ہمیں کچھ مہلت تو دو۔''

ایک لمحہ خاموش رہنے کے بعد وہ بولا۔ ''نہیں، میں یہ مہلت رقم کا انتظام کرنے کے لئے لے رہا ہوں۔ تم فکر نہ کرو، پولیس کے پاس ہرگز نہیں جائیں گے۔ پھر تم نے تو خود ہی بتایا تھا کہ تمہارا کوئی آدمی اس گھر کی نگرانی بھی کر رہا ہے۔''

اُس نے تھوڑی دیر سننے کی اداکاری کی پھر بولا۔ ''ہاں، ایک دن کافی ہے۔'' پھر پوچھا۔ ''رقم کہاں پہنچائی جائے...... اچھا، وہ بعد میں بتاؤ گے...... دیکھو، کوئی گڑبڑ نہ کرنا...... اور ہماری بچی کو کوئی تکلیف نہ پہنچے...... ہاں، ٹھیک ہے۔ تم صبح سات بجے فون کرنا۔'' پھر رجب علی نے ریسیور رکھ دیا اور شکست خوردہ نظروں سے بھابھی کو دیکھنے لگا۔

''رجب علی، یہ تم نے کیسا وعدہ کر لیا؟'' حور بانو نے تشویش ناک لہجے میں دریافت کیا۔

''ڈیڑھ لاکھ روپے کہاں سے آئیں گے؟''

''اس سے کم میں وہ کسی طرح راضی نہیں ہو رہا تھا بھابھی۔'' رجب علی نے نڈھال سی

آواز میں کہا۔

''لیکن ڈیڑھ لاکھ روپے کا بندوبست ایک دن میں کس طرح ہو سکے گا۔'' حور بانو کا لہجہ اُلجھن کے جالوں میں جکڑا ہوا تھا۔ ''میرے پاس تو پھوٹی کوڑی بھی نہیں بچی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تم نے یہ ناممکن وعدہ کیسے کرلیا۔''

''عزت بچانے کے لئے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا بھابھی۔'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ''فوزیہ میری بھی بیٹی ہے۔ میں کہیں سے رقم مہیا کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔''

''تم کہاں سے لاؤ گے رقم؟''

''میرا ایک جاننے والا سود پر قرض دیتا ہے۔'' رجب علی نے نظریں جھکا کر بتایا۔ ''کل اُس سے بات کر کے دیکھتا ہوں۔''

''لیکن سود تو حرام ہے۔'' حور بانو نے کہا۔

''ہاں حرام ہے، اور یہ بات میں بھی جانتا ہوں۔'' رجب علی نے کمزور لہجے میں کہا۔ ''لیکن زندگی بچانے کے لئے حرام بھی حلال ہو جاتا ہے..... اور یہاں صرف زندگی ہی نہیں بلکہ عزت بھی داؤ پر لگی ہوئی ہے۔''

حور بانو نے پوچھا۔ ''لیکن یہ رقم واپس کیسے ہو گی۔ پھر ہر ماہ باقاعدگی سے سود بھی دینا پڑے گا۔ میں نے سن رکھا ہے کہ سود وصول کرنے والے مقررہ روز دروازہ کھٹکھٹانے پہنچ جاتے ہیں اور رقم وصول کرنے کے لئے غیر قانونی ہتھکنڈے بھی آزماتے ہیں۔''

''یہ سب بعد کی باتیں ہیں بھابھی۔'' رجب علی نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ''فی الحال تو جو افتاد پڑی ہے، اس سے بچاؤ کا کوئی راستہ تلاش کرنا ہے۔''

وہ پیشانی کو سہلاتے ہوئے بولی۔ ''میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ تم جو مناسب سمجھتے ہو، وہ کرو۔''

''مجھے خوشی ہے کہ آپ مجھ پر اتنا اعتماد کرتی ہیں۔'' وہ ممنونیت آمیز لہجے میں بولا۔ ''میں جو کچھ بھی کروں گا، اس گھر کے مفادات کی خاطر ہی کروں گا۔''

''میں تمہاری شکر گزار ہوں۔'' حور بانو کی آنکھوں میں نمی اُتر آئی۔ ''تم اس مصیبت کے وقت میں میرا بھرپور ساتھ دے رہے ہو۔''

رجب علی نے کہا۔ ''کیوں شرمندہ کرتی ہیں مجھے۔'' پھر دل میں کہا، تمہیں کیا معلوم کہ یہ مصیبت میں نے ہی تم پر نازل کی ہے، پھر زبان سے بولا۔ ''مصیبت کے وقت اپنے ہی کام آتے ہیں بھابھی۔''

''تم بہت اچھے ہو۔'' وہ تشکرانہ لہجے میں بولی۔

رجب علی موضوع بدلتے ہوئے بولا۔ ''میرا خیال ہے، بھائی صاحب کو اس واقعے کے بارے میں بتا دینا چاہئے۔''

''یہ غضب بھولے سے بھی نہ کرنا رجب علی۔'' وہ خوف زدہ آواز میں منمنائی۔

''بھابھی، وہ آخر فوزیہ کے باپ ہیں۔'' رجب علی نے کہا۔ ''ہر بات اُن کے علم میں رہنا چاہئے۔''

حور بانو چند لمحات تک سراسیمہ نظروں سے رجب علی کو تکتی رہی، پھر کمزور سی آواز میں بولی۔ ''نہیں، انہیں اس سانحے کی بھنک بھی نہیں ملنی چاہئے۔ وہ پہلے ہی ایک جاں گسل عذاب سے گزر رہے ہیں۔ اگر فوزیہ کے اغواء کے بارے میں انہیں معلوم ہو گیا تو وہ......''

اُس نے فی الفور اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیا پھر پشیمان انداز میں کہا۔ ''میرے منہ میں خاک۔ میں کیا بکواس کرنے جا رہی تھی۔ میری عمر بھی انہیں لگ جائے۔''

''آپ کہتی ہیں تو بھائی صاحب کو کچھ نہیں بتایا جائے گا۔'' رجب علی نے سعادت مندانہ انداز میں کہا۔

حور بانو نے اطمینان کی سانس لی۔

واضح رہے کہ شجاعت علی غبن کیس میں جولائی 1972ء کو گرفتار ہوا تھا اور فوزیہ کے اغواء کا ڈرامہ جنوری 1973ء کو رچایا گیا تھا۔ اس وقت تک شجاعت علی جیل کسٹڈی ہی میں تھا اور اُس کا وکیل ضمانت کرانے میں بھی ناکامیاب رہا تھا۔ یہ بھی رجب علی ہی کی چال تھی۔

دوسری صبح سات بجے ''اغوا کنندہ'' نے فون کر کے رجب علی سے مذاکرات کر لئے اور رقم پہنچانے کے لئے ایک خفیہ مقام کی نشان دہی بھی کر دی۔

حور بانو نے رجب علی کو مشورہ دیا۔ ''اب ہمیں پولیس کو مطلع کر دینا چاہئے۔ اس طرح وہ شیطان کا بچہ رنگے ہاتھوں پکڑا جائے گا۔''

''آپ بڑی بھولی ہیں بھابھی۔'' اُس نے حور بانو کے مشورے کی مخالفت کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ جرائم پیشہ لوگ بڑے خطرناک ہوتے ہیں۔ انہوں نے مجھے جس جگہ کا پتہ بتایا ہے، ممکن ہے وہاں کوئی بھی نہ ہو اور وہاں سے مجھے تازہ ترین ہدایات دی جائیں کہ اب مجھے کہاں جانا ہے۔ آپ خوانخواہ فوزیہ کی زندگی کو خطرے میں نہ ڈالیں۔''

حور بانو کا منہ لٹک گیا۔ رجب علی نے کہا۔ ''فوزیہ کی بحفاظت واپسی کے لئے ہمیں ان کی ہر بات بے چون و چرا ماننا ہو گی۔''

حور بانو نے بے بسی سے اُسے دیکھا لیکن خاموش رہی۔ رجب علی نے اُٹھتے ہوئے کہا۔
''بھابھی، میں پیسوں کا انتظام کرنے جا رہا ہوں۔''
''اللہ تمہاری حفاظت کرے۔'' سادہ لوح حور بانو نے اُس ننگِ خاندان کو دُعائیں دے کر رخصت کیا جو اس پر ٹوٹنے والی بپتا کا ذمے دار تھا۔
رقم کا انتظام کیا کرنا تھا، شجاعت علی کے دفتر سے چرائے ہوئے ڈیڑھ لاکھ روپے اُس کے پاس محفوظ رکھے تھے۔ اُس نے وہ لا کر حور بانو کو دے دیئے اور کہا۔
''لیں بھابھی، خوش قسمتی سے بات بن گئی ہے۔ اب ہماری فوزیہ بخیر و عافیت واپس آ جائے گی۔''
حور بانو نے کہا۔ ''تم نے بتایا تھا کہ اس رقم پر سود بھی ادا کرنا ہوگا۔ اس کا کیا حساب ہو گا؟''
''ولی بھائی ویسے تو لوگوں کو دس فیصد سود پر قرض دیتے ہیں لیکن میرے وہ پرانے جاننے والے ہیں اس لئے خاصی رعایت کر دی ہے۔ مجھ سے وہ پانچ فیصد سود لیں گے۔''
''پانچ فیصد کیا؟'' حور بانو نے پوچھا۔
''پانچ فیصد ماہانہ۔''
''اوہ، یہ تو بہت زیادہ ہے۔'' حور بانو کے چہرے پر تفکر کی پرچھائیں لہرا گئی۔ ''یعنی ڈیڑھ لاکھ پر سات ہزار پانچ سو روپے ماہانہ۔''
''جی بھابھی، آپ نے بالکل ٹھیک حساب لگایا ہے۔''
''لیکن ہر ماہ ساڑھے سات ہزار روپے آئیں گے کہاں سے؟'' حور بانو سود کا تناسب سن کر واقعی پریشان ہو گئی تھی۔
رجب علی نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ''بھابھی، اس وقت یہ سب سوچنے کا موقع نہیں ہے۔ سب سے اہم کام فوزیہ کی بازیابی ہے۔ رقم کہاں سے آئے گی، اس کے بارے میں بعد میں سوچتے رہیں گے۔''
رجب علی بالکل موزوں اور مناسب بات کہہ رہا تھا اس لئے حور بانو نے زیادہ جرح نہیں کی چنانچہ اگلے روز رجب علی اپنی بھتیجی فوزیہ کو بے رحم اور سفاک ''اغوا کنندگان'' کے چنگل سے چھڑا لایا۔
حور بانو کی خوشی دیدنی تھی۔ اُسے جیسے دو جہاں کا خزانہ مل گیا تھا۔ فوزیہ صحیح سلامت گھر لوٹ آئی تھی اور یہ معجزہ رجب علی کی ''تگ و دو'' سے رونما ہوا تھا اس لئے حور بانو اُٹھتے بیٹھتے

اس کا شکریہ ادا کر رہی تھی۔
اس وقت تک وہ بے خبر یہ نہیں جانتی تھی کہ جس دیور کے نام کا وہ کلمہ پڑھ رہی ہے وہ اُس کی جڑیں کاٹنے کے لئے درانتی سنبھال چکا ہے۔ رجب علی کے مطابق، وہ اپنا جال پوری طرح پھیلا چکا تھا۔ اب آہستہ آہستہ اُسے جال کو سمیٹنا تھا۔
ایک ماہ خیریت سے گزر گیا۔ اس ماہ کے اختتام پر ولی بھائی سود کی رقم کا تقاضا کرنے پہنچ گیا۔ وہ ناٹے قد کا ایک ادھیڑ عمر شخص تھا۔ رنگ آبنوسی، بال گھنگھریالے اور توند باہر کو نکلی ہوئی تھی۔ یہ رجب علی کا تخلیق کردہ کردار تھا۔ حور بانو تو اُس کی جھلک دیکھتے ہی ڈر گئی۔
رجب علی نے ولی بھائی کو زیریں منزل پر ہی بٹھایا تھا اور اوپر سے حور بانو کو بھی نیچے بلا لیا تھا۔ رجب علی نے ڈرامے میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لئے ولی بھائی کی منت سماجت شروع کر دی۔
''ولی بھائی، خدا جانتا ہے۔ آج کل ہمارے گھریلو حالات خاصے دگرگوں ہیں۔ گھر کا خرچہ بڑی مشکل سے چل رہا ہے۔ بھائی صاحب ابھی تک جیل میں ہیں۔ آپ اگلے ماہ، دو ماہ کا سود ایک ساتھ لے جانا۔ آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔''
ولی بھائی نے ناگواری سے اُس کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''یہ ساری باتیں آپ کو قرض لینے سے پہلے سوچنا چاہئے تھیں۔ میں نے تو پہلے ہی پانچ فی صد سود کم لگایا ہے۔''
''یہ آپ کا ہم پر احسان ہے۔'' حور بانو نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔ ''آپ کچھ عرصہ ٹھہر جائیں۔ ہم آپ کی ایک ایک پائی ادا کر دیں گے۔''
ولی بھائی منہ بناتا ہوا اُس روز تو ٹل گیا مگر آئندہ ماہ پھر آ دھمکا۔ رجب علی اور حور بانو اُس کی خوشامد درآمد میں لگ گئے۔ ولی بھائی چونکہ رجب علی کی ہدایات کے مطابق ایکٹ کر رہا تھا اس لئے وہ ہر ماہ آخر کار بے نیل و مرام لوٹ جاتا تھا۔ لیکن جب ''قرض'' لئے ہوئے پانچ ماہ کا عرصہ گزر گیا تو وہ بھڑک گیا۔
''یہ آپ لوگوں نے کیا وتیرہ بنا لیا ہے۔'' اُس نے غصے سے کہا۔ ''پورے پانچ ماہ سے مجھے سود کا ایک پیسہ نہیں ملا۔ آج تک سود کی رقم آپ پر ساڑھے سینتیس ہزار روپے واجب الادا ہو چکی ہے۔''
حور بانو نے لجاجت آمیز لہجے میں کہا۔ ''ولی بھائی، آپ ہمیں تھوڑی سی مہلت اور دے دیں۔ اس وقت ہم بہت مجبور ہیں۔''
''بی بی، میں ایک کاروباری آدمی ہوں۔'' ولی بھائی نے بے مروتی سے کہا۔ ''اتنا لمبا

اُدھار نہیں دے سکتا۔ ڈیڑھ لاکھ کے قرض پر ساڑھے سینتیس ہزار روپے سود ملا کر کل رقم ایک لاکھ، ستاسی ہزار پانچ سو روپے بنتی ہے۔ آپ مجھے یہ رقم واپس کر دیں۔ میں باز آیا ایسے لین دین سے۔"

"اتنی بڑی رقم!" حور بانو کے پاؤں تلے سے زمین سرک گئی۔

ولی بھائی نے چونک کر سوال کیا۔ "کیا میں نے حساب کتاب میں کوئی غلطی کر دی ہے؟"

"نہیں ولی بھائی، آپ کا حساب بالکل درست ہے۔" رجب علی نے جلدی سے کہا۔

"لیکن بات یہ ہے کہ ہم فوری طور پر یہ رقم ادا کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔"

"یہ میرا مسئلہ نہیں ہے۔" ولی بھائی نے سخت لہجے میں کہا۔ "میں نے تو جان پہچان کی وجہ سے آپ سے کوئی رسید بھی نہیں لکھوائی۔ رجب صاحب، اگر آپ کل اس رقم سے صاف مکر گئے تو میرا تو کباڑا ہو جائے گا نا!"

یہ تمام مکالمے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ہو رہے تھے ورنہ سود کا کاروبار کرنے والے حضرات پکی لکھت پڑھت کے بغیر تو اپنے باپ کو بھی قرض نہیں دیتے۔"

رجب علی نے خوشامد آمیز انداز میں کہا۔ "ولی بھائی، آپ مجھے اتنے عرصے سے جانتے ہیں۔ میں دھوکے باز نہیں ہوں۔ آپ کی رقم نہیں ڈوبے گی۔"

"بھائی، تم مجھے آزمائش میں مت ڈالو۔" ولی بھائی نے چڑچڑے لہجے میں کہا۔

حور بانو نے ایک تجویز پیش کی۔ "ولی بھائی، آپ چاہیں تو مجھ سے اس رقم کی رسید لکھوا لیں۔"

"کمال کرتی ہیں آپ بھی۔" ولی بھائی نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ "میں نے قرض تو رجب علی کو دیا ہے، آپ سے رسید کس طرح لکھوا سکتا ہوں۔"

"رجب علی ہو یا میں، ایک ہی بات ہے۔"

ولی بھائی سوچ میں پڑ گیا۔ تھوڑی دیر بعد بولا۔ "بالفرضِ محال، میں آپ سے رسید لکھوا بھی لوں تو اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ آپ مجھے رقم لوٹا بھی سکیں گے۔ آپ کی مالی حالت تو خاصی ناگفتہ بہ ہے۔"

"اس کا ایک حل ہو سکتا ہے۔" رجب علی نے کہا۔ "آپ یہ رسید اس گھر کی ضمانت پر بھابھی صاحبہ سے لکھوا لیں۔ اس سے بڑی گارنٹی اور کیا ہو سکتی ہے۔ یہ گھر پانچ لاکھ روپے سے کم کا تو نہیں ہوگا۔ کیوں بھابھی، آپ کو تو اس میں کوئی اعتراض نہیں ہے؟"

اس سارے چکر میں حور بانو کی عقل ماؤف ہو چکی تھی۔ اُس نے غیر ارادی طور پر کہا۔

"مجھے بھلا کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔"

"رجب صاحب، آپ کی تجویز میں وزن ہے۔" ولی بھائی نے پُرخیال انداز میں کہا۔

"یہ بالکل مناسب رہے گا اور حور بانو صاحبہ بھی اس پر معترض نہیں ہیں۔ ویسے بھی آپ لوگ کوئی غیر تو ہیں نہیں۔ گھر کی بات ہے۔"

"ظاہر ہے، رسید میں لکھوں یا بھابھی صاحبہ۔ ایک ہی بات ہے۔ ویسے بھی میں نے یہ قرض انہی کی ایک ضرورت کے تحت آپ سے لیا تھا۔" رجب علی نے آخری جملہ حور بانو سے نظریں چراتے ہوئے ادا کیا تھا۔

حور بانو کو اپنے دیور کی یہ بات عجیب سی تو محسوس ہوئی تھی لیکن وہ خاموش رہی۔ اُس کا ذہن پوری طرح کام نہیں کر رہا تھا اور رجب علی اُسے اُلجھن میں ڈال کر شکار کرنے کا ارادہ باندھے بیٹھا تھا۔

ولی بھائی نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "بس تو پھر ٹھیک ہے۔ میں کل ایک اسٹیمپ پیپر لے کر آ جاؤں گا اور یہیں بیٹھ کر رسید لکھ لی جائے گی۔"

اس کے بعد وہ رخصت ہو گیا۔

دوسرے روز وہ حسب وعدہ ایک اسٹیمپ پیپر لے کر آ گیا۔ اسٹیمپ پیپر کے مندرجات کو بغور پڑھے بغیر حور بانو نے دستخط کر دیئے۔ بس وہ ایک لاکھ ساڑھے ستاسی ہزار کی رقم پڑھ کر مطمئن ہو گئی تھی۔ ویسے بھی ان پے درپے آفات نے اُسے سوچنے سمجھنے کے قابل ہی کہاں چھوڑا تھا۔

وہ دستخط کر چکی تو رجب علی نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ "بھابھی، یہ سب کچھ انتہائی مجبوری کی حالت میں کیا گیا ہے۔ آپ مجھ سے ناراض تو نہیں نا؟"

وہ بے چارگی سے بولی۔ "میں ناراض ہو کر کیا کروں گی۔"

"آپ میرے خلوصِ نیت پر بھروسہ کریں۔"

"اس کے سوا اور چارہ بھی کیا ہے۔"

ولی بھائی نے اسٹیمپ پیپر کو تہ کر کے جیب میں ڈالتے ہوئے کہا۔ "حور بانو صاحبہ، اب یہ بھی بتا دیں کہ میں اپنی رقم کی وصولی کے لئے کب حاضر ہو جاؤں؟"

"میں سردست آپ کو کچھ نہیں بتا سکتی۔" حور بانو نے نحیف سی آواز میں کہا۔ "آپ مجھے سوچنے کا موقع دیں۔"

ولی بھائی نے اُٹھتے ہوئے کہا۔ "آپ ضرور سوچیں۔ مگر اس میں دیر نہ لگائیں۔ آپ جتنی

تاخیر کرتی جائیں گی، سود کی رقم میں اضافہ ہوتا جائے گا۔"

"مگر اتنی جلدی تو......" حور بانو کی آواز کپکپا کر رہ گئی۔

"میں آپ کو زیادہ سے زیادہ ایک ماہ کی چھوٹ دے سکتا ہوں۔" ولی بھائی نے دریا دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ "آپ کی مجبوریوں کے پیشِ نظر میں اس ایک ماہ میں سود بھی نہیں لوں گا۔لیکن ایک ماہ بعد جب میں آؤں تو مجھے میری رقم تیار ملنا چاہئے۔"

ولی بھائی کے جانے کے بعد حور بانو نے پریشان نظروں سے رجب علی کو دیکھا۔ "ہم کس مصیبت میں پھنس گئے ہیں رجب علی؟"

"ہاں، اب تو واقعی ہم پھنس گئے ہیں۔"

"ایک لاکھ ساڑھے ستاسی ہزار روپے کوئی معمولی رقم نہیں ہوتی۔" حور بانو نے تشویش ناک لہجے میں کہا۔ "ایک ماہ کے اندر اس کا بندوبست کرنا ناممکنات میں سے ہے۔"

رجب علی نے بھابھی کی پریشانی میں اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ "اور مجھے نہیں لگتا کہ ولی بھائی ہمیں مزید مہلت دے گا۔ وہ لاکھ میرا جاننے والا سہی لیکن سود خور لوگ وصولی کے معاملے میں کسی کی نہیں سنتے۔"

"ایک ماہ بعد اُسے مطلوبہ رقم نہ ملی تو میرا خیال ہے وہ ہمارے دروازے پر دھرنا مار کر بیٹھ جائے گا۔" حور بانو کی پریشانی بڑھتی جارہی تھی۔ "پھر محلے میں ہماری کیا عزت رہ جائے گی۔"

"میرا خیال ہے، بھائی صاحب کو ساری صورت حال سے آگاہ کر دیا جائے۔" رجب علی نے پُرتشویش لہجے میں کہا۔

حور بانو نے نفی میں سر ہلا دیا۔ "نہیں، اُن کے ساتھ جو واقعہ پیش آچکا ہے وہ اسی کے صدمے سے نڈھال ہیں۔ ہمیں ان سے اپنی تازہ ترین مصیبتوں کا ذکر نہیں کرنا چاہئے...... اور پھر وہ جیل میں رہتے ہوئے ہماری کیا مدد کرسکیں گے۔تم ہی کوئی حل نکالو رجب علی۔"

"بہت سوچتا ہوں لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔" وہ مصنوعی بے چارگی چہرے پر سجا کر بولا۔ "پھر بھی آپ زیادہ فکرمند نہ ہوں۔ میں کچھ نہ کچھ ضرور کروں گا۔"

وہ ایک ماہ رجب علی نے حور بانو کو تسلیاں دیتے ہوئے گزار دیا۔ حور بانو نے ایک عقل مندی کی بات یہ کی تھی کہ ولی بھائی کے ساتھ سارے مذاکرات زیریں منزل پر کئے تھے اور اپنے بچوں کو ان کے بارے میں ہوا تک لگنے نہیں دی تھی۔ مزید برآں اُس نے اپنی پریشانی بھی بچوں پر ظاہر نہیں ہونے دی تھی۔

ایک ماہ پورا ہونے کے بعد ولی بھائی آدھمکا۔ پھر اُس نے صبح و شام پھیرے لگانا شروع

کر دیئے۔ محلے میں پہلے ہی حور بانو کی پوزیشن خراب ہو چکی تھی۔ جب سے شجاعت علی غبن کے الزام میں جیل گیا تھا، اہلِ محلہ نے اُس کو مشکوک نظروں سے دیکھنا شروع کر دیا تھا۔ ان حالات میں ولی بھائی کا شب و روز دروازہ کھٹکھٹانا اور قرض کی وصولی کے لئے شور شرابا کرنا سونے پر سہاگا ثابت ہو رہا تھا۔ حور بانو کے اعصاب جواب دے گئے۔

ایک روز اُس نے روہانسی آواز میں رجب علی سے کہا۔ "میں مزید بے عزتی برداشت نہیں کرسکتی۔"

"مجھے خود بہت شرمندگی ہو رہی ہے کہ میں آپ کے لئے کچھ نہیں کر پا رہا ہوں۔" رجب علی نے ندامت آمیز لہجے میں کہا۔

وہ بولی۔ "اس ذلت آمیز زندگی سے بچنے کے لئے میں نے ایک فیصلہ کرلیا ہے۔ جہاں ستیاناس وہاں سوا ستیاناس۔"

"کیسا فیصلہ بھابھی؟" رجب علی نے چونک کر اُس کی طرف دیکھا۔

"میں یہ مکان فروخت کردوں گی۔" وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔

رجب علی کو اسی دن کا انتظار تھا۔ وہ اندرونی خوشی کو چھپاتے ہوئے بظاہر ہمدردی سے بولا۔ "اگر مکان بِک گیا تو جانتی ہیں بھائی صاحب کو کتنا دُکھ پہنچے گا۔"

"عزت سے بڑی کوئی چیز نہیں ہوتی رجب علی۔" حور بانو نے مستحکم لہجے میں کہا۔ "میں عزت بچانے کے لئے یہ قدم اٹھا رہی ہوں۔ جب وہ رہا ہو کر گھر آئیں گے تو میں انہیں ساری صورت حال بتا دوں گی۔ وہ میری مجبوریوں کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، وہ مجھ پر بہت اعتماد کرتے ہیں۔"

"آپ نے بالکل ٹھیک سوچا ہے۔" رجب علی نے مکاری سے بھابھی کی تائید کی۔ "اب تو واقعی اس کے سوا کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ آپ بے فکر ہو جائیں۔ میں کل ہی ولی بھائی سے بات کرتا ہوں۔"

"ولی بھائی سے بات کرنے کی کیا ضرورت ہے؟"

رجب علی نے کہا۔ "ہم اُس کی مرضی کے بغیر یہ مکان فروخت نہیں کرسکتے۔"

"کیا مطلب؟" حور بانو نے سوالیہ نظروں سے رجب علی کو دیکھا۔ "یہ مکان ہمارا ہے۔ ہم جب چاہیں، اسے فروخت کر دیں۔ ہمیں ولی بھائی سے اجازت لینے کی کیا ضرورت ہے۔"

"شاید آپ نے اس اسٹیمپ پیپر کو توجہ سے نہیں پڑھا تھا۔"

"کیوں؟" حور بانو کی حیرانی دوچند ہوگئی۔ "اس میں ایسی کیا بات تھی؟"

رجب علی نے بتایا۔ "اس اسٹیمپ پیپر میں ایک شق یہ بھی درج تھی کہ آپ ولی بھائی کی آمادگی کے بغیر یہ مکان فروخت نہیں کرسکتیں کیونکہ آپ نے اسی مکان پر تو اس سے قرض لیا ہے۔"

"اوہ!" حور بانو ایک دم برسوں کی بیمار نظر آنے لگی۔

رجب علی نے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ ولی بھائی ہماری مجبوری کے پیش نظر مکان کی فروخت میں روڑے نہیں اٹکائے گا۔ میں اسے بتاؤں گا کہ ہم یہ مکان اس کا قرض ادا کرنے کے لئے ہی فروخت کررہے ہیں۔ مجھے اُمید ہے، وہ میری بات مان جائے گا۔"

رجب علی، حور بانو کو پوری طرح اپنے شکنجے میں کس چکا تھا۔ اب وہ اُسی کے رحم و کرم پر تھی۔ عورتوں میں ایک بڑی خامی یہ ہوتی ہے کہ وہ پریشان کن حالات کو اپنے شوہروں سے پوشیدہ رکھنے کی کوشش کرتی ہیں۔ رجب علی نے مختلف مواقع پر حور بانو کو آزما کر اندازہ کرلیا تھا کہ چاہے اس پر کیسی بھی افتاد آن پڑے، وہ اپنے شوہر شجاعت علی کو اس کے بارے میں کچھ نہیں بتائے گی۔ اس کا خیال تھا کہ اس طرح شجاعت علی کی پریشانیوں میں اضافہ ہوجائے گا اور یہی اس کا غلط خیال تھا۔ ممکن ہے اگر حور بانو شجاعت علی کو اپنے موجودہ حالات سے آگاہ کرتی تو وہ کچھ نہ ہو پاتا جو شجاعت علی کو بے خبر رکھنے کے سبب ہوگیا تھا۔

دوسرے روز رجب علی، حور بانو کے لئے یہ "نوید مسرت" لے کر آیا کہ ولی بھائی کو اُس نے مکان فروخت کرنے پر راضی کرلیا ہے۔ اس کے بعد رجب علی نے بتایا۔

"ولی بھائی کا خیال ہے کہ ہم یہ مکان اس کے ہاتھ بیچ دیں۔"

حور بانو نے کہا۔ "ہمیں تو مکان بیچنا ہے، چاہے کوئی بھی خریدے۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔"

"لیکن بھابھی، وہ پیسے بہت کم بتا رہا ہے؟"

"مثال کے طور پر کتنے؟"

رجب علی نے کہا۔ "ولی بھائی نے پیش کش کی ہے کہ وہ ہمیں مزید ایک لاکھ بارہ ہزار پانچ سو روپے دینے کو تیار ہو ہے۔"

حور بانو نے کچھ دیر سوچ کر حساب لگایا پھر بولی۔ "یعنی وہ تین لاکھ میں یہ دو منزلہ مکان خریدنا چاہتا ہے؟"

"ہاں بھابھی، اُس نے یہی قیمت لگائی ہے۔" رجب علی نے کہا۔

"یہ تو بہت کم ہے۔" حور بانو نے شکستہ لہجے میں کہا۔ "تمہیں یاد ہوگا رجب، جب تم نے اس مکان سے اپنا حصہ الگ کیا تھا تو اس وقت مکان کی قیمت تین لاکھ لگائی گئی تھی اور یہ تین سال پہلے کی بات ہے۔"

"ہاں، مجھے اچھی طرح یاد ہے۔"

وہ بولی۔ "اس وقت میرے خیال میں تو یہ مکان کسی بھی طور چار، ساڑھے چار لاکھ سے کم کا نہیں ہے۔ ولی بھائی تو ہمیں بے بس دیکھ کر لوٹنے کی کوشش کررہا ہے۔"

"آپ کہیں تو میں کسی پراپرٹی ایجنٹ سے بات کروں؟"

حور بانو نے اجازت دے دی۔

رجب علی نے نقلی پراپرٹی ایجنٹوں کو مکان دکھانا شروع کردیا۔ اب وہ اپنے منصوبے کے آخری مرحلے میں داخل ہو چکا تھا۔ اُس کی ہدایت کے مطابق، اُس کے لائے ہوئے جعلی پراپرٹی ڈیلروں نے اس مکان کی انتہائی قیمت ساڑھے تین لاکھ روپے لگائی۔

حور بانو ساڑھے تین لاکھ روپے میں مکان فروخت کرنے پر آمادہ ہوگئی۔ اُس نے کہا۔

"اگر مکان ساڑھے تین لاکھ میں بک جائے تو ولی بھائی کی رقم مع سود ادا کرنے کے بعد بھی ہمارے پاس ایک لاکھ باسٹھ ہزار پانچ سو روپے بچ جائیں گے۔ جبکہ وہ مردود ہمیں محض ایک لاکھ بارہ ہزار پانچ سو روپے دے رہا تھا۔" ایک لمحے کے توقف کے بعد اُس نے اضافہ کیا۔ "اس طرح سود خور سے بھی نجات مل جائے گی اور باقی کی رقم سے میں شجاعت علی کو بھی رہا کروالوں گی۔"

"وہ کس طرح بھابھی؟" رجب علی نے چونکنے کی اداکاری کی۔

"سیدھی سی بات ہے۔" حور بانو نے اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔ "شجاعت علی پر ڈیڑھ لاکھ روپے کے غبن کا الزام ہے۔ میں یہ رقم ٹریڈنگ کمپنی کے مالک کے ہاتھ پر رکھ کر کہوں گی...... یہ لیں جناب، میں آپ کا نقصان پورا کئے دیتی ہوں۔ آپ مقدمہ واپس لے لیں۔ اس طرح شجاعت علی خود بخود رہا ہو جائیں گے۔"

"ترکیب تو اچھی ہے۔" رجب علی نے پُرخیال انداز میں کہا۔ "لیکن اس میں ایک قباحت ہے۔"

"وہ کیا؟" حور بانو نے اُسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

رجب علی نے کہا۔ "مکان فروخت کرنے کے بعد ہم بے گھر ہو جائیں گے۔ مجھے اپنی تو پرواہ نہیں لیکن آپ کے ساتھ تین بچے بھی ہیں۔ بلکہ فوزیہ تو اب جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ چکی

ہے۔ آپ ان بچوں کے ساتھ کہاں سر چھپاتی پھریں گی۔ زمانہ بہت خراب ہے۔ فوزیہ کے ساتھ پہلے جو واقعہ پیش آچکا ہے، ابھی تک اس کے زخم مندمل نہیں ہوئے۔''

حور بانو نے اُلجھن آمیز لہجے میں کہا۔ ''لیکن مکان کو فروخت کرنے کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہیں۔ ولی بھائی کے ہاتھوں جو رُسوائی ہو رہی ہے وہ بھی کم تو نہیں ہے۔''

رجب علی کی دانست میں لوہا گرم ہو چکا تھا اور بھرپور چوٹ لگانے کا وقت آن پہنچا تھا۔ وہ کچھ دیر تک گہری سوچ میں ڈوبا رہا پھر گمبھیر لہجے میں بولا۔

''میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ گھر سے بے گھر بھی نہ ہوں اور تمام معاملات بھی خوش اسلوبی سے نمٹ جائیں۔''

''یہ کس طرح ممکن ہے؟''

''اگر آپ چاہیں تو سب کچھ ممکن ہو سکتا ہے۔''

''میں...... میں تمہاری بات سمجھ نہیں سکی رجب علی!'' وہ حیرت آمیز لہجے میں بولی۔

''بات بہت آسان سی ہے۔'' رجب علی نے کینچلی بدلتے ہوئے کہا۔ ''آپ یہ مکان میرے ہاتھ فروخت کر دیں۔''

''یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟'' حور بانو پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔

وہ سنجیدہ لہجے میں بولا۔ ''میں آپ سے یہ مکان چار لاکھ میں خریدنے کو تیار ہوں...... اور آپ کو کہیں جانا بھی نہیں پڑے گا۔ آپ اسی گھر میں بدستور رہتی رہیں گی۔ بس گھر کا مالک بدل جائے گا لیکن گھر کی بات گھر میں ہی رہے گی۔''

''لیکن تمہارے پاس اتنی رقم کہاں سے آئے گی؟'' وہ بے یقینی سے اپنے دیور کو دیکھ رہی تھی۔ تھوڑی دیر پہلے تک انتہائی پُرخلوص اور ہمدرد نظر آنے والا رجب علی اب بالکل بدل چکا تھا۔ حور بانو اس اچانک تبدیلی پر حیرت کے سمندر میں غوطہ زن تھی۔

رجب علی نے کہا۔ ''آپ اس بات کو چھوڑیں کہ میں رقم کہاں سے مہیا کروں گا۔ اگر آپ کو چار لاکھ میں سودا منظور ہے تو بتائیں، آپ ولی بھائی کی ایک لاکھ ستاسی ہزار پانچ سو روپے کی مقروض ہیں۔ میں آپ کو دو لاکھ ساڑھے بارہ ہزار نقد دینے کو تیار ہوں۔ آپ یہ مکان میرے ہاتھ بیچ دیں۔ ولی بھائی کی رقم میں خود ادا کر دوں گا اور اس سے پہلے میں آپ کو وہ اسٹیمپ پیپر بھی واپس لا دوں گا جس پر آپ نے مکان کی ضمانت پر دستخط کئے تھے۔''

حور بانو نے کمزور سی آواز میں کہا۔ ''ولی بھائی سے قرض تو تم نے لیا تھا رجب علی!''

''بجا فرمایا آپ نے۔'' وہ طنزیہ مسکراہٹ ہونٹوں پر سجاتے ہوئے بولا۔ ''واقعی وہ قرض

میں نے ہی لیا تھا۔ لیکن آپ اس بات کو کیوں بھول رہی ہیں کہ وہ رقم فوزیہ کی بازیابی پر خرچ ہوئی تھی۔ اس میں میرا کیا قصور ہے؟ کیا آپ یہ کہنا چاہتی ہیں کہ مجھے آپ کے مشکل وقت میں کام نہیں آنا چاہئے تھا۔ شاید میں نے کوئی بہت بڑی غلطی کر دی ہے۔''

''میرا یہ مطلب نہیں تھا۔'' وہ جز بز ہو کر بولی۔

''پھر کیا مطلب تھا؟'' رجب علی کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات اُبھر آئے۔ ''بھلائی کا تو کوئی زمانہ ہی نہیں رہا۔ اگر خدانخواستہ فوزیہ کے ساتھ کوئی اُونچ نیچ ہو جاتی تو پھر آپ کو پتہ چلتا۔''

حور بانو نے معتدل لہجے میں کہا۔ ''میں تمہاری شکر گزار ہوں کہ تم اس کڑے وقت میں میرے کام آئے۔ لیکن یہ مت بھولو کہ مجھ پر سے وہ کڑا وقت ابھی ٹلا نہیں ہے۔ ولی بھائی نے ایک لاکھ ستاسی ہزار پانچ سو روپے کے لئے مکان کی ضمانت لکھوائی ہے۔ بقول تمہارے، تم یہ مکان خریدنے کی صورت میں مجھے دو لاکھ ساڑھے بارہ ہزار روپے نقد دینے کو تیار ہو۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ تم اُس رقم سے ولی بھائی کا قرض ادا کر دیتے۔ ہم پر سے مصائب کے سائے ٹل جاتے اور ہم راضی خوشی رہنے لگتے۔''

''میں اب اتنا بھی بے وقوف نہیں ہوں۔'' رجب علی نے بے مروتی سے کہا۔ ''میں اگر کچھ رقم خرچ کروں گا تو اس کے بدلے میں کچھ چاہوں گا بھی۔ اگر آپ یہ مکان مجھے بیچ دیں تو آپ کا کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ میرا یہ وعدہ ہے کہ میں تاحیات آپ کو اس مکان سے بے دخل نہیں کروں گا۔ مکان چھوٹے بھائی کی ملکیت ہو یا بڑے بھائی کی، اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔''

حور بانو کے سامنے اس وقت وہی تین سال قبل والا رجب علی بیٹھا ہوا تھا۔ وہی بدخصلت رجب علی جس نے طیب حسین کی وفات کے بعد مکان کے بٹوارے کا ٹنٹا کھڑا کر دیا تھا۔

''مجھے بہت افسوس ہے رجب علی!'' حور بانو نے شکایتی نظروں سے اُسے دیکھا۔ ''تم شجاعت علی کی غیر موجودگی میں میری مجبوریوں کا سودا کر رہے ہو۔''

رجب علی نے کہا۔ ''بھابھی، اس دور میں ہر انسان اپنا فائدہ سوچتا ہے اور یہ کوئی نامناسب بات بھی نہیں ہے۔ آپ ناشاد نہ ہوں۔ میں آپ کو کوئی تکلیف نہیں پہنچنے دوں گا۔ پھر میں آپ سے مکان کوئی چھین تھوڑی رہا ہوں۔ آپ کو مارکیٹ ویلیو سے کچھ زیادہ ہی دے رہا ہوں۔''

حور بانو ایک ٹھنڈی آہ بھر کر رہ گئی۔ مصیبتیں اُس پر چاروں جانب سے ٹوٹ کر برسی

تھیں۔ وہ بے دست و پا ہو کر رہ گئی تھی۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ رجب علی اُس کی مجبوری سے فائدہ اُٹھا کر مالک مکان بن جانا چاہتا تھا۔ مگر اُس کے پاس کوئی نعم البدل نہیں تھا۔ ولی بھائی کے ہاتھوں ذلیل و رُسوا ہونے سے بہتر تھا کہ وہ رجب علی کی بات مان لے۔ کیونکہ اس صورت میں ایک فائدہ یہ تھا کہ انہیں گھر چھوڑ کر کہیں جانا نہ پڑتا۔ جبکہ اگر ولی بھائی یا کوئی دوسرا شخص یہ مکان خریدتا تو فوری طور پر اس کے سامنے رہائش کا مسئلہ کھڑا ہو جاتا اور وہ بھی تین بچوں کے ساتھ جن میں ایک جوان بیٹی بھی تھی۔ اصولی طور پر ان حالات میں اُسے اپنے شوہر کو ضرور باخبر کر دینا چاہئے تھا۔ لیکن اُسے ڈر تھا کہ شجاعت علی اس صدمے کو برداشت نہیں کر پائے گا۔ اور یہی اُس کی بھول تھی۔ ہوسکتا تھا، شجاعت علی کوئی اور مناسب حل تلاش کر لیتا اس مسئلے کا۔

رجب علی نے بڑی مہارت سے حور بانو کے چاروں طرف اپنی سازش کا جال بُنا تھا کہ وہ چاروں شانے چت ہوگئی تھی۔ اُس کے پاس رجب علی کی بات ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا...... اور اس نے رجب علی کی بات مان لی۔

رجب علی دوسرے روز ولی بھائی کو ساتھ لے کر آ گیا۔ مکان کی فروخت کے سلسلے میں ایک قانونی مسئلہ یہ درپیش تھا کہ وہ مکان شجاعت علی کے نام تھا اور اُس کی مرضی کے بغیر اسے فروخت نہیں کیا جا سکتا تھا۔ لیکن یہ سارا گورکھ دھندا شجاعت علی کی لاعلمی میں کیا جا رہا تھا۔ یہ بھی رجب علی کی ایک چال تھی۔ اُس نے بعد ازاں شجاعت علی کے بندوبست کے بارے میں بھی سوچ رکھا تھا۔

واضح رہے کہ بہت سی باتیں مجھے بعد میں معلوم ہوئی تھیں لیکن قارئین کی سہولت کے پیش نظر میں تمام واقعات ترتیب وار رقم کر رہا ہوں۔

قصہ مختصر، رجب علی نے ولی بھائی کی موجودگی میں دو لاکھ ساڑھے بارہ ہزار روپے (جن میں شجاعت علی کی الماری سے اُڑائے ہوئے ڈیڑھ لاکھ روپے کے علاوہ وہ رقم بھی شامل تھی جو رجب علی گاہے بگاہے وکیل کی فیس کی آڑ میں حور بانو سے نکلواتا رہتا تھا) حور بانو کو تھمائے اور مکان کی فروخت کے سلسلے میں تیار کئے ہوئے کاغذات پر دستخط کرنے کو کہا جو چار لاکھ روپے کی رسید اور ایک بانڈ پر مشتمل تھے۔

حور بانو نے کہا۔ ”مگر مجھے تو صرف دو لاکھ ساڑھے بارہ ہزار روپے ہی ملے ہیں۔ میں کیسے چار لاکھ کی رسید پر دستخط کر دوں؟“

”میں نے ولی بھائی کی رقم ادا کر دی ہے۔“ رجب علی نے کہا۔ پھر اپنی جیب میں سے

اسٹیمپ پیپر نکال کر حور بانو کو دکھایا۔ ”یہ دیکھیں، ولی بھائی نے رقم وصول کرنے کے بعد مجھے واپس کر دیا ہے۔ یہ آپ کے سامنے بیٹھے ہیں، آپ چاہیں تو تصدیق کر لیں۔“

حور بانو نے سوالیہ نظروں سے ولی بھائی کو دیکھا، ولی بھائی نے کہا۔ ”ہاں، رجب علی ٹھیک کہہ رہا ہے۔ مجھے میرے پیسے مل چکے ہیں۔“

رجب علی نے کہا۔ ”بھابھی، ابھی آپ کے سامنے میں یہ اسٹیمپ پیپر پھاڑ کر پھینک دوں گا۔ پہلے ذرا آپ دستخط کر دیں۔“

ناچار حور بانو نے چار لاکھ روپے کی رسید پر دستخط کر دیئے اور بانڈ بھی لکھ دیا۔ اس کے بعد رجب علی نے حسب وعدہ وہ اسٹیمپ پیپر حور بانو کی نظروں کے سامنے پُرزے پُرزے کر دیا۔ اس ساری ڈیل پر بطور گواہ ولی بھائی نے بھی دستخط کئے تھے۔

ولی بھائی کے رخصت ہو جانے کے بعد حور بانو پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ رجب علی نے اُسے چپ کرانے کی کوئی کوشش نہیں کی بلکہ اُلٹا ایک مالک مکان کی حیثیت سے حکم صادر کیا۔ ”بھابھی، آپ جلد از جلد زیریں منزل پر منتقل ہو جائیں۔ اب اوپر کی منزل پر میں رہوں گا۔“

حور بانو نے آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی آواز میں کمزور سا احتجاج کیا۔ ”رجب علی، جب تمہارے پاس اتنی رقم موجود تھی تو تم نے ہمارے ساتھ ایسا سلوک کیوں کیا؟“

”میرے پاس تمہارے اس فضول سوال کا کوئی جواب نہیں ہے۔“ رجب علی نے جذبات سے عاری لہجے میں کہا۔ وہ پھر ”آپ“ سے ”تم“ پر اُتر آیا تھا۔

حور بانو کے پاس سوائے صبر کے کوئی چارہ نہیں تھا۔ چنانچہ دوسرے روز وہ اپنے بچوں کو لے کر زیریں منزل پر منتقل ہوگئی۔ بچوں نے اس منتقلی پر متعدد سوالات اپنی ماں سے پوچھے تھے۔ وہ خوب صورت بہانے تراش تراش کر ان کی تشفی کرتی رہی۔

مکان تو اُس کے ہاتھ سے نکل چکا تھا البتہ دو لاکھ ساڑھے بارہ ہزار روپے اُس کے پاس موجود تھے۔ وہ ان تمام تر مصائب میں بھی اپنے شوہر کو نہیں بھولی تھی۔ اُس نے فیصلہ کیا کہ پہلی فرصت میں وہ شجاعت علی کی رہائی کا بندوبست کرے گی۔ لیکن ٹریڈنگ کمپنی کے مالک سے بات کرنے سے قبل اُس نے شجاعت علی سے بات کرنے کا فیصلہ کیا۔

اور یہ فیصلہ اُسے بہت مہنگا پڑا۔ اگر وہ مکان کی فروخت سے پہلے اپنے شوہر کو تمام حالات سے آگاہ کر دیتی تو ممکن تھا وہ ان آفات سے محفوظ رہتی جو بعد میں اس پر نازل ہوئیں۔

مکان کی فروخت اور رجب علی کی بدسلوکی پر پردہ ڈالتے ہوئے اُس نے شجاعت علی کو اُس کی رہائی کے لئے اپنے منصوبے سے آگاہ کیا۔ وہ شجاعت علی سے ملاقات کرنے جیل گئی تھی اور مکان کی فروخت والے واقعے کو کم وبیش ایک ماہ گزر چکا تھا۔ یہ ستمبر 1973ء تھا۔ جبکہ مکان پچھلے ماہ یعنی اگست میں فروخت ہوا تھا۔

پوری بات سننے کے بعد شجاعت علی نے سوال کیا۔ ''حور بانو، تمہارے پاس اتنی رقم کہاں سے آئی کہ تم کمپنی کے مالک کو ڈیڑھ لاکھ روپے دینے کے بارے میں منصوبے بنا رہی ہو؟''

حور بانو اس سوال پر بوکھلا گئی۔ کوئی بہانہ کرنے کے لئے اُسے موزوں الفاظ نہیں مل رہے تھے۔ شوہر نے بیوی کی پریشانی کو بھانپ لیا۔

''کیا بات ہے حور بانو!'' شجاعت علی نے تشویش ناک لہجے میں دریافت کیا۔ ''تم مجھ سے کچھ چھپا رہی ہو؟''

وہ نظریں چراتے ہوئے بولی۔ ''نہیں تو، ایسی تو کوئی بات نہیں۔''

''اگر ایسی کوئی بات نہیں ہے تو میرے سوال کا جواب کیوں نہیں دیا تم نے؟''

''وہ...... وہ......'' آواز اُس کے حلق میں اٹک کر رہ گئی۔

شجاعت علی پریشان ہو گیا۔ ''دیکھو حور بانو، میں ایک ناکردہ جرم کی سزا بھگت رہا ہوں۔ اگرچہ ابھی تک عدالت میں مقدمہ چل رہا ہے لیکن مجھے اُمید نہیں کہ میری بے گناہی ثابت ہو جائے گی۔ جیل کی اس کوٹھری میں ایک سال سے زیادہ ہو گیا ہے مجھے...... تمہاری اور بچوں کی یادوں کے سہارے میں زندہ ہوں۔ مجھ سے کچھ مت چھپاؤ۔ جو بات ہے، صاف صاف بتا دو...... تمہیں میری قسم۔''

حور بانو کے صبر وضبط کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ آنسوؤں کی دھاریں بہاتے ہوئے اُس نے خود پر ٹوٹنے والے مظالم کی طویل داستان پوری تفصیل کے ساتھ شجاعت علی کے گوش گزار کر دی۔

شجاعت علی اپنی بیوی اور لاڈلی بچی فوزیہ پر پڑنے والی افتاد کی داستانِ الم سن کر غصے سے تھر تھر کانپنے لگا۔ اُس کے ساتھ ہی وہ با آوازِ بلند رجب علی کو برا بھلا بھی کہتا جا رہا تھا۔ اُس نے پوری قوت سے جیل کی سلاخوں کو تھام رکھا تھا اور طیش کے عالم میں اُس کا پورا وجود لرز رہا تھا۔ اُس کا بس چلتا تو سلاخیں توڑ کر باہر نکل آتا۔

اس کے ساتھ ہی ملاقات کا وقت ختم ہو گیا۔ جیل کا عملہ اُسے پہلے ہی ملاقات کی اجازت نہیں دے رہا تھا۔ اُس نے جیل حکام کی منت خوشامد کی تو ایک رحم دل شخص نے اُسے دس

پندرہ منٹ کی ملاقات کی اجازت دے دی تھی۔ وہ شوہر سے پوری بات بھی نہیں کر پائی تھی کہ اُسے بحالت مجبوری واپس آنا پڑا۔

حور بانو اپنے شوہر کو جیل کی قید سے رہا کروانے کی کوششوں میں مصروف تھی۔ لیکن اسی شب، شجاعت علی زندگی کی قید سے آزاد ہو گیا۔ رات کے پچھلے پہر اُس پر برین ہیمرج کا حملہ ہوا تھا۔ اُس کے دماغ کی کوئی نس پھٹ گئی تھی۔ صبح جیل کی کوٹھری میں اُس کی لاش پائی گئی تھی۔ حور بانو کو پیش آمدہ حالات نے اُس کی جان لے لی تھی۔ ایک طرح سے شجاعت علی کی موت کا ذمے دار رجب علی ہی تھا۔

حور بانو نے طے کر لیا کہ شوہر کی تجہیز و تکفین کے بعد وہ کہیں اور اپنا ٹھکانہ کر لے گی۔ اُس کے پاس اتنی رقم موجود تھی کہ وہ کوئی چھوٹا موٹا مکان لے کر با آسانی گزارہ کر سکتی تھی۔ لیکن وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ اُس کا برا وقت ختم نہیں ہوا تھا۔ ابھی کئی مصائب منہ کھولے اُس کی راہ دیکھ رہے تھے۔

شجاعت علی کی موت کے بعد چند روز تک گھر میں خاصی بھیڑ رہی جیسا کہ عام طور پر ایسے مواقع پر ہوتا ہے۔ سوم کے بعد حور بانو پر یہ رُوح فرسا انکشاف ہوا کہ گھر میں رکھی ہوئی رقم چوری ہو گئی تھی...... حور بانو کی تو کمر ہی ٹوٹ گئی۔ گزشتہ دنوں زیریں منزل پر رجب علی کی خاصی آمد و رفت رہی تھی۔ یہ کام اُس کے سوا اور کس کا ہو سکتا تھا۔ لیکن بغیر کسی ثبوت کے وہ اُسے موردِ الزام نہیں ٹھہرا سکتی تھی۔ اس لئے شب و روز آنسوؤں سے اپنا ہی چہرہ دھونے لگی۔

شجاعت علی کی وفات کے بعد حیرت انگیز طور پر رجب علی کا رویہ حور بانو کے ساتھ بہت ہمدردانہ اور پُرخلوص ہو گیا تھا۔ وہ دن رات اُس کی دل جوئی میں لگا رہتا اور ہر وقت فکرمند نہ ہونے کی تلقین کرتا رہتا۔

حور بانو کو اُس کی شکل سے بھی نفرت ہو گئی تھی مگر حالات نے اُسے اس گھر میں رہنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ رجب علی کے تازہ ترین رویئے پر حیرت زدہ تھی۔ وہ بچوں کے ساتھ بھی نہایت شفقت سے پیش آنے لگا تھا اور اُن کی چھوٹی سے چھوٹی ضروریات کا خیال رکھتا۔ حور بانو، رجب علی کی اس کایا پلٹ پر ابھی پوری طرح حیران بھی نہیں ہو پائی تھی کہ بلی تھیلے میں سے باہر نکل آئی۔

ایک روز اُس نے حور بانو سے کہا۔ ''آپ کو دوسری شادی کر لینی چاہئے بھابھی!''

گزشتہ تین سال میں رجب علی نے گرگٹ کی طرح رنگ بدلے تھے۔ ایک مرتبہ پھر وہ ''تم'' سے ''آپ'' پر آ گیا تھا۔

حور بانو نے چونک کر اُس کی طرف دیکھا۔ ''تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہوگیا؟''
وہ زیرِلب مسکرانے لگا۔ مسکراہٹ کی وجہ سے چہرے پر آ جانے والی رونق کے بجائے اس وقت اُس کے چہرے پر ایک مکروہ تاثر اُبھر آیا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں حرص و ہوس کے سائے لہرا رہے تھے۔ عورت کی چھٹی حس بہت تیز ہوتی ہے۔ حور بانو کو واضح طور پر محسوس ہوا کہ رجب علی اُس کے حسین سراپا پر اپنے دانت تیز کر رہا تھا۔ وہ بے اختیار دوسری طرف دیکھنے لگی۔

''بھابھی، آپ نے بالکل ٹھیک کہا ہے۔'' رجب علی نے لہجے میں حد درجہ شائستگی سموتے ہوئے کہا۔ ''واقعی میرا دماغ خراب ہوگیا ہے۔ آپ خوب صورت ہی اتنی ہیں کہ......''
''بس رجب علی، آگے ایک لفظ بھی نہ کہنا۔'' حور بانو نے اُسے ٹوک دیا۔
وہ بولا۔ ''میں جانتا ہوں، آپ کو مجھ سے بہت شکایات ہیں۔ لیکن میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ اپنی ہر زیادتی کی تلافی کر دوں گا۔''
''میں نے کہا نا، میں اس موضوع پر کچھ سننا نہیں چاہتی۔'' وہ حتمی لہجے میں بولی۔ ''اگر تم نہیں چاہتے کہ میں اپنے بچوں کو لے کر کہیں چلی جاؤں تو آئندہ مجھ سے ایسی بات نہ کہنا۔''
رجب علی خاموش ہوگیا۔ چند روز بعد حور بانو نے بلوچ کالونی میں ایک گارمنٹس فیکٹری میں ملازمت کر لی تاکہ وہ اور اُس کے بچے رجب علی کے احسان تلے دب کر کمزور نہ پڑنے لگیں۔ اس کے ساتھ ہی اُس نے فیصلہ کیا کہ وہ گارمنٹس فیکٹری کے مالک سے درخواست کرے گی کہ وہ اسے اتنے پیسے بطورِ پیشگی دے دے جس سے وہ کوئی کرائے کا مکان لے کر علیحدہ رہنے لگے۔ رجب علی کے تیوروں سے اُس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ اب اس کے ساتھ زیادہ دن نباہ نہیں ہو سکے گا۔
گارمنٹس فیکٹری کے مالک نے پانچ ہزار روپے بطورِ پیشگی دینے کے لئے رضامندی تو ظاہر کر دی لیکن ساتھ ہی ایک کڑی ''شرط'' بھی لگا دی۔ حور بانو اُس کا ''مطالبہ'' کسی صورت پورا نہیں کر سکتی تھی لہٰذا ایڈوانس والا معاملہ کھٹائی میں پڑ گیا۔ ان لمحات میں اُس نے انتہائی دل شکستگی کے عالم میں سوچا۔ ''کاش میں اتنی خوبصورت نہ ہوتی!''
رجب علی مکان پر قبضہ تو کر ہی چکا تھا لیکن مکان کی رجسٹری اور انتقال والا معاملہ باقی تھا۔ شجاعت علی کی زندگی میں یہ معاملہ جتنا کٹھن تھا، اُس کی موت کے بعد اتنا ہی آسان ہوگیا تھا۔ اب اس مکان کی مالک و مختار حور بانو ہی تھی۔ اگر وہ کسی طرح بہلا پھسلا کر اُسے شیشے میں اتار لیتا تو پھر قانونی طور پر مکان اُس کے نام منتقل ہو جاتا۔ اس سلسلے میں رجب علی نے

پہلی چال شادی والی چلی تھی جو سرِدست ناکام ہوگئی تھی۔
اب اُس نے دوسرے طریقوں سے حور بانو کو تنگ کرنا شروع کر دیا۔ مثال کے طور پر سب سے پہلے تو اُس نے زیریں منزل پر رہائش پذیر ہونے کا کرایہ طلب کر لیا۔ حالانکہ شروع میں اس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ تاحیات نہ تو اس سے کرایہ مانگے گا اور نہ ہی انہیں بے دخل کرے گا۔

حور بانو فی الحال مجبوریوں کے شکنجے میں اس طرح کسی جا چکی تھی کہ وہ کرائے والے مطالبے کو ماننے کے لئے تیار ہوگئی۔ جس گھر کا کرایہ شجاعت علی اپنے بھائی سے محض چار سو روپے وصول کرتا تھا، اب یہ خبیث اور بدمعاش اپنی بے یار و مددگار بھابھی سے اسی گھر کا کرایہ پانچ سو روپے وصول کر رہا تھا۔ مزے کی بات یہ تھی کہ ان حالوں کو بھی اُسے اسی دیور نے پہنچایا تھا۔ حور بانو کو فیکٹری سے بارہ سو روپے ماہوار ملتے تھے، پانچ سو وہ کرائے کی مد میں دے کر جیسے تیسے سات سو میں اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پال رہی تھی۔ سب سے زیادہ حرج بچوں کی تعلیم کا ہو رہا تھا جو پہلے معیاری پرائیویٹ سکولوں میں پڑھتے تھے لیکن حالات کی ستم ظریفی نے انہیں گورنمنٹ کے سکولوں میں لا پھینکا تھا۔
ان کٹھن حالات میں ایک لمحے کے لئے اُس کے ذہن میں یہ خیال بھی آیا کہ وہ رجب علی کی بات مان کر اس سے شادی کر لے۔ لیکن دوسرے ہی لمحے اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔ وہ شوہر کے قاتل اور اسے مصائب سے دوچار کرنے والے شخص کو بھلا کیوں کر اپنا سکتی تھی۔ وہ اس پر موت کو ترجیح دیتی۔
رجب علی نے جب کسی بھی طرح دال گلتے ہوئے نہیں دیکھی تو کھل کر سامنے آ گیا۔ ایک روز اُس نے حور بانو سے کہا۔
''حور بانو، میں نے بہت انتظار کر لیا۔ اب تمہیں میری دو باتوں میں سے ایک بات ماننا ہوگی۔''
''کون سی دو باتیں؟''
''اوّل تو تم مجھ سے شادی کر لو۔''
''یہ کسی صورت میں ممکن نہیں ہے۔'' وہ دوٹوک لہجے میں بولی۔ ''اور یہ بات میں تمہیں پہلے بھی بتا چکی ہوں۔''
رجب علی نے کہا۔ ''تو پھر شرافت سے زمین اور مکان کے کاغذات میرے حوالے کر دو تاکہ میں رجسٹری کروا سکوں اور مکان میرے نام منتقل ہو جائے۔''

”مجھے سوچنے کا موقع دو۔“ حور بانو نے ایک خیال کے تحت کہا۔

وہ خوش ہوگیا۔ وہ یہی سمجھا تھا کہ شاید حور بانو اُس کے حق میں فیصلہ کرنے کے لئے سوچنا چاہتی ہے۔ وہ بولا۔ ”ٹھیک ہے، تم اچھی طرح میری تجویز پر غور کرلو۔“

رجب علی کے لئے اگر صرف مکان کے کاغذات کا مسئلہ ہوتا تو وہ بہت پہلے اس کا مطالبہ کر چکا ہوتا۔ وہ درحقیقت مکان کے ساتھ ساتھ ایک خوب صورت عورت کو بھی حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اگر حور بانو اس سے شادی کر لیتی تو باقی مسائل خود بخود حل ہو جاتے۔ اُس نے حور بانو پر مزید دباؤ ڈالنے کے لئے وکیل کے ذریعے مکان خالی کرنے کا نوٹس بھی بھجوا دیا جس کے مطابق وہ مکان فروخت کرنے کا ارادہ رکھتا تھا اور حور بانو کو تاکید کی گئی تھی کہ وہ ایک ماہ کے اندر اندر اپنا کوئی اور بندوبست کرلے۔“

حور بانو نے سوچنے کی مہلت اس لئے لی تھی کہ اُس کی فیکٹری میں ایک ایسی عورت بھی کام کرتی تھی جو حقوقِ نسواں کی کسی تنظیم سے منسلک تھی۔ وہ اس عورت سے مشورہ کرنا چاہتی تھی۔

مکان خالی کرنے کا نوٹس ملتے ہی حور بانو اس عورت کے پاس پہنچ گئی۔ اس عورت نے حور بانو کو اپنی تنظیم کی روحِ رواں بیگم کے ڈی خان سے ملوا دیا اور اب بیگم کے ڈی خان کے توسط سے حور بانو میرے سامنے بیٹھی ہوئی اپنی داستانِ دل خراش سنا رہی تھی۔

وہ سیدھی سادی اور بے وقوفی کی حد تک معصوم عورت اپنی کہانی ختم کرنے کے بعد امداد طلب نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ آنسوؤں سے دُھل کر اُس کا چہرہ کچھ اور روشن ہوگیا تھا اور آنکھوں کی چمک میں بے پناہ اضافہ ہوگیا تھا۔

میں نے اُس کی توقع کے مطابق تسلی بخش لہجے میں کہا۔ ”خاتون، آپ کا کیس تو اتنا سیدھا سادہ ہے کہ ممکن ہے، کورٹ میں جانا ہی نہ پڑے اور مسئلہ حل ہو جائے۔“

اُس نے بے یقینی سے میری طرف دیکھا۔ اُس کی آنکھوں میں سینکڑوں سوال تھے۔ میں نے کہا۔ ”آپ کی سادگی پر مجھے افسوس ہو رہا ہے کہ اپنے ہی گھر میں آپ کرائے دار کی حیثیت سے رہ رہی ہیں۔“

”میں اس گھر کو بیچ چکی ہوں۔“ وہ نحیف آواز میں منمنائی۔

میں نے کہا۔ ”یہیں پر آپ غلطی کر رہی ہیں۔“

”وکیل صاحب! میں نے وہ مکان چار لاکھ روپے میں فروخت......“

میں نے ہاتھ کے اشارے سے اُسے مزید بولنے سے روک دیا۔ ایک لمحے کے توقف

کے بعد میں نے کہا۔

”ذرا سوچ کر بتائیں، ولی بھائی کی موجودگی میں آپ نے جب بانڈ لکھا تھا اور چار لاکھ روپے کی رسید رجب علی کو دی تھی تو کیا اُس وقت آپ کے شوہر شجاعت علی زندہ تھے؟“

”ہاں، وہ زندہ تھے۔“ وہ پُر یقین لہجے میں بولی۔ ”مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ شجاعت کا انتقال ماہِ ستمبر کے آخری ہفتے میں ہوا تھا جبکہ میں نے مکان اگست کی ابتدائی تاریخوں میں بیچا تھا......لیکن آپ یہ سب کیوں پوچھ رہے ہیں؟“

میں نے کہا۔ ”آپ کی معلومات کے لئے عرض کرتا چلوں کہ جب آپ نے اپنے مکان کا سودا کیا، اس وقت آپ کے شوہر جیل میں تھے اور زندہ تھے۔ مکان چونکہ شجاعت علی کے نام ہے اس لئے ان کی زندگی میں نہ تو آپ اس مکان کا سودا کرسکتی ہیں اور نہ ہی اس کی ضمانت پر کسی قسم کا قرض لینے کا آپ کو اختیار حاصل ہے۔“

”یعنی مجھے بار بار بے وقوف بنایا گیا ہے؟“ وہ محوِ حیرت تھی۔

”ایسی ہی بات ہے۔“ میں نے کہا۔ ”آپ نے مکان کے سودے کے سلسلے میں جو بانڈ بھرا ہے اور جو چار لاکھ کی رسید لکھی ہے، اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ کیونکہ وہ آپ کے شوہر کی زندگی میں کیا گیا ہے جس کا نہ تو آپ کو حق پہنچتا تھا اور نہ ہی قانون اجازت دیتا تھا۔“

”تو گویا......“ بے اختیار اُس کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ یہ آنسو خوشی کے تھے۔

حور بانو جذبات کے ریلے سے نکلی تو میں نے تشفی آمیز لہجے میں کہا۔ ”آپ بالکل بے فکر ہو جائیں۔ میں کل ہی اس بدمعاش کو بے دخلی کا نوٹس بھیج دوں گا۔ وہ ساری چوکڑی بھول جائے گا اور سر کے بل میرے دفتر آئے گا۔“

”آپ جادوگر ہیں یا وکیل!“ اُس نے شوخ لہجے میں کہا۔

مجھے بے اختیار ہنسی آگئی۔ میں نے کہا۔ ”کیوں، میں نے ایسا کیا شعبدہ دکھا دیا؟“

وہ بولی۔ ”اس سے بڑا شعبدہ اور کیا ہوگا کہ آپ نے میری عقل پر پڑا ہوا پردہ سرکا دیا۔“

”اس میں میرا کوئی کمال نہیں ہے۔“ میں نے خوش دلی سے کہا۔ ”شاید آپ کی عقل کی بیداری کا وقت آگیا تھا جو آپ میرے پاس چلی آئیں۔“

”ہاں، واقعی میں تو یہ سمجھی بیٹھی تھی کہ میں نے مکان فروخت کر دیا ہے۔“ وہ شرمندگی آمیز لہجے میں بولی۔

میں نے کہیں پڑھا تھا کہ حسن اور عقل ایک جگہ نہیں رہ سکتے جیسا کہ ایک میان میں دو تلواریں نہیں رہتیں۔ وہ جس انتہا کی خوب صورت تھی، اتنی ہی بڑی بڑی حماقتوں کا ثبوت بھی

دیا تھا اُس نے۔

میں نے کہا۔ ''اگر آپ کے پاس مکان کی ملکیت سے متعلق کچھ دستاویزات یا کسی بھی قسم کے کاغذات ہوں تو وہ میرے حوالے کر دیں۔ کیونکہ آپ کے گھر میں کوئی بھی چیز محفوظ نہیں ہے۔''

اُس نے اپنے پرس میں سے چند کاغذات نکال کر مجھے دے دیئے۔ میں نے ضروری کاغذات اپنے پاس رکھ لئے جن میں اسی گز کے پلاٹ اور اس پر تعمیر شدہ دومنزلہ مکان کے کاغذات بھی شامل تھے اور یہ تمام کاغذات مرحوم شجاعت علی کے نام تھے۔

میں نے وکالت نامہ نکال کر اُس کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ ''مجھے اُمید تو یہی ہے کہ عدالت میں جانے کی نوبت نہیں آئے گی۔ میں اپنے دفتر میں ہی آپ کے دیور کو چھٹی کا دُودھ یاد دلاؤں گا۔ لیکن بطورِ احتیاط آپ یہ وکالت نامہ پُر کر کے دستخط کر دیں تا کہ بوقت ضرورت کام آئے۔''

حور بانو نے وکالت نامے کے مندرجات کا جائزہ لینے کے بعد دستخط کر دیئے۔ پھر میری فیس کے بارے میں پوچھا۔ ''میں نہیں جانتی آپ کتنی فیس لیتے ہیں اور اس وقت میرے پاس.....''

میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ''بیگم کے ڈی خان اپنے رُقعے میں میری فیس ادا کرنے کا وعدہ کر چکی ہیں۔ اور مجھے ان کے وعدے پر اعتبار بھی ہے لیکن.....'' میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''لیکن کیا وکیل صاحب؟'' اُس کی آنکھوں میں اُلجھن تیر گئی۔

میں نے ڈرامائی انداز میں کہا۔ ''جب میں آپ کے دیور کو آپ کے گھر سے بے دخل کر دوں گا اور آپ کو یقین ہو جائے گا کہ آپ ہی اپنے مرحوم شوہر کے ترکے کی حقیقی وارث ہیں تو آپ کو میری ایک پُرتکلف دعوت کرنا ہو گی، جیت کی خوشی میں۔''

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ ''ضرور.....ضرور۔''

میں نے اُسے پہلی مرتبہ کھل کر ہنستے ہوئے دیکھا تھا، واقعی اُس کے منہ سے پھول جھڑتے تھے۔

وہ رخصت ہونے لگی تو میں نے کہا۔ ''رجب علی سے ذرا بھی ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر وہ کوئی گڑبڑ کرنے کی کوشش کرتے تو فی الفور اپنے علاقے کے تھانے میں رپورٹ کر دیں۔ بعد کے معاملات میں خود سنبھال لوں گا۔ اب آپ میری مؤکلہ ہیں اور میری ذمے

داری بھی۔''

حور بانو شکریہ ادا کرنے کے بعد رخصت ہو گئی۔

❁.....❁
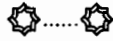
آئندہ روز میں نے رجب علی کے نام کا بے دخلی کا نوٹس بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک روانہ کر دیا۔ اس نوٹس میں، میں نے خصوصی طور پر اس بات پر زور دیا تھا کہ عرصہ پندرہ یوم کے اندر وہ نوٹس کا مثبت یا منفی جواب ارسال کر دے یا دفتر آ کر مجھ سے ملے۔ بصورتِ دیگر اُس کے خلاف میری مؤکلہ مسماۃ حور بانو کے مکان پر غاصبانہ قبضے کے سلسلے میں قانونی چارہ جوئی کی جائے گی۔

نوٹس کی ترسیل کے چوتھے یا پانچویں روز ایک کرخت صورت شخص، انتہائی غصے کے عالم میں میرے دفتر میں داخل ہوا اور نوٹس والا لفافہ میرے سامنے میز پر پٹختے ہوئے انتہائی بدتمیزی سے بولا۔ ''یہ نوٹس آپ نے مجھے بھیجا ہے؟''

وہ شکل ہی سے چھٹا ہوا بدمعاش اور لوفر نظر آتا تھا۔ میں اُس پر ایک نظر پڑتے ہی سمجھ گیا کہ وہ میری مؤکلہ کا دیور رجب علی تھا۔ اُس کی تمام تر بے ہودگی کو نظر انداز کرتے ہوئے میں نے نوٹس والے لفافے کو اُلٹ پلٹ کر دیکھا اور متحمل لہجے میں کہا۔ ''ہاں، یہ لفافہ تو میرے ہی دفتر کا لگتا ہے۔''

وہ ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا اور ناگوار لہجے میں بولا۔ ''آخر یہ نوٹس بھیجنے کا مقصد کیا ہے؟''

میں نے کہا۔ ''مقصد اس کے اندر تحریر کی شکل میں موجود ہے۔''

''وکیل صاحب!'' وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔ ''کیا آپ کی مؤکلہ نے آپ کو یہ نہیں بتایا کہ وہ مذکورہ مکان چار لاکھ روپے میں مجھے بیچ چکی ہے؟''

''اُس بے چاری کا پہلے تو یہی خیال تھا۔ لیکن مجھ سے ملاقات کے بعد اُس کے خیالات بدل چکے ہیں۔'' میں نے پُرسکون لہجے میں کہا۔

''اُس کے تازہ ترین خیالات کیا ہیں؟''

میں نے کہا۔ ''مکان کی اصلی مالک وہ ہے اور آپ نے زبردستی مکان پر قبضہ جما رکھا ہے۔''

''یہ پٹی آپ نے اُسے پڑھائی ہو گی؟''

''میں صرف اپنے مؤکلوں کو قانونی مشورے دیتا ہوں۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''آپ چاہے اسے پٹی پڑھانا سمجھیں یا کچھ اور۔''

رجب علی نے کہا۔ ''کسی زمانے میں یہ مکان حور بانو...... بلکہ شجاعت علی کا تھا۔ اب میں اسے خرید چکا ہوں اور اس کا قانونی مالک ہوں۔ میرے وکیل نے مجھے مشورہ دیا ہے کہ میں جلد از جلد اس عورت کو اپنے مکان سے بے دخل کر دوں تا کہ میرا قبضہ پکا ہو جائے۔''

''شاید اسی لئے آپ نے اُسے مکان خالی کرنے کا نوٹس بھی دے دیا ہے؟'' میں نے اُسے گھنے کی کوشش کی۔

''آپ خاصے سمجھدار وکیل ہیں۔'' اُس نے مجھے مکھن لگانے کی کوشش کی۔

میں نے کہا۔ ''تو گویا آپ صرف اسی لئے میری مؤکلہ کو بے دخل کرنا چاہتے ہیں کہ مکان پر آپ کا قبضہ مضبوط ہو جائے۔ اس سے یہ مطلب نکلتا ہے کہ ابھی آپ کی ملکیت مشکوک ہے؟''

وہ محتاط نظروں سے مجھے دیکھنے لگا، پھر بولا۔ ''ہرگز نہیں، میرے پاس اس مکان کی خرید کا دستاویزی ثبوت موجود ہے۔''

میں نے اُسے اندھیرے میں رکھنا مناسب سمجھا اور کہا۔ ''پھر تو آپ کو فکرمند ہونے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ آپ اس نوٹس کا تحریری جواب دے دیں۔ میں آپ کا جواب اپنی مؤکلہ تک پہنچا دوں گا۔''

وہ سوچ میں پڑ گیا۔ میں نے ہمدردی سے پوچھا۔ ''کیوں، ایسا کرنے میں کوئی پریشانی ہے؟''

''آں...... نہیں۔'' وہ چونک کر بولا۔ ''کوئی پریشانی نہیں ہے۔ لیکن میں نوٹس کے جواب میں لکھوں کیا؟''

''وہی لکھ دیں جو سچ ہے۔'' میں نے اُسے نظروں میں تولتے ہوئے کہا۔

وہ بولا۔ ''اگر اسے سچ پر یقین ہوتا تو وہ آپ کے پاس کیوں آتی؟''

''ہاں، یہ تو آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' میں نے اُس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

''وکیل صاحب!'' وہ کریدنے والے لہجے میں بولا۔ ''آپ نے نوٹس میں لکھا ہے کہ اگر میں نے کوئی تسلی بخش جواب نہیں دیا یا مکان سے بے دخل نہ ہوا تو میرے خلاف قانونی کارروائی کی جائے گی۔''

''ہاں، یہ تو ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اگر آپ نے مکان کو خالی نہ کیا تو مقدمہ عدالت میں جائے گا، پھر عدالت خود سچ اور جھوٹ کا فیصلہ کر لے گی۔''

''میں عدالت میں جانے سے نہیں ڈرتا۔'' وہ چہرے پر مصنوعی بے فکری طاری کرتے

ہوئے بولا۔ ''لیکن میں ایسا چاہتا نہیں ہوں۔''

''سچ کو آنچ نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''پھر آپ ایسا کیوں نہیں چاہتے۔ اگر آپ حق پر ہیں تو آپ کو خوف زدہ ہونا چاہئے اور نہ ہی احترام برتنا چاہئے۔''

وہ موضوع بدلتے ہوئے بولا۔ ''حور بانو کے پاس ایسا کون سا ٹھوس ثبوت ہے جس کی بناء پر وہ عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانا چاہتی ہے؟''

اُس کے دل کا چور آخر کار اُس کی زبان پر آ گیا تھا۔ میں نے واضح طور پر محسوس کیا تھا کہ وہ عدالت میں جائے بغیر ہی معاملہ رفع دفع کرنا چاہتا تھا۔ سچ کہا جاتا ہے کہ جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے۔ اُس کا تو سارا منصوبہ ہی جھوٹ پر مبنی تھا۔

میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''حور بانو میری مؤکلہ ہے۔ میں اُس کے ہر راز کا امین ہوں۔ آپ مجھ سے کیا اُگلوانا چاہتے ہیں؟''

اُس نے بات کو ہنسی میں اڑاتے ہوئے بے تکلفی سے کہا۔ ''وکیل صاحب! لگتا ہے، آپ پر بھی اُس کے حسن کا جادو چل گیا ہے۔''

مجھے اُس کا انداز ناگوار گزرا۔ تاہم میں نے ضبط کرتے ہوئے کہا۔ ''کیا کسی اور پر بھی اُس کے حسن کا جادو چل چکا ہے؟''

''ایک سحر زدہ تو آپ کے سامنے بیٹھا ہے۔'' وہ مغموم لہجے میں بولا۔ ''وکیل صاحب، آپ اپنی مؤکلہ کو سمجھائیں۔ میں چاہتا ہوں، گھر کی بات گھر میں ہی ختم ہو جائے۔''

''آپ کا مطلب ہے، میں آپ کی وکالت کروں؟''

وہ بھونڈے انداز میں ہنسا۔ ''میں آپ کو اس کی فیس دوں گا۔''

میں نے کہا۔ ''کوئی وکیل مخالف پارٹی کا کیس اس وقت تک نہیں لے سکتا جب تک دونوں پارٹیاں باہمی رضامندی سے اسے ثالث نہ منتخب کر لیں۔''

''آپ کی بات میرے دل کو لگی ہے۔'' وہ خوش ہوتے ہوئے بولا۔ ''میں آپ کو اپنا ثالث مقرر کرتا ہوں۔ آپ اپنی مؤکلہ سے بھی پوچھ لیں۔ اگر آپ کی موجودگی میں تصفیہ ہو جائے تو وہ عدالت کے دھکے کھانے سے بچ جائے گی۔ مجھے اُس کا بڑا خیال ہے وکیل صاحب۔ آخر وہ میرے بھائی کی عزت ہے اور میں اُسے اپنی عزت بنانا چاہتا ہوں۔''

''آپ کے خیالات جان کر مجھے خوشی ہوئی ہے۔'' میں نے اُس کی جھوٹی تعریف کی۔ ''ورنہ آج کل اس طرح کون سوچتا ہے۔''

وہ سمجھا کہ میں اُس کی باتوں میں آ گیا ہوں۔ میں نے سوچا، اگر گھی سیدھی اُنگلی سے نکل

رہا ہو تو خوامخواہ اُنگلی ٹیڑھی کرنے کی کیا ضرورت ہے۔

وہ آگے جھکتے ہوئے رازدارانہ انداز میں بولا۔ ''آپ ایک ہوشیار وکیل ہیں۔ یہ تو سمجھ ہی گئے ہوں گے کہ میں کیا چاہتا ہوں۔ آپ کسی طرح حور بانو کو اس شادی کے لئے تیار کر لیں۔ میں آپ کو ڈگنی فیس دوں گا۔''

''فیس تو میں آپ سے ضرور لوں گا۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن پہلے اپنی مؤکلہ کو اس بات کے لئے راضی کر لوں کہ میں ثالث بن کر آپ کا معاملہ نمٹا رہا ہوں۔''

''بس تو پھر مجھے اجازت دیں۔'' وہ اُٹھتے ہوئے بولا۔

میں نے کہا۔ ''آپ دو روز کے بعد اسی وقت دوبارہ میرے دفتر آ جائیں۔ میں اپنی مؤکلہ سے بات کر لوں گا۔'' پھر میں نے چونکتے ہوئے اضافہ کیا۔ ''اور ہاں، وہ آپ کے پاس مکان کی ملکیت کے جو دستاویزی ثبوت ہیں، وہ بھی ساتھ لیتے آئیں۔''

''اُن کی کیا ضرورت ہے؟'' وہ بگڑ کر بولا۔

میں نے کہا۔ ''بس میں ایک نظر دیکھنا چاہتا ہوں۔ اگر آپ نے مجھے ثالث مقرر کرنے کا فیصلہ کر ہی لیا ہے تو مجھ پر بھروسہ بھی کریں۔''

وہ دستاویزات ساتھ لے کر آنے کا وعدہ کر کے رخصت ہو گیا۔

میں دراصل ان دستاویزات کے مندرجات کو پڑھ کر یہ اندازہ لگانا چاہتا تھا کہ کیس کی نوعیت کیا بنے گی۔ اس طرح میں بہت زیادہ آسانی سے اپنی مؤکلہ کا کیس لڑ سکتا تھا۔

میں نے دوسرے روز حور بانو کو بھی ساری صورتِ حال سے آگاہ کر دیا اور تاکید کی کہ وہ صبر و تحمل سے ڈٹی رہے اور کسی قسم کے خوف یا پریشانی کا اظہار نہ کرے۔ میں انشاء اللہ بہت جلد اس موذی سانپ کو پٹارے میں بند کر دوں گا۔ وہ مطمئن ہو گئی۔

دو روز بعد حسب وعدہ رجب علی میرے دفتر میں آیا۔ وہ چالاک شخص اصل دستاویز لانے کے بجائے ان کی فوٹو کاپی لایا تھا۔ تاہم میرے لئے یہ بھی کافی تھا۔ دستاویز پر درج تاریخ اگست کے پہلے ہفتے کی تھی جبکہ شجاعت علی کا انتقال ستمبر کی آخری تاریخوں میں ہوا تھا۔ میں یہی اطمینان کرنا چاہتا تھا۔

میں فوٹو کاپی کا بغور معائنہ کر چکا تو رجب علی نے پوچھا۔ ''وکیل صاحب، آپ نے اپنی مؤکلہ سے بات تو کر لی ہو گی۔ کیا جواب دیا ہے اُس نے؟''

میں نے پہلے سے طے شدہ پروگرام کے تحت جواب دیا۔ ''حور بانو مصالحت کے لئے تیار ہے۔ لیکن اُس کا کہنا ہے کہ پہلے آپ اُس کے مکان کو خالی کریں۔ اس کے بعد ہی وہ شادی

کے بارے میں کوئی فیصلہ کرے گی۔''

''اُس کا مکان؟'' رجب علی نے عجیب سے لہجے میں منہ بگاڑ کر کہا۔

میں نے کہا۔ ''کیا یہ درست ہے کہ آپ حور بانو سے شادی کرنا چاہتے ہیں؟''

اُس نے اثبات میں جواب دیا۔ میں نے پوچھا۔ ''اور آپ کا دعویٰ ہے کہ آپ اُس سے محبت بھی کرتے ہیں؟''

''محبت ہی نے تو مجھے کمزور بنا دیا ہے بیگ صاحب۔'' وہ ایک سرد آہ بھرتے ہوئے بولا۔

''میں نہیں چاہتا کہ وہ دربدر ہو ورنہ......''

''ورنہ آپ ابھی اور اسی وقت اُسے دھکے دے کر اس گھر سے نکال دیتے۔'' میں نے اُس کا جملہ مکمل کرتے ہوئے کہا۔ ''ایسی ایک کوشش آپ اُسے بے دخلی کا نوٹس بھیج کر کر چکے ہیں۔ کیوں؟''

میرا انداز اُسے پسند نہیں آیا، رُوٹھے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''آپ تو اوّل آخر اُسی کی حمایت کئے جا رہے ہیں۔ جب کہ آپ نے ثالث بننے کا وعدہ کیا تھا؟''

میں نے کہا۔ ''مسٹر رجب علی، آپ کے بیان کے مطابق آپ کو اپنی بیوہ بھابھی سے بے پناہ ہمدردی اور محبت ہے ورنہ آپ اُسے سڑک پر پھنکوا دیتے۔ ایک بات کان کھول کر سن لیں اور وہ یہ کہ محبت اور ہمدردی سراسر خسارے کا سودا ہے۔ اس میں ہمیشہ دیا ہی جاتا ہے، کچھ لینے کی توقع نہیں رکھنا چاہئے۔''

''یعنی آپ مجھے یہ مشورہ دینا چاہتے ہیں کہ میں وہ مکان حور بانو کے حوالے کر کے آپ کے فیصلے کا انتظار کروں۔''

''میرے خیال میں یہی آپ کے حق میں بہتر رہے گا۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔

وہ بے مروّتی سے بولا۔ ''میں ایسی محبت اور ہمدردی سے باز آیا۔''

''گویا آپ مصالحت سے انکاری ہیں؟''

وہ بولا۔ ''حور بانو سے صرف ایک ہی شرط پر تصفیہ ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ پہلے وہ مجھ سے شادی کرے، بعد ازاں میں یہ مکان اُس کے نام لگا دوں گا۔''

احمق انسان مجھے بے وقوف بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے اُسے خوش فہمی میں مبتلا رہنے دیا۔ جو مکان اُس کا تھا ہی نہیں، وہ شادی کے بعد اُسے حور بانو کے نام لگوانے کی باتیں کر رہا تھا۔

میں نے کہا۔ ''ٹھیک ہے رجب علی، میں آپ کی تجویز اپنی مؤکلہ کے سامنے رکھوں گا۔''

دیکھیں وہ کیا جواب دیتی ہے۔''

''جواب تو اُسے میری مرضی کے مطابق ہی دینا ہوگا۔'' وہ رعونت آمیز لہجے میں بولا۔

میں نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔''اگر ایسا ہو جائے تو مجھے بھلا کیا اعتراض ہوسکتا ہے۔ جب میاں بیوی راضی تو کیا کرے گا قاضی۔''

مجھے پورا اندازہ ہو گیا تھا کہ رجب علی کو عدالت میں گھسیٹنا بہت ضروری تھا۔ اُس میں انسانیت نام کو نہیں تھی۔ وہ لاتوں کا بھوت تھا جو باتوں سے قابو میں آنے والا نہیں تھا۔ اور میں لاتیں چلانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔

میں نے کوئی عملی قدم اٹھانے سے پہلے حور بانو کو اعتماد میں لے کر اپنے پروگرام سے آگاہ کر دیا۔ عدالت میں استغاثہ دائر کرنے کے ساتھ ساتھ مجھے حور بانو کو رجب علی کے شر سے بھی محفوظ کرنا تھا اوراس کے لئے ضروری تھا کہ وہ اس گھر سے بے دخل ہو جائے۔

میں نے پوری طرح اسٹڈی کرنے کے بعد ایک طویل ترین عرضیِ دعویٰ تیار کی جس میں طیب حسین کی موت کے بعد سے لے کر رجب علی کے حور بانو کو بے دخلی کے نوٹس بھجوانے تک کے حالات بالتفصیل بیان کئے گئے تھے۔ رجب علی کے پاس موجود دستاویزات کی فوٹو کاپیاں بھی میں نے درخواست دعویٰ کے ساتھ منسلک کر دی تھیں۔ اگرچہ شجاعت علی کی کمپنی سے چوری ہونے والی رقم اور حور بانو کے گھر سے غائب ہونے والی رقم کا کوئی واضح ثبوت نہیں تھا لیکن میں نے ان واقعات کو حوالے کے طور پر درج کر دیا اور عدالت سے استدعا کی کہ وہ حور بانو کے گھر کو رجب علی کے غاصبانہ قبضے سے آزاد کرانے کے احکامات جاری کرے۔ میں نے درخواست کا مضمون اس انداز کا رکھا تھا کہ رجب علی کے فراڈ کا پول باآسانی کھل جائے۔ فوزیہ کے اغواء اور بازیابی کا واقعہ میں نے خاص طور پر رقم کیا تھا اور ولی بھائی کو بھی گھسیٹنا نہیں بھولا تھا۔

اگلے روز میں عدالت میں پہنچا تو حور بانو میری ہدایت کے مطابق دو معزز پڑوسیوں کے ساتھ وہاں موجود تھی۔ اُن کے نام فقیر حسین اور فرزند علی تھے۔ میں نے استغاثہ میں ان دونوں افراد کا نام بطورِ گواہ شامل کر لیا تھا۔ انہوں نے حور بانو کے حق میں گواہی دینے پر آمادگی ظاہر کر دی تھی۔

میں نے عدالت میں حاضر ہو کر پیش کار کو ساری صورتِ حال سے آگاہ کیا اور حور بانو کی جانب سے وکالت نامہ داخل کر کے استغاثہ دائر کر دیا۔

میں نے عرضیِ دعویٰ اتنی پُراثر اور رقت انگیز تحریر کی تھی کہ متعلقہ عدالت نے مذکورہ

درخواست پر حکم امتناعی جاری کر دیا اور رجب علی کو فوری طور پر حور بانو کے گھر سے نکل جانے کے احکامات صادر کر دیئے۔ گویا ہمیں اسٹے آرڈر حاصل ہو گیا تھا۔

یہ ایک ایسی کامیابی تھی کہ حور بانو خاصی پُراعتماد نظر آنے لگی تھی۔ میں نے حور بانو کی حفاظت کے پیش نظر دفتر پہنچتے ہی تھانے فون کیا۔ حور بانو کے علاقے کا تھانہ انچارج میرا ایک دیرینہ دوست تھا۔

رابطہ ہونے پر میں نے ایس ایچ او کو اسٹے آرڈر کی تفصیلات بتانے کے بعد پوچھا۔

''آپ مکان نمبر سات سو باون بی پر کارروائی کرنے کب جا رہے ہیں؟''

اُس نے پوچھا۔''یہ اسٹے آرڈر کب جاری ہوا ہے؟''

''آج صبح۔ میرا خیال ہے کہ کل تک آپ کو عدالت کی طرف سے چٹھی مل جائے گی۔'' میں نے بتایا۔ پھر حور بانو کی مظلومیت اور نازک پوزیشن کی وضاحت کرنے کے بعد کہا۔ ''دراصل میری خواہش ہے کہ کارروائی کے وقت میں بھی وہاں موجود رہوں۔ رجب علی خاصا خطرناک آدمی ہے۔''

''آپ سے زیادہ خطرناک تو نہیں ہو گا بیگ صاحب!'' وہ بے تکلفی سے قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔ ''ویسے آپ بے فکر رہیں۔ آپ کی مؤکلہ کی رہائش میرے تھانے کی حدود میں ہے۔ اُس کی حفاظت میرا فرض ہے۔ میں دیکھ لوں گا اُس تیس مار خان کے سالے کو۔'' ایک لمحے کے توقف کے بعد کہا۔''اگر آپ وہاں آنے کے لئے پر تول چکے ہیں تو کل شام چھ بجے تشریف لے آئیں۔''

میں نے شکریہ ادا کر کے فون بند کر دیا۔

✡......✡
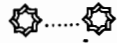
آئندہ روز جب میں اپنی گاڑی میں مکان نمبر سات سو باون بی پر پہنچا تو بیلف دو کانسٹیبلوں کی مدد سے عدالتی احکامات کی تعمیل میں مصروف تھا۔ رجب علی کا سامان باہر گلی میں رکھا جا چکا تھا اور وہ سخت ہراساں نظر آ رہا تھا۔

میں اپنی گاڑی سے اُتر کر ایس ایچ او کی جانب بڑھا تو رجب علی فوری طور پر میرے پاس آ گیا۔

''یہ کیا ہو رہا ہے بیگ صاحب؟''

میں نے بے رُخی سے کہا۔''وہی جو اس قسم کے معاملات میں ہوتا آیا ہے۔''

''مگر آپ تو ہمارے ثالث تھے۔'' وہ شکایتی لہجے میں بولا۔ ''ہمارے درمیان تصفیہ کرانے

کے بجائے یہ کیا کروا دیا آپ نے؟''

میں نے کہا۔''میں نے ثالثی کا وعدہ ضرور کیا تھا مگر میری ایک بھی بات تمہاری سمجھ میں نہیں آئی۔ تم تو میرے نوٹس کا جواب بھی دینے پر تیار نہیں ہوئے۔''

''نوٹس ووٹس کو گولی ماریں۔'' وہ جھنجھلاہٹ آمیز لہجے میں بولا۔ پھر جوڑ توڑ کی کوشش میں مصروف ہو گیا۔''بیگ صاحب! میرا خیال ہے، حور بانو میرے نوٹس کے جواب میں یہ سب کچھ کروا رہی ہے۔ ایسا کرتے ہیں کہ میں اپنا نوٹس واپس لے لیتا ہوں، آپ یہ کارروائی رُکوا دیں۔''

میں نے کہا۔''اب مصالحت کا وقت گزر چکا ہے۔ تمہیں جو کچھ کہنا ہے، اپنے وکیل کے ذریعے عدالت میں کہنا۔'' ایک لمحے کے توقف سے میں نے چوٹ کی۔''زیادہ بہتر ہوگا کہ تم وکیل صفائی اسی شخص کو مقرر کرو جس کے مشورے پر تم نے حور بانو کے مکان پر اپنا قبضہ پکا کرنے کے لئے اسے مکان خالی کرنے کا نوٹس بھیجا تھا۔''

وہ بل کھا کر رہ گیا۔ تھانے دار ہماری تمام گفتگو سن رہا تھا، مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے اُس نے کھا جانے والی نظروں سے رجب علی کو گھورا اور دھمکی آمیز لہجے میں بولا۔

''میں اس علاقے کا تھانے دار ہوں بچو۔ اب اس گلی کا رُخ کیا یا کسی بھی طریقے سے حور بانو کو تنگ کرنے کی کوشش کی تو...... گزار دوں گا۔''

وہ سہم کر ایک طرف ہٹ گیا اور اپنے خلاف ہونے والی کارروائی کو بے بسی سے دیکھنے لگا۔

میں نے تھانے دار سے کہا۔''زخمی سانپ سے ہوشیار رہنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں آپ سے درخواست کروں گا کہ حور بانو کی حفاظت کی خاطر کسی سادہ لباس اہلکار کو تعینات کر دیں۔''

''اس پہلو کی طرف میری نظر ہے۔'' وہ تسلی آمیز لہجے میں بولا۔''اگر اس بدمعاش نے میلی نگاہ سے حور بانو کی جانب دیکھا بھی تو میں اس کی ایسی کی تیسی کر دوں گا۔''

میں حور بانو کو تسلی تشفی دینے کے بعد مطمئن ہو کر واپس لوٹ آیا۔

✡......✡
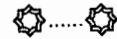
رجب علی نے اپنے وکیل کی مدد سے جوابِ دعویٰ داخل کر دیا جس میں اُس نے مکان پر اپنی ملکیت کا تذکرہ بڑھ چڑھ کر کیا تھا۔ اُس نے یہ مؤقف اختیار کیا تھا کہ شجاعت علی کے غبن کیس میں جیل جانے کے بعد حور بانو کے معاشی حالات انتہائی خراب ہو گئے تھے۔ آمدنی مسدود ہو جانے کے باعث اُس نے بحالت مجبوری اُس کے ہاتھ مکان فروخت کر دیا۔ اس

کے علاوہ بھی بہت سی باتیں تھیں جو یقینی طور پر اُس کے حق میں اور حور بانو کی مخالفت میں جاتی تھیں۔

میں صفحات کی تنگی کے باعث عدالت کی ابتدائی کارروائی کا ذکر حذف کرتے ہوئے صرف اہم گواہوں کا بیان اور جرح آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔

استغاثہ کی جانب سے فقیر حسین اور فرزند علی نے باری باری حلف اٹھانے کے بعد اپنا بیان ریکارڈ کرایا جو سراسر حور بانو کی حمایت میں تھا۔ وکیل صفائی نے رسمی سے سوالات کے بعد جرح ختم کر دی۔

حور بانو نے اپنا طویل بیان ختم کیا تو وکیل صفائی نے خاصی سخت جرح کی لیکن حور بانو نے ہر سوال کا مدلل اور دندان شکن جواب دیا۔

صفائی کے گواہوں میں صرف ولی بھائی کا اکلوتا نام شامل تھا۔ اُس نے سچ بولنے کا حلف اٹھانے کے بعد مختصر سا بیان دیا۔

وکیل صفائی نے سرسری سی جرح کے بعد اپنی سیٹ سنبھال لی۔ میں اپنی جگہ سے اٹھا اور جج کی اجازت حاصل کرنے کے بعد جرح کے لئے گواہ، ولی بھائی کے کٹہرے کے پاس آ کھڑا ہوا۔

میں نے اپنی جرح کا آغاز کرتے ہوئے سوال کیا۔''ولی بھائی صاحب! آپ ملزم رجب علی کو کب سے جانتے ہیں؟''

اُس نے جواب دیا۔''کافی عرصے سے۔''

کچھ دیر سوچنے کے بعد اُس نے جواب دیا۔''قریب قریب دس سال۔''

میں نے اگلا سوال کیا۔''ولی بھائی! کیا یہ سچ ہے کہ آپ سود پر لوگوں کو قرض دیتے ہیں؟''

اُس نے اثبات میں جواب دیا۔''جی ہاں، یہ میرا کاروبار ہے۔''

''کیا آپ کو معلوم نہیں کہ آپ اسلامی جمہوریہ پاکستان کے ایک شہری ہیں؟''

''اس میں کیا شک ہے۔'' وہ میرے سوال کو سمجھ نہیں سکا۔

میں نے پوچھا۔''ولی بھائی! کیا آپ مسلمان ہیں؟''

''الحمدللہ۔'' اُس نے حلق کی گہرائی سے جواب دیا۔

''پھر تو آپ کو یہ بھی معلوم ہوگا کہ اسلام نے سود کے کاروبار کو سختی سے منع فرمایا ہے؟''

وہ بوکھلا گیا، لکنت آمیز لہجے میں بولا۔''ہم کسی کے گھر جا کر منت نہیں کرتے کہ آؤ اور ہم سے قرض لے لو۔ لوگوں کی مجبوریاں انہیں کھینچ کر ہمارے پاس لے آتی ہیں۔''

میں نے پوچھا۔ ''کیا آپ نہیں جانتے کہ اسلام نے سود کی ہر صورت کی ممانعت کی ہے؟''

وکیل صفائی فی الفور اُس کی مدد کو دوڑا۔ ''مجھے سخت اعتراض ہے جناب عالی۔'' اُس نے احتجاجی لہجے میں کہا۔ ''میرے فاضل دوست آؤٹ آف ٹاپک سوالات کر رہے ہیں۔''

''تھینک یو مائی ڈیئر کونسلر۔'' میں نے وکیل صفائی کی جانب شکر گزار نظروں سے دیکھا پھر ولی بھائی کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''ولی بھائی!'' میں نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے سوال کیا۔ ''کیا یہ سچ ہے کہ گزشتہ سال جنوری کے مہینے میں ملزم رجب علی نے آپ سے سود پر ڈیڑھ لاکھ روپے بطورِ قرض لئے تھے؟''

اُس نے اثبات میں جواب دیا۔ میں نے پوچھا۔ ''آپ نے یہ قرض پانچ فیصد سود کی شرح پر دیا تھا؟''

''جی ہاں، آپ کی معلومات درست ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''کیا آپ معزز عدالت کو بتائیں گے کہ ملزم نے آپ سے کس مقصد کی خاطر وہ قرض لیا تھا؟''

''ہم قرض لینے والوں سے یہ سوال نہیں کرتے۔'' اُس نے جواب دیا۔ ''یہ ہمارے کاروباری اصولوں کے منافی ہے۔''

''آپ یہ بار بار ''ہم'' اور ''ہمارے'' کا صیغہ استعمال کر رہے ہیں۔'' میں نے سوال کیا۔

''کیا آپ کا باقاعدہ کوئی گروہ ہے؟''

وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''اس ''ہم'' سے مراد میں ہی ہوں۔''

مین نے پوچھا۔ ''ولی بھائی! میری معلومات کے مطابق ملزم نے گزشتہ سال اگست کے مہینے میں آپ کی رقم مع سود جو کہ پانچ فیصد فیصد ماہانہ کے حساب سے ڈیڑھ لاکھ روپے پر پانچ ماہ میں ساڑھے سینتیس ہزار روپے بنتی ہے، یعنی کل رقم ایک لاکھ ساڑھے ستاسی ہزار واپس لوٹا دی تھی؟''

''جی ہاں، بالکل ایسا ہی ہوا تھا۔''

میں نے محسوس کیا، جج بڑی دلچسپی سے میری جرح سن رہا تھا۔ میں نے جج کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یور آنر، میں معزز عدالت سے استدعا کروں گا کہ گواہ ولی بھائی کے جواب ''جی ہاں، بالکل ایسا ہی ہوا تھا'' کو خاص طور پر نوٹ کیا جائے۔'' پھر میں دوبارہ ولی بھائی کی

طرف متوجہ ہو گیا۔

''ولی بھائی! گزشتہ سال ماہِ اگست میں فروخت مکان کے سلسلے میں ملزم رجب علی اور اس مقدمے کی مدعیہ کے درمیان کوئی دستاویز تیار کی گئی تھی جس پر بطورِ گواہ آپ کے دستخط بھی موجود تھے۔ آپ معزز عدالت کو بتائیں کہ وہ کس قسم کی دستاویز تھی؟''

ولی بھائی نے دستاویز کی حقیقت مختصر الفاظ میں بیان کر دی۔ میں نے سوال کیا۔ ''ولی بھائی! کیا آپ کی آنکھوں کے سامنے ملزم نے میری مؤکلہ کو دو لاکھ ساڑھے بارہ ہزار روپے کی رقم دی تھی؟''

''جی ہاں، مکان کا سودا چار لاکھ ہی میں ہوا تھا۔''

''اگر مکان کا سودا چار لاکھ میں ہوا تھا تو ملزم نے محض دو لاکھ ساڑھے بارہ ہزار روپے ہی کیوں ادا کئے تھے؟''

ولی بھائی نے جواب دیا۔ ''کیونکہ وہ ایک لاکھ ساڑھے ستاسی ہزار روپے مجھے پہلے ہی دے چکا تھا۔''

''ابھی آپ نے معزز عدالت کو بتایا ہے کہ وہ ایک لاکھ ساڑھے ستاسی ہزار روپے ملزم نے آپ کا قرض مع سود ادا کیا تھا۔'' میں نے ولی بھائی کو تیز نظروں سے گھورا۔ ''پھر اس رقم کا مکان کی فروخت سے کیا تعلق ہے؟''

میرے سوال کے جواب میں ولی بھائی نے ہچکچاتے ہوئے وہ تفصیل بتائی جو ولی بھائی اور ملزم رجب علی کی ملی بھگت سے وقوع پذیر ہوئی تھی۔ اس دوران میں جج ناپسندیدہ نظروں سے ولی بھائی کو دیکھتا رہا تھا۔ ولی بھائی کا بیان ختم ہوا تو میں نے پوچھا۔

''ولی بھائی! جرح کے شروع میں میرے ایک سوال کے جواب میں آپ بتا چکے ہیں کہ آپ کو معلوم نہیں تھا کہ ملزم نے آپ سے کس مقصد کی خاطر وہ رقم قرض لی تھی۔ اب آپ کی باتوں سے ظاہر ہو رہا ہے کہ آپ گھر کے بھیدی ہیں۔ اپنے بیان میں تضاد کی وضاحت کریں گے آپ؟''

وہ بری طرح نروس ہو رہا تھا۔ بوکھلائے ہوئے انداز میں بولا۔ ''مجھے واقعی معلوم نہیں رجب علی نے بعد میں حقیقت حال سے مجھے آگاہ کیا تھا۔''

میں نے کہا۔ ''چلیں، میں آپ کی زبان پر اعتبار کر لیتا ہوں۔ کیا آپ معزز عدالت کے سامنے اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ جس روز مکان کے سودے کے بارے میں دستاویزات تیار کی گئیں اور آپ کو بطور گواہ شامل کیا گیا، اُس روز ملزم کے پاس چار لاکھ

روپے کی رقم موجود تھی جن میں سے دو لاکھ ساڑھے بارہ ہزار روپے اُس نے میری مؤکلہ کو ادا کئے اور باقی کے ایک لاکھ ساڑھے ستاسی ہزار روپے آپ کو دیئے؟"

"تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ میں اس بات کی تصدیق کرتا ہوں۔"

جج نے چونک کر اُس کی طرف دیکھا اور "تھوڑی سی تبدیلی" کی وضاحت کرنے کا حکم دیا۔

ولی بھائی نے کہا۔"جنابِ عالی، مذکورہ روز رجب علی نے حور بانو کو رقم ادا کی تھی جبکہ مجھے وہ ایک روز پہلے ہی میری رقم دے چکا تھا۔"

میں نے اطمینان کی سانس لی اور پوچھا۔"اس کا مطلب یہ ہوا کہ مذکورہ دو تین روز میں ملزم کے پاس چار لاکھ روپے کی کثیر رقم موجود تھی۔" پھر میں نے اضافہ کیا۔"ہم محتاط اندازے کی خاطر اس دو تین روز کی مدت کو ایک ہفتے میں بدل دیتے ہیں؟"

"ہاں، میں اس بات کی تصدیق کرتا ہوں۔" ولی بھائی نے جواب تو دے دیا لیکن گھبراہٹ آمیز نظروں سے دائیں بائیں دیکھنے لگا۔

"دِس پوائنٹ اِز ٹو بی نوٹیڈ یور آنر۔" میں نے با آواز بلند کہا۔

جج نے اپنے سامنے پھیلے ہوئے کاغذات پر کچھ نوٹ کیا پھر چشمے کے اوپر سے مجھے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"بیگ صاحب، آپ گواہ سے اور کچھ پوچھنا چاہتے ہیں؟"

"مجھے اور کچھ نہیں پوچھنا یور آنر۔"

اس کے ساتھ ہی جج نے عدالت برخاست کرنے کا اعلان کر دیا۔ آئندہ پیشی پندرہ روز بعد تھی۔

✡......✡
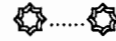
منظر اسی عدالت کا تھا اور کٹہرے میں ملزم رجب علی کھڑا تھا۔ اُس نے سچ بولنے کا حلف اٹھانے کے بعد جو بیان دیا وہ جوابِ دعویٰ کا خلاصہ تھا۔ وکیل صفائی نے سرسری سی جرح میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ اُس کا مؤکل انتہائی شریف اور فرشتہ سیرت شخص تھا اور حور بانو نے دھوکا دہی سے پہلے اُس کی رقم ہتھیائی، بعد ازاں اس کے خلاف مقدمہ بھی دائر کر دیا۔

اپنی باری پر میں جرح کے لئے ملزم کے کٹہرے کے قریب آیا اور آتے ہی رجب علی کو آڑے ہاتھوں لیا۔

"رجب علی! کیا یہ سچ ہے کہ اپنے والد طیب حسین کی وفات کے بعد تم نے مکان کے بٹوارے کا مسئلہ کھڑا کر دیا تھا؟"

"یہ میرا حق تھا۔" اُس نے مختصر سا جواب دیا۔

میں نے کہا۔"اور تم اپنا حق وصول کر کے بڑے بھائی سے الگ ہو گئے تھے۔ اغلب امکان یہ ہے کہ تم اپنی بیوی کو لے کر کورنگی چلے گئے تھے؟"

"آبجیکشن یور آنر۔" وکیل صفائی نے اعتراض کر ڈالا۔"وکیل استغاثہ غیر متعلق سوالات کر کے معزز عدالت کا وقت برباد کر رہے ہیں۔ پہلے ہی ہمارے کیس کی باری خاصی دیر سے آئی ہے۔"

جج نے مجھے ہدایت کی۔"بیگ صاحب، آپ ٹو دی پوائنٹ سوال کریں۔"

وکیل صفائی نے فاتحانہ نظروں سے مجھے دیکھا۔ میں اُس کو نظر انداز کر کے ملزم کی جانب متوجہ ہو گیا۔

"رجب علی! کیا یہ سچ ہے کہ جب تمہارا کاروبار ڈوب گیا اور تم نے اپنی بیوی مسماۃ شاہدہ پروین کو طلاق دے دی تو تمہاری حالت زار پر رحم کھا کر تمہارا مرحوم بڑا بھائی تمہیں واپس اپنے گھر میں لے آیا تھا؟"

وہ بولا۔"مجھے لفظ "رحم" پر اعتراض ہے۔ باقی سب کچھ ٹھیک ہے۔"

میں نے پوچھا۔"مرحوم شجاعت علی نے تمہیں اپنی ہی کمپنی میں پندرہ سو ماہوار تنخواہ پر ملازمت دلوا دی تھی؟"

"میں اپنے مرحوم بھائی کا یہ احسان ہمیشہ یاد رکھوں گا۔"

"اور تم نے اس احسان کا جو صلہ دیا، وہ بھی یاد رکھو گے؟" میں نے سخت لہجے میں کہا۔

"تم نے اُس عظیم انسان کو جیل میں سڑا دیا۔"

"یہ جھوٹ ہے۔" وہ نظریں چراتے ہوئے بولا۔

میں نے تیز لہجے میں کہا۔"کیا یہ بھی جھوٹ ہے کہ تم نے مرحوم شجاعت علی کی الماری سے ڈیڑھ لاکھ روپے اُڑا لئے تھے جن کے غبن کے الزام میں وہ جیل کی ہوا میں سانس لیتے لیتے چل بسا۔"

"یہ سراسر مجھ پر الزام ہے۔" وہ مسکین صورت بنا کر بولا۔

میں نے سوال کیا۔"رجب علی، یہ بات معزز عدالت کے ریکارڈ پر لائی جا چکی ہے کہ جنوری 1973ء میں تم نے ولی بھائی نامی ایک سود کا کاروبار کرنے والے شخص سے مبلغ ڈیڑھ لاکھ روپے بطورِ قرض لئے تھے کیا تمہیں اس بات سے انکار ہے؟"

"ہاں، میں نے پچھلے سال جنوری میں یہ رقم بطورِ قرض لی تھی۔"

''اس کی وجہ بتاؤ گے؟''

وکیل صفائی نے فوری طور پر اعتراض جڑ دیا۔ ''جناب عالی، کوئی بھی شخص، کسی بھی مقصد کے لئے قرض حاصل کرسکتا ہے۔ وکیل استغاثہ کو کیا تکلیف ہے؟''

''مائنڈ یور اون لینگویج مائی ڈیئر کونسلر۔'' میں نے برہمی سے کہا۔

''آرڈر، آرڈر!'' جج نے تیز آواز میں کہا۔ ''عدالت کے وقار کا خیال رکھیں۔''

میں نے کہا۔ ''جناب عالی، یہ جاننا بہت ضروری ہے کہ ملزم نے کس مقصد کی خاطر اتنی بڑی رقم سود پر حاصل کی تھی۔ اگر وہ کوئی نیک مقصد تھا تو اس کے افشا میں وکیل موصوف کو کاہے کا ڈر ہے۔ میری معزز عدالت سے استدعا ہے کہ وکیل صفائی کو عدالتی کارروائی میں روڑے اٹکانے سے باز رکھا جائے۔''

جج نے میری بات درست تسلیم کرتے ہوئے ملزم رجب علی کو جواب دینے کی تاکید کی۔

رجب علی نے بتایا۔ ''میری بھتیجی فوزیہ کو کسی نے اغوا کرلیا تھا۔ اغوا کنندگان نے ڈیڑھ لاکھ روپے کا مطالبہ کیا تھا۔ اسی مطالبے کو پورا کرنے کے لئے مجھے بحالت مجبوری سود پر قرض لینا پڑا۔''

میں نے پوچھا۔ ''تم نے اغوا کے اس واقعے کی رپورٹ تھانے میں درج کروائی تھی؟''

''میں فوزیہ کا دشمن نہیں تھا۔'' وہ غصے سے بولا۔ ''اغوا کنندگان نے دھمکی دی تھی کہ اگر ہم نے پولیس کے پاس جانے کی کوشش کی تو ہمیں فوزیہ کی کٹی پھٹی لاش ہی ملے گی۔''

میں نے سوالات کے زاویئے کو ذرا تبدیل کرتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا یہ سچ ہے کہ مرحوم شجاعت علی کے جیل جانے کے بعد تمہیں بھی اس کمپنی سے نکال دیا گیا تھا؟''

''ہاں یہ سچ ہے۔''

''تمہیں، میرا خیال ہے، جولائی 1972ء میں نوکری سے نکالا گیا تھا؟ کیونکہ اُسی ماہ غبن والا واقعہ پیش آیا تھا۔''

وہ بولا۔ ''آپ کا اندازہ درست ہے۔''

''کیا یہ بھی درست ہے کہ فوزیہ کے اغوا کا ڈرامہ جنوری 73ء میں رچایا گیا تھا؟''

''ہاں یہ بھی درست ہے۔'' جواب دینے کے بعد وہ چونک کر میری جانب اور پھر جج کی طرف دیکھنے لگا جیسے اُس کے منہ سے کوئی غلط بات نکل گئی ہو۔ پھر فوری طور پر بات بناتے ہوئے بولا۔ ''آپ مجھ سے آخر کیا اُگلوانا چاہتے ہیں؟ فوزیہ کو واقعی اغوا کیا گیا تھا۔ وہ ڈرامہ نہیں تھا۔''

''تم ڈرامے اور حقیقت کے چکر میں نہ پڑو۔'' میں نے بے پروائی سے کہا پھر پوچھا۔ ''جولائی 1972ء اور جنوری 1973ء کے درمیانی عرصے میں تمہارا ذریعہ روزگار کیا رہا تھا؟''

وہ کچھ دیر سوچنے کے بعد بولا۔ ''میں ایک پراپرٹی ایجنٹ کے ساتھ کمیشن پر کام کرتا تھا۔''

''جنوری 73ء کے بعد تم نے یہ کام چھوڑ دیا؟''

''آپ کہہ سکتے ہیں۔''

جج نے اُسے جھاڑ پلائی۔ ''وکیل صاحب کے سوال کا جواب ''ہاں'' یا ''نہ'' میں دو۔''

اُس نے اثبات میں جواب دیا، میں نے پوچھا۔ ''بغیر کام کئے تمہاری گزر بسر کیسے ہوتی تھی؟ تمہارا مرحوم بھائی بھی اُس وقت جیل میں تھا۔''

وہ پھٹ پڑا۔ ''میں بالکل ہی ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر تو نہیں بیٹھ گیا تھا۔ محنت مزدوری جو کچھ بھی مل جاتا تھا، کر لیتا تھا۔''

''محنت میں بہت عظمت ہے۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا پھر پوچھا۔ ''کیا یہ سچ ہے کہ اگست 73ء کی ابتدائی تاریخوں میں تم نے اپنی بھابھی سے چار لاکھ میں مکان خرید لیا تھا؟''

اُس نے فخریہ انداز میں کہا۔ ''اس میں کیا شک ہے؟''

میں نے پوچھا۔ ''تم یہ بات بھی تسلیم کرتے ہو کہ اس خریداری کی مد میں تم نے میری مؤکلہ اور اپنی بھابھی کو صرف دو لاکھ ساڑھے بارہ ہزار روپے ادا کئے تھے۔ کیوں؟ جب کہ سودا تو چار لاکھ میں ہوا تھا؟''

وہ بے خبری میں میرے جال میں پھنستا چلا جا رہا تھا، پُر جوش انداز میں بولا۔ ''بھابھی، ولی بھائی کی مقروض تھیں۔ باقی کی رقم میں نے بھابھی کا قرضہ ادا کرنے کی خاطر ولی بھائی کو دے دی تھی اور بھابھی کو اس پر کوئی اعتراض بھی نہیں تھا۔''

''مجھے بھی کوئی اعتراض نہیں ہے۔'' میں نے تمسخرانہ انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ''رجب علی، کیا یہ سچ ہے کہ جب تم نے میری مؤکلہ سے مکان کا سودا کیا، اُس وقت تمہارا مرحوم بھائی اور میری مؤکلہ کا شوہر نامدار جیل میں تھا اور حیات تھا؟''

''جی ہاں، یہ سچ ہے۔'' اُس نے جواب دیا۔ ''شجاعت علی کا انتقال ستمبر 73ء کی آخری کسی تاریخ کو ہوا تھا۔''

میں نے کہا۔ ''رجب علی، تم نے جس مکان کا سودا میری مؤکلہ سے کیا، وہ مکان درحقیقت مرحوم شجاعت علی کے نام تھا۔ میری مؤکلہ شجاعت علی کی زندگی میں نہ تو اس کو بیچنے کا اختیار رکھتی تھیں اور نہ ہی اس کی ضمانت پر کسی قسم کا قرضہ حاصل کرسکتی تھیں اور تم نے اس

بھولی بھالی عورت کو بے وقوف بناتے ہوئے یہ دونوں کام کئے۔ کیوں، آخر کیوں؟''

وہ ڈھٹائی آمیز سادگی سے بولا۔ ''مجھے قانون کی یہ شق ابھی ابھی پتہ چلی ہے۔''

جج نے نفرت آمیز نظروں سے رجب علی کو گھورا۔ میں نے تیز آواز میں کہا۔ ''ہوسکتا ہے، تمہیں یہ بات پہلے معلوم نہ ہو لیکن ولی بھائی جیسے کاروباری شخص کو تو یقینی طور پر معلوم ہونا چاہئے تھی لیکن تم دونوں تو مل کر میری مؤکلہ کو بے وقوف بنارہے تھے۔''

رجب علی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خجالت آمیز انداز میں بغلیں جھانکنے لگا۔

میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں سوال کیا۔ ''مسٹر رجب علی، تم اس معزز عدالت کو بتاؤ گے کہ تمہارے پاس...... ایک بے روزگار شخص کے پاس چار لاکھ کی خطیر رقم آخر آئی کہاں سے؟''

اس کے ساتھ ہی عدالت کا وقت ختم ہوگیا۔

جج نے ایک ہفتے بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کر دی۔

۞......۞
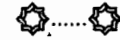
آئندہ پیشی سے قبل ہی حور بانو کا فون آگیا۔ وہ خاصی جذباتی ہورہی تھی۔

''بیگ صاحب!'' اُس نے جوشیلے لہجے میں کہا۔ ''میں یہ مقدمہ واپس لینا چاہتی ہوں۔''

مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ ''کیوں، آخر ایسی کیا بات ہوگئی؟''

''رجب علی راضی نامے پر تیار ہوگیا ہے۔'' اُس نے بتایا۔ ''وہ مکان کا سودا ختم کرنا چاہتا ہے۔''

مجھے اُس بے وقوف عورت کی عقل پر افسوس ہوا۔ جس سودے کی کوئی اہمیت ہی نہیں تھی، وہ اُس کو ختم کرانے کی بات کر رہی تھی۔

میں نے کہا۔ ''حور بانو، اگر تمہارے اندر ذرا سی بھی عقل ہے تو سوچو۔ سودا ختم کرنے کی صورت میں تمہیں دو لاکھ ساڑھے بارہ ہزار روپے رجب علی کو واپس کرنا ہوں گے۔ اس کے علاوہ ولی بھائی والا قرضہ.....''

''نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہوگی۔'' اُس نے انکشاف انگیز لہجے میں بتایا۔ ''رجب علی کا کہنا ہے کہ اگر میں مقدمہ واپس لے لوں تو وہ سودے والے کاغذات میرے حوالے کر دے گا اور کوئی پائی پیسہ لئے بغیر مجھ سے بہت دُور چلا جائے گا۔ پھر زندگی بھر مجھے اپنی شکل بھی نہیں دکھائے گا۔''

حور بانو کے مطابق گزشتہ رات رجب علی تھانے کے دو کانسٹیبلوں کی راہنمائی میں اُس

سے ملنے گھر پر آیا تھا اور اُس کے قدموں میں گر کر گڑگڑانے لگا تھا۔ اُس نے اپنے ایک ایک ''کرتوت'' کا اعتراف کرتے ہوئے التجا کی تھی کہ حور بانو مقدمہ واپس لے کر اُس پر احسان کرے۔ آئندہ وہ کبھی اس کو نظر نہیں آئے گا۔ اس سلسلے میں حور بانو کسی قسم کی دستاویز بھی لکھوا لے۔

میں جانتا تھا کہ وہ اچانک خاک کیوں چاٹنے لگا تھا۔ جج اس کیس کی تہ تک پہنچ گیا تھا اور رجب علی کو بھی بخوبی اندازہ ہوگیا تھا کہ اُس کا بچنا ناممکنات میں سے ہے، اُسے لمبی سزا ہونا لازمی تھی۔ اسی لئے وہ صلح صفائی کی راہ اختیار کر کے اپنی جان بچانا چاہتا تھا۔

میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''حور بانو، کیس پر ہماری گرفت بہت مضبوط ہے۔ ہم قریب قریب یہ کیس جیت چکے ہیں۔ جج رجب علی کی چال بازیوں کو سمجھ چکا ہے۔ فیصلہ انشاء اللہ ہمارے حق ہی میں ہوگا۔ تم کیس کو چلنے دو۔''

''چھوڑیں بیگ صاحب۔'' وہ بے پروائی سے بولی۔ ''جب میرا مقصد ایسے ہی پورا ہورہا ہے تو مقدمے بازی سے کیا فائدہ؟''

میں نے کہا۔ ''میں تو ابھی اُس پر ٹریڈنگ کمپنی سے ڈیڑھ لاکھ روپے کی چوری، فوزیہ کے اغواء، تمہارے گھر سے دو لاکھ ساڑھے بارہ ہزار روپے کی چوری اور اقدام قتل کے مقدمات درج کرنے والا ہوں۔ تمہارے شوہر کی موت کا ذمے دار بھی وہی ہے۔ میں لمبے عرصے کے لئے اُسے جیل بھجوانے کا پروگرام بنائے بیٹھا ہوں۔''

''میں نے اُسے معاف کر دیا۔ آپ بھی مقدمے بازی کا خیال دل سے نکال دیں۔''

میں نے مدبرانہ لہجے میں کہا۔ ''سانپ کو گھیرنے کے بعد چھوڑ نہیں دینا چاہئے۔ پہلی فرصت میں اُس کا سر کچل دینا چاہئے۔''

''آپ بے فکر رہیں۔ میں اس کا زہر نکالنے کے بعد ہی چھوڑوں گی۔'' وہ پُراعتماد لہجے میں بولی۔ ''ویسے بھی میں نے بعد کے معاملات اپنے اللہ پر چھوڑ دیئے ہیں۔''

مجھے اُس کی حماقت پر غصہ تو بہت آرہا تھا لیکن میں زبردستی اپنی بات منوا نہیں سکتا تھا۔ جب مدعیہ ہی مقدمہ واپس لینا چاہتی تھی تو میں کیا کر سکتا تھا۔

میں نے پوچھا۔ ''اب آپ کا کیا پروگرام ہے؟''

''میں کل رجب علی اور اُس کے وکیل کو ساتھ لے کر آپ کے دفتر آرہی ہوں۔ محلے ہی کے دو معزز گواہ بھی ہمارے ساتھ ہی ہوں گے۔ آپ دونوں وکلاء قانونی زبان میں فریقین کے مابین راضی نامہ تیار کر لیجئے گا۔ مکان کے سودے کے سلسلے میں جو بانڈ اور رسید لکھی گئی تھی

وہ رجب علی ساتھ لے کر آئے گا جو گواہوں کی موجودگی میں تلف کر دی جائے گی۔ اس کے علاوہ رجب علی کے اسٹیمپ پیپر پر حلفیہ بیان بھی دے گا جس میں وہ اپنی تمام زیادتیوں اور ہیرا پھیریوں کا اقرار کرے گا۔ دونوں وکیلوں، دونوں معزز گواہوں کے دستخطوں کے ساتھ آپ نوٹری پبلک سے تصدیقی مُہر بھی لگوا لیجئے گا۔ کیا خیال ہے، یہ بندوبست مناسب نہیں ہے؟''

''بہت خوب۔'' میں نے سراہنے والے انداز میں کہا۔ ''میرا خیال ہے، اب آپ وکالت شروع کر دیں۔ بہت کامیاب رہیں گی۔''

اُس نے پوچھا۔ ''آپ کا کیا خیال ہے، میں اتنی ہی بیوقوف ہوں جتنی آپ سمجھتے ہیں؟''

''آپ میرے اندازے کو غلط ثابت کر رہی ہیں۔''

وہ ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے بولی۔ ''حالات سب سے بڑا استاد ہوتا ہے۔ مجھ پر پڑنے والی مشکلات نے میری آنکھیں کھول دی ہیں۔ ویسے اس میں آپ کے تعاون کا بھی بھرپور ہاتھ ہے۔''

آئندہ پیشی پر مشترکہ راضی نامہ عدالت میں داخل کر دیا گیا۔ ظاہر ہے اس کے بعد مقدمہ خارج ہی ہونا تھا۔

حور بانو حسب وعدہ میری پُرتکلف دعوت کا اہتمام کرنا نہیں بھولی تھی۔

گزشتہ دنوں کسی کام کے سلسلے میں، میں حیدرآباد گیا تو وہیں ریلوے اسٹیشن کے باہر مجھے ایک شناسا صورت نظر آئی۔ میں پہلی ہی نظر میں اُسے پہچان گیا۔ وہ رجب علی تھا۔

اُس کی حالت عبرت ناک تھی۔ اُس کی دونوں ٹانگیں گھٹنوں اور دونوں بازو کہنیوں سے کٹے ہوئے تھے۔ وہ فٹ پاتھ پر بیٹھا بھیک مانگ رہا تھا۔ اُس کے جسم پر صرف ایک تہمد نما کپڑا تھا۔ جسم کے عریاں حصوں پر بڑے بڑے سفید دھبے واضح نظر آ رہے تھے جو یقینی طور پر برص کے نشانات تھے۔ پتہ نہیں اس کی یہ حالت کب اور کیسے ہوئی تھی۔

حور بانو نے تو اُسے معاف کر دیا تھا لیکن دست قدرت نے اُسے عبرت کا نمونہ بنا کر فٹ پاتھ پر بٹھا دیا تھا۔ اُس کے جسم پر اس قدر سفید دھبے تھے کہ لگتا تھا، اُس کی رگوں میں ''سفید خون'' دوڑ رہا تھا۔

میں ایک جھرجھری لے کر آگے بڑھ گیا۔

کاش ہم قدرتِ کاملہ کی ایسی نشانیوں کو دیکھ کر عبرت پکڑ سکیں!

(ختم شد)